گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت

(مقالات)

حضرت پیر محمد شاہؒ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد

حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ، احمد آباد، گجرات

اور

ایران کلچر ہاؤس، جمہوری اسلامی ایران، دہلی

کے زیر اہتمام منعقدہ تین روزہ سیمینار

(۲۵ تا ۲۷ جنوری ۲۰۰۴ء)

گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت

(مقالات)

جرنل - ۴

مرتب: پروفیسر محی الدین بمبئی والا

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر

حضرت پیر محمد شاہ روڈ، پانکور ناکہ، احمد آباد، گجرات، ہند

فون : 25351772, 25352838

جرنل-۴ Journal-IV

Book Name : **Gujarat's Heritage in Learning, Literature and Culture**

Editor : Prof. Mohiyuddin Bombaywala

کتاب کا نام : گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت

مرتب : پروفیسر محی الدین بمبئی والا

No. of Publication: 34 — سلسلۂ مطبوعات : ۳۴

Year of Publication : 2007 — سال اشاعت : ۲۰۰۷ء

Quantity : 500 — تعداد : ۵۰۰

Price : Rs. 200/- — قیمت : ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ، طباعت و سرورق

ISB Digital ۲۸۲۸، شاہپور، احمد آباد-۱

اس جرنل کی طباعت و اشاعت میں گجرات اردو اکادمی کا جزوی مالی تعاون شامل ہے۔

کتاب ملنے کا پتہ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ دہلی-۶

موڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ نئی دہلی-۲

آمرین بک ایجنسی- جمالپور، احمد آباد

کلیم بک ڈپو۔ خاص بازار، احمد آباد

حضرت پیر محمد شاہؒ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد

انتساب

نامور دانشور اور استاد گرامی

(مرحوم) ڈاکٹر احمد حسین این. قریشی

کے نام

-حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد-

پیش لفظ

ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ اس تاریخی لائبریری پر سیمینار منعقد کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا تھا وہ بفضلِ ربّی برابر جاری رہا ہے۔ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری صحیح معنی میں ایک علمی اور ادبی ادارہ ہے۔ اس اعتبار سے اس لائبریری کی علمیت اور افادیت کے بارے میں چند ایک مقالے بھی منظرِ عام پر آئے مگر واقعہ یہ ہے کہ حق ادا نہیں ہو سکا۔

برسوں پہلے لائبریری کی از سرِ نو تنظیم عمل میں آئی اور مخطوطات و مطبوعات کے علاوہ سینکڑوں دستاویزات، فرمان وغیرہ بھی گرد آلود کونے کھدروں سے دستیاب ہوئے جس نے اس لائبریری کے علمی اور فنی معیار کو مزید ارفعیت عطا کی۔

گجرات کے بارے میں کہا جاتا رہا ہے کہ یہ علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا سالہا سال سے مرکز رہا ہے مگر افسوس تو اس بات کا ہے کہ اس تاریخی سرزمین پر سیاسی اجلاس تو ہوتے رہے، سماجی کانفرنسیں منعقد کی جاتی رہیں، عرس اور تہوار بھی برابر منائے جاتے رہے، مگر حضرات چشتیہ سہروردیہ قادریہ شطاریہ اور مغربی سلسلہ کے باکمال بزرگ کہ جنہوں نے اپنے روحانی عرفانی اور علمی کارناموں کے ذریعہ فیوض باطنی پہنچایا اور اپنے اپنے سلسلہ کے مشائخین وسجادہ نشین حضرات کے لئے مادی وسائل پیدا کرنے کی جانب بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر ان صاحبِ علم وعرفان بزرگوں کے بارے میں نہ کسی طرح کے علمی اجلاس وتقریبات کے منعقد ہونے کا یا ان کے بصیرت افروز نوادرات کی طباعت و اشاعت کا کوئی خصوصی منصوبہ کے عمل میں آنے کا پتہ نہیں چلتا۔

گجرات کے صاحبِ 'تصنیف بزرگ وروحانی پیشوا' حضرت شاہ عالمؒ کے ملفوظ کئی جلدوں میں مدون کئے ہوئے آج بھی پردۂ خفامیں پڑے ہوئے ہیں، اسی طرح حضرت شیخ

احمد مغربی کے گراں قدر تالیفات۔ مرقات الوصول اور تحفۃ المجالس کو بھی شائع کرنے کا شرف درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ کو حاصل ہے۔ مگر از جانب دیگر ان کی علمی اور فنی سرگرمیوں پر مشتمل ان کی تصنیفات وتالیفات کی اشاعت کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ محشی نویس وشارح حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے ملفوظ اور دیگر تصنیفات وتالیفات کی ترتیب وتدوین بھی مستند طور پر منظر عام پر نہیں آسکی۔ آپ کو ''گجراتی چانپانیری'' تو لکھا جاتا رہا ہے، چانپانیر کو آپ کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے، محمود بیگڑہ کے اس دار الخلافہ میں اسلامی فنِ تعمیر کے عمدہ نمونے شمار ہونے والی شاندار مساجد چانپانیر کی زینت ہیں۔ چانپانیر کی علمی، مذہبی، تاریخی اور تہذیبی عظمت کے نشان آج بھی اس تاریخی سرزمین کے چپے چپے پر ثبت نظر آتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج اس ماضی کی یادگار چانپانیر کو National heritage قومی وراثت کا درجہ دیا گیا ہے۔

مگر افسوس کہ گجرات کے ان عالم بے بدل کے علمی جواہر پاروں اور حواشی و شروح وتراجم کی اشاعت تو دور کی بات رہی آپ کے صحیح اور مستند حالات بھی مرتب نہیں ہوسکے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک آدھ کوشش اہل علم حضرات کی تشفی کا باعث نہیں بن سکتی۔ آپ کے ملفوظ بحر والحقائق کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ سنی سنائی اور اوراق پارینہ میں کمٹی سمٹائی روایتیں اور حکایتیں حقیقت میں نہیں بدل سکتیں۔

ابوالبرکات حضرت سید محمد سراج الدین شاہ عالم کے عالمانہ ملفوظ جمعاتِ شاہیہ کی چھ جلدیں منظوطات کی صورت میں یکجا دستیاب نہیں ہو پائیں ایسی صورتِ حال میں یہ خواب کیسے شرمندۂ تعبیر ہوسکتا تھا کہ خانوادۂ چشتیہ، سلسلۂ شاہیہ اور شاہ وجیہ الدین (گجراتی) علویؒ قادری شطاری وغیرہ کے سجادہ نشین اور مشائخین اور ان متبرک خانوادوں کے فرزندان سعادت نشان اپنے ان بزرگوں کے باعظمت کارناموں کی اشاعت کا سامان پیدا کرسکتے۔ ہاں بس اتنا ضرور کیا گیا ہے کہ اعراس ناموں کی مدد سے متعینہ تاریخوں میں صندل مالی اور عرس شریف کی تقریبات ضرور منائی جاتی ہیں، محفلِ سماع منعقد ہوتی رہتی ہیں،

پھولوں کی چادریں بھی چڑھائی جاتی رہتی ہیں اور بیبیوں کے میلے بھی لگتے رہتے ہیں مگر علمی اور ادبی میدان میں ایک حسرت آمیز سناٹا اب بھی چھایا ہوا ہے۔

آخر میں درگاہ شریف ٹرسٹ کے تمام ٹرسٹی حضرات اور لائبریری کے رفقائے کار کے علاوہ خانۂ فرہنگ ایران، اسلامی جمہوری ایران کا بیحد شکر گزار ہوں۔ اس کے ساتھ تمام دانشور استادان علم وفن (شرکائے سیمینار) کا بھی ممنون ہوں کہ یہ حضرات ہماری دعوت کو لبیک کہتے ہوئے یہاں تشریف لائے اور اس سیمینار کو ہر طرح ایک تاریخی واقعہ بنانے کی کامیاب کوشش کی، میں اُن تمام حاضرین کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اِن تاریخی، تحقیقی، تہذیبی اور ادبی مقالات کو بڑی دلچسپی سے سماعت فرمایا۔

امید ہے کہ اس جرنل-۴ کی بھی حسب معمول پزیرائی کی جائے گی۔

دعا کریں کہ یہ تمام علمی، مذہبی اور تاریخی مواد منظرِ عام پر آئے اور تشنگانِ علم و ادب کو سیراب کرے۔ امین۔

پروفیسر محی الدین بمبئ والا

ڈائریکٹر۔ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر

احمد آباد

اِجلاسِ عام-(بائیں سے) چیئرمین محمد شفیع منیار، ڈاکٹر علی یوسفی، ڈاکٹر جلال تاملے، جناب صدر ڈاکٹر کاکی والا، پروفیسر اے. کے. رشید، ڈاکٹر عابدی صاحب، پروفیسر محبوب حسین عباسی، پروفیسر نثار احمد انصاری اور پروفیسر محی الدین بمبئی والا۔

خیر مقدمی تقریر

جناب صدر ڈاکٹر محمد حبیب کا کی والا، مہمانِ خصوصی آقای ڈاکٹر جلال تاملے صاحب (قونصل خانہ فرہنگِ ایران) (I.R.I.) کا اعزاز واستقبال کرتے ہوئے۔

محترم مخیر محمد سیٹھ ولی اللہ، نامور رفیق خاندانِ ولی اللہ کا اعزاز آقای ڈاکٹر جلال تاملے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر آقای جلال تالمے صاحب اِجلاسِ عام کو خطاب کرتے ہوئے۔

سامعین حضرات - اِجلاسِ عام

اجلاسِ عام میں شرکت کرنے والے عمائدین شہر اور اربابِ نقد ونظر (بائیں جانب) مولانا عبد الاحد تاراپوری (احمد آباد)، مولانا ضیاء الدین اصلاحی (اعظم گڑھ)، ڈاکٹر شمیم طارق (بمبئی)، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (علیگڑھ)، ڈاکٹر عراق رضا زیدی (دہلی) وغیرہ۔
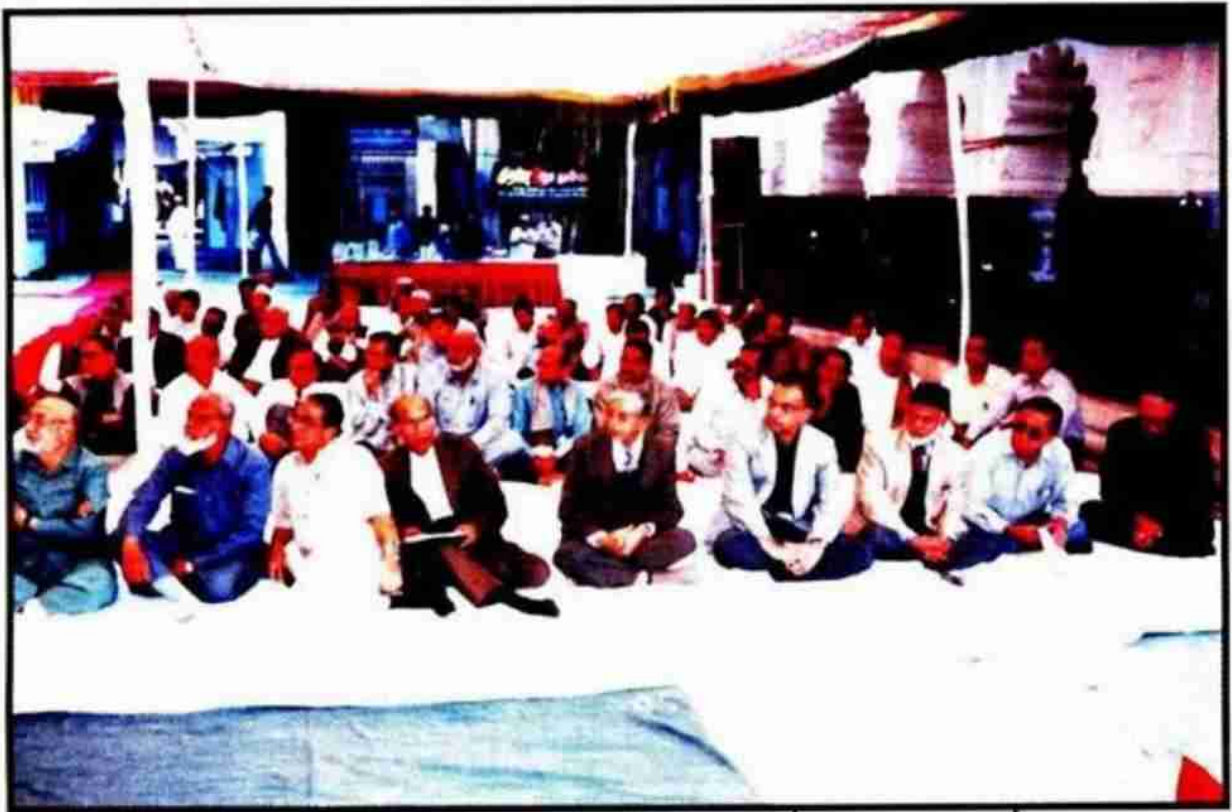
اِجلاسِ عام کے شرکا حضرات۔ (دائیں جانب) ڈاکٹر آر کے سید (I.A.S)، جناب پیرزادہ صاحب (سیسن جج)، پروفیسر عباسی، ڈاکٹر شریف حسین قاسمی، صدر شعبۂ فارسی (دہلی یونیورسٹی)، جناب عثمان بھائی، ایڈووکیٹ سید ابرار علی، ایڈووکیٹ فاروقی، ڈاکٹر کھیڑاڈا اور ڈاکٹر گھاسورا۔

اجلاسِ عام میں خواتین کی شرکت

مخطوطات اور نوادرات کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی آقای ڈاکٹر جلال تاملے صاحب، آقای ڈاکٹر علی یوسفی (ڈائریکٹر خانہ فرہنگ ایراں) اور جناب صدر و چیئرمین بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

دانشور و مفکر ڈاکٹر عابدی صاحب اپنا بصیرت افروز مقالہ پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر نثار احمد انصاری اپنا مقالہ پیش کرتے ہیں۔ مکرمی عابدی صاحب کے ساتھ اردو اکادمی کے مہاماتر جناب وی. وی. پنڈت صاحب، اکادمی کے چیئرمین جناب پروفیسر وارث علوی اور ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ڈائس پر موجود ہیں۔

اجلاس کا دوسرا سیشن (پیش پیش) جناب چیئرمین منیار صاحب، پروفیسر قاضی صاحب، ڈاکٹر غیاث الدین (ناگپور)، ڈاکٹر سید عبد الرحیم (ناگپور)، عبد الخالق رشید، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، جناب مسیح الزماں انصاری، جناب عبد الرشید شیخ، پروفیسر محمد ابراہیم شیخ، جناب محمود میاں وغیرہ۔

سیمینار کے دانشور شرکاء۔ ڈاکٹر عبد الحق (دہلی)، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی (علیگڑھ)، ڈاکٹر اے کے عزیز، استادِ بزرگ ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، ڈاکٹر عراق رضا زیدی (جامعہ ملیہ)، ڈاکٹر وجیہہ الدین (بڑودہ)، ڈاکٹر علیم اشرف (دہلی)، وغیرہ اور دیگر سامعین و پروفیسر حضرات۔

درگاہ شریف کے جنرل بورڈ کا اجلاس۔ جناب صدر چیئرمین اور اراکین ٹرسٹ منعقدہ سیمینار کی تفصیلات پر گفتگو کرتے ہوئے۔

پروفیسر محی الدین بمبئی والا نمائش کے چند نوادرات اور مخطوطات کی وضاحت کرتے ہوئے مہمانان خصوصی اور جناب صدر و چیئرمین کے ساتھ۔

فہرستِ مضامین

گوشہ ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی :

400	Dr. Pankaj T. Desai	Dr. Ziyauddin A. Desai-An Epigraphist & a Scholar	۳۰
403	Professor Makrand Mehta	My Friend Late Dr. Ziyauddin A. Desai	۳۱
420	Dr. Maqsood Ahmed	A Critical Study of Arab o hind ke talluqat	۳۲
429	Prof.Jafarhusain Laliwala	Sufism in Quran and Hadith and the Crises in the Modern World	۳۳
446	Dr. Ziyauddin A. Desai	Persian Sources of the Social and Cultural History of Medeival Gujarat	۳۴
448	Dr. Aaqa-e-Ali Yusufi	Title?	۳۵

نوٹ: مقالہ نگار کی آراء سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

۱

امن و آشتی کے خطے

گجرات میں مسلمانوں کی آمد

اور عرفاے کرام کی مساعی جمیلہ

(فارسی سے ترجمہ)

- ڈاکٹر آقای جلال تاملے صاحب
(کلچرل کونسل- خانۂ فرہنگ ایران)

اسلام کے دور اوائل ہی میں مسلمان تاجر، داعی، اسماعیلی مبلغ اور صوفیا نے اس علاقے میں اسلام کی روشنی پھیلائی۔ یہاں کے غیر مسلموں نے مسلمانوں کا استقبال کیا۔ مسلمان تاجر ہندو راجاؤں کے زیر حکومت ساحلوں اور بندرگاہوں پر اترے۔ معروف مورخ مسعودی ۹۱۰ء میں کھمبایت آیا اور سلیمان تاجر نے ۸۴۹ء میں اپنا سفرنامہ لکھا جس میں یہ اطلاع دی کہ گجرات کے غیر مسلم راجاؤں اور لوگوں نے مسلمانوں کا استقبال کیا۔ ہندو مسلم دوستی اور برادرانہ احساسات گجرات کے لیے باعث فخر ہیں اور اس تاریخی واقعہ کو آج پہلے سے زیادہ دوہرانے کی ضرورت ہے۔

لُباب الالباب کے مؤلف محمد عوفی نے بھی پٹن کے راجاؤں کی مسلمانوں کی نسبت دوستی سے متعلق واقعات درج کیے ہیں۔ اس نے اپنی ایک دوسری کتاب جوامع الحکایات میں لکھا

ہے: مجھے کھمبایت شہر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں دیندار مسلمانوں کا ایک گروہ رہتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راجا جنگ کے زمانے میں ایک مسجد تھی اس میں ایک بلند مینار تھا جہاں سے اذان دی جاتی تھی۔ زردشتیوں کے کہنے سے ہندوؤں نے مسجد پر حملہ کردیا، اور اسی مسلمان مارے گئے۔ مسجد کا امام راجا جنگ کے پاس گیا اور شکایت کی۔ راجا نے ذاتی طور پر اس واقعہ کی تحقیق کی اور پھر حکم دیا کہ وہ زردشتی اور ہندو جنہوں نے مسلمانوں کے قتل میں حصہ لیا تھا، انہیں سزا دی جائے گی اور مسلمانوں کو تاوان کے طور پر مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لیے رقم ادا کی جائے۔

یہ ہے انسان دوستی کی وہ سنہری تاریخ جس پر فخر کرنا چاہیے۔ ہم اس کا احترام کرتے ہیں اور آئندہ بھی اس ماحول میں سب زندگی گزاریں اس کی آرزو کرتے ہیں۔

گجرات میں اسلام کی تاریخ کا زریں باب وہ اتحاد و یگانگت کا ماحول ہے جو یہاں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں موجود رہا ہے۔ یہ انسان دوستی اور انسان کی عظمت کا احساس ہی تصوف کا اصل جوہر ہے۔ گجرات میں اسلام حاکموں کے ذریعے نہیں بلکہ تاجروں اور صوفیا کی کوششوں کے نتیجے میں پھیلا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ دین جہاں بادشاہوں اور حاکموں کے ذریعے پھیلا ہے، وہاں دین کا اثر دلوں پر کم ہوا ہے۔ صوفیا نے گجرات میں اسلام کی روشنی پھیلانے میں بنیادی رول ادا کیا ہے اور گجرات ہی میں کیا ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی صوفیا ہی نے اسلام کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ لیکن یہ صوفیا مشنری سے مختلف تھے۔ یہ صرف اپنے اخلاق حسنہ سے دوسروں کو اپنے مذہب کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ شاہ کلیم اللہ نے حقیقی اسلام کی یہ تعریف کی ہے کہ دنیا داروں کو دنیا سے دور کرنا اور عقبیٰ سے رغبت کرنا کرانا اسلام ہے۔ شاہ کلیم افسری لکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں میں صلح کرائیں۔ ہمارے ہزاروں کا تحمل، سب سے ان کی محبت اور زور زبردستی نہ کرنا، یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے صوفیا کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اس کے برخلاف غیر مسلمان بھی ان سے محبت کرنے لگے۔

بعض منابع میں صوفیا کی ان کوششوں کا مفصل ذکر ملتا ہے جن کا مقصد اسلام کی روشنی پھیلانا اور انسان کو انسان سے دوستی کرنا سکھانا تھا۔ معقولیت کی دعوت نے صوفیا کو متکلموں اور بادشاہوں سے زیادہ مؤثر طریقے سے اپنی بات کہنے اور دوسروں سے منوانے کا امکان پیدا کیا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے فوائد الفواد ہوں یا شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے مکتوبات۔ ان میں اور ان کے علاوہ تصوف و عرفان کی دوسری کتابوں میں انسان دوستی، دوسروں کے لیے محبت اور شفقت وغیرہ کے ایسے درس شامل ہیں جن پر عمل کرنے سے ہم ایک صالح اور آرام سے زندگی گذارنے کے قابل سماج کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

شیخ کلیم اللہ نے اپنے خلیفۂ ارشد شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کو ایک خط میں لکھا ہے کہ:

''یہ لازمی ہے کہ ہندو اور مسلمان میں صلح و آشتی کا ماحول بنایا جائے۔ ان دونوں فرقوں کے وہ لوگ جو آپ سے وابستہ ہوں، انہیں ذکر، فکر، مراقبہ کی تعلیم دیں، ذکر میں وہ خاصیت ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ اسلام کے حلقے میں داخل ہوتے ہیں''۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے صوفیا نے سب کے ساتھ ایک سا محبت کا سلوک کیا۔ سب کو ان کے معبود حقیقی کو پہچاننے کا درس دیا۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی زندگی اور تعلیمات کا مطالعہ کیجیے، ایسے متعدد واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ غیر مسلم جو آپ کی خانقاہ کے قرب و جوار میں رہتے تھے، آپ کی زیارت کے لیے آتے تھے۔

لوگوں کی ایک بڑی تعداد صوفیائے کرام سے وابستہ رہی ہے۔ ان کی تعلیمات سے انہوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ عرفاے تزکیۂ نفس اور روحانی و معنوی ترقی کی راہ دکھائی ہے۔ عرفا نے اپنے کردار، اخلاق، رویے اور کرامات سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور اس طرح ان کی راہ راست پر راہنمائی کی ہے۔

گجرات میں بھی صوفیائے کرام نے سماج کی بہبود کے لیے سنجیدہ اور مفید کوششیں کی ہیں۔ شاہ جلال، شیخ عبد الحق محدث کے بقول کاملان وقت میں سے تھے، صاحب کرامت تھے اور اس میدانِ عمل میں عظیم شان و شوکت کے مالک تھے۔ اسی طرح پٹن کے علاقے کے عرفا اور گجرات کی وسیع و عریض سرزمین کے دیگر مشائخ نے اپنے اپنے سلسلے کو

رونق دینے کے لیے بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے چند خلفا جن میں شیعہ بھی تھے، اس سرزمین پر آئے اور اپنے سلسلے کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے انہماک سے کوششوں میں لگ گئے۔

سیّد راجو قتال، حضرت قطب عالم، حضرت شاہِ عالم، حضرت پیر محمد شاہ وغیرہ وہ معروف عرفا ہیں جن کی عرفانی مساعی جمیلہ کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس سرزمین سے عشق و محبت کی خوشبو آتی ہے جو امید کرنی چاہیے ہمیشہ اہل دنیا کے لیے باعث خوشی و سرور رہے گی۔ اسی سرزمین کے ایک فرزند جناب ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم تھے جن کی یاد میں یہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے۔ خدا ان کے اور دیگر تمام حضرات کے درجات بلند کرے جنھوں نے شمع ہدایت روشن کی اور لوگوں کی بڑی تعداد کو فلاح و بہبود کا راستہ دکھایا۔

خراجِ عقیدت

عظیم مفکّر اور دانشور

مرحوم ڈاکٹر حمید اللہ

کی یاد میں

۲

شَمس الائمّہ السَرَخسی (الف)

-ڈاکٹر محمد حمید اللہ

مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی کی وفات ۴۸۳ھ میں ہوئی۔ سال رواں میں اس پر پورے نو سو سال گذرتے ہیں۔ اُن کی زندگی اور کارناموں کی یاد جہاں ہمارا اخلاقی فریضہ ہے، وہیں بہت سبق آموز بھی ہے۔ کیفیت کے لحاظ سے بے شبہہ وہ سب سے بڑے حنفی مؤلفِ فقہ ہیں (ان کی کتاب ''المبسوط'' تیس جلدوں میں چھپی ہے) کیفیت کے لحاظ سے کمال پاشا زادہ نے ان کو مجتہدین کے طبقۂ ثالث میں خصاف وطحاوی، اور کرخی وحلوانی کے ہم پایہ تسلیم کیا ہے[۱]۔

وہ اپنا نام اپنی کتابوں یا ان کے ابواب کے آغاز پر خود ہی ابوبکر محمد بن ابی سہل احمد لکھتے ہیں، اس لیے بعض سوانح نگاروں کا یہ بیان سہو سمجھنا چاہیے کہ ان کا نام محمد بن احمد بن سہل تھا۔ غالباً وہ سَرَخس میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ان کی نسبت سے ہویدا ہوتا ہے۔ یہ شہر تاریخ اسلام میں عرصۂ دراز تک بڑا مردم خیز رہا ہے۔ متعدد مشہور فقہا، طبیب، وزرا وغیرہ یہاں کی خاک سے پیدا ہوئے۔ آج کل یہ ایرانی روسی سرحد پر، دونوں مملکتوں میں آدھا آدھا بٹا ہوا ہے، دریائے ہَری رود اس کے بیچ میں سے گذرتا ہے۔

سوانح نگاروں میں سے متقدمین ان کی تاریخ ولادت بیان نہیں کرتے۔ متاخرین میں فقیر محمد جہلمی [۲] نے اور عبد الحی لکھنوی [۳] نے صراحت کی ہے کہ وہ ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ اور دس سال کی عمر میں باپ کے ساتھ، جو تجارت پیشہ تھے، بغداد آئے۔ مولانا عبد

(الف) مقالہ ھذا سن ۱۹۶۵ء میں ''نذرِ عرشی'' میں شائع ہوا تھا۔ (مرتبہ-مالک رام)

رقہ
شام
بغداد
واسط
کوفہ
جزیرۂ عرب
تہران
ایران
مشہد
سرخس
مرو
ترکمانستان
ازبکستان
بخارا
سمرقند
تاشقند
قزاقستان
کرغزستان
فرغانہ
اوزجند
کاشغر
تاجکستان
کابل
افغانستان
پشاور

الحی لکھنوی نے اپنی سوانح عمریوں کی مشہور کتاب ''الوفائد البہیۃ'' میں سرخسی کے اور حالات تو دیے ہیں، لیکن تاریخِ ولادت بیان نہیں کی۔ لیکن چونکہ مزید حالات کے لیے انھوں نے اپنی قدیم تر کتاب (مقدمۃ الہدایہ) کا حوالہ دیا ہے، اس لیے گویا اس تاریخ کی وہ توثیق کرتے ہیں۔ اس تاریخ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ سرخسی کے استاد شمس الائمہ حلوانی کی وفات ۴۴۸ھ میں ہوئی، اور مشہور ترین وممتاز ترین شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ نہ صرف استاد کے درسگاہ ہی میں جانشین ہوئے، بلکہ ان کے لقب ''شمس الائمہ'' کے بھی زبانِ خلق سے وارث قرار پائے۔ یہ بات کسی نوعمر طالبعلم کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھی۔

حَلوانی شہر بخارا میں درس دیتے تھے۔ لکھا ہے کہ سرخسی سالہائے دراز تک ان کے درس میں حاضر رہے۔ سرخسی نے اپنی ''شرح السیر الکبیر'' کے شروع میں صراحت کی ہے کہ میں نے حلوانی کے علاوہ شیخ الاسلام ابوالحسن علی بن محمد بن الحسین بن محمد السغدی (ف ۴۶۱ھ) سے بھی کتابِ مذکور کا درس لیا۔ اور یہ بات سمجھ میں بھی آتی ہے، کیونکہ سُغدی نے بھی ''السیر الکبیر'' کی ایک شرح لکھی تھی۔ ان کے تیس استادوں میں ابوحفص عمر بن منصور البزّاز بھی ہیں؛ لیکن اُن سے سرخسی نے ''السیر الکبیر'' کا درس ان کے اس کی شرح لکھنے سے قبل لیا۔

ان کی ابتدائی زندگی کا ایک واقعہ مولانا فقیر محمد نے انھیں کی زبانی نقل کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مأخذ کا حوالہ نہیں دیا۔ لیکن عبارت صاف عربی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:[۴]

> ''ایک دن کا ذکر ہے کہ طالب علم آپ سے اس کنویں پر جس میں آپ قید تھے، سبق پڑھ رہے تھے۔ ایک طالب علم کی آواز آپ نے نہ سنی۔ اس پر آپ نے پوچھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ایک طالب علم نے کہا ؛ وضو کرنے گیا ہے، اور میں بہ سبب سردی کے وضو نہیں کر سکا۔ امام نے فرمایا کہ: عافاک اللہ، تجھے شرم نہیں آتی کہ اس قدر سردی میں تو وضو نہیں کر سکتا؟ حالانکہ مجھ کو طالب علمی کے وقت بخارا میں ایک دفعہ

عارضہ شکم کا لاحق ہوا تھا، جس سے مجھ کو چالیس دفعہ قضاے حاجت ہوئی۔ پس میں ہر دفعہ نالے سے وضو کرتا تھا؛ جب مکان پر آتا تھا تو میری دوات بہ سبب سردی کے جم گئی ہوتی تھی، پس میں اس کو اپنے سینہ پر رکھ لیتا، ب وہ سینہ کی گرمی سے حل ہو جاتی، تو اس سے تعلیقات لکھتا تھا۔''

ایک زمانے میں ان کے استاذ حلوانی نے ''صفه أشراط الساعة ومقامات القيامة '' پر درس کا سلسلہ شروع کیا۔ سرخسی نے اس املا کو قلمبند کیا، اور خوش قسمتی سے یہ کتاب محفوظ رہ گئی ہے۔ اس کا واحد نسخہ پیرس کے کتب خانۂ عمومی میں ۵ ہے۔ اس کی تمہید کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں:

"سئل الشيخ الامام شمس الائمة (الحلوانی) رحمه الله عن مقامات القيامة الساعة: هل ورد فيها حديث صحيح؟ قال: ورد..... وهذا الحديث الواحد أسلم الأحاديث فی ذلك. وهو ما حدَّثنی الفقيه أبو بكر محمد بن علی سنة خمس واربع مائة.....''

تاریخ سے یہ دقیق اعتنا سرخسی نے اپنے استاذ ہی سے سیکھا تھا، جسے انھوں نے خود بھی جاری رکھا۔

ان کے قدیم ترین سوانح نگار ابن فضل اللہ العمری (ف ۷۴۹ھ) نے انھیں ''متكلماً نقيهاً اصولياً مناظراً '' لکھا ہے ۶۔ فقہ اور اصولِ فقہ پر ان کی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ ''صفة اشراط الساعة'' کو شاید علمِ کلام کی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے اپنے ہمعصروں کے ساتھ علمی مناظروں کے کوئی اور آثار تو محفوظ نہیں رہے، لیکن ان کا قید کیا جانا اسی کا شاخسانہ سمجھنا چاہیے کہ حکمرانِ وقت کی بھی پروا نہ کی اور حق کی خاطر قید گوارا کر لی۔ اس کے سوا ہمیں ان کی زندگی کے اور کوئی حالات معلوم نہیں، بجز اس کے کہ ان کے زمانۂ قید کی ایک یادداشت میں ۷ اِن کا دردِ دل ان الفاظ میں ظاہر ہوا ہے: ''الممنوع عن

الاهل والولد والکتاب المجموع ''لیکن بیوی بچوں کی کوئی تفصیل نہیں ملتی، حتیٰ کہ قید سے رہائی کے بعد بھی سوانح نگار اس کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔

اسبابِ حبس :

اپنی مختلف کتابوں کے دیباچوں، خاتموں یا دوران میں وہ خود بیان کرتے ہیں کہ یہ زمانۂ قید کا املا ہے، یا کہ میں ان دنوں اُوزجند کے قلعے میں قید ہوں۔ بالآخر جب رہائی ہوئی تو وہاں سے مَرغینان چلے گئے، جہاں ایک زیر املا کتاب یعنی ''شرح الکبیر'' کا تکملہ مکمل فرمایا۔ لیکن کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس قید کا باعث کیا تھا۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (زیر لفظ ''سرخسی'') میں ہیفینگ (Heffening) نے تحریفِ مآخذ کر کے لکھا ہے۔ ''غالباً انھیں اس لیے قید کیا گیا کہ اُم وَلد کے نکاح کے متعلق انھوں نے حکمرانِ وقت کے فعل پر شرعی نقطۂ نظر سے اعتراض کیا تھا''۔ لیکن یہ گمان قابلِ رد ہے، اوّلاً اسلیے کہ سارے مآخذ صراحت کرتے ہیں کہ ان کا یہ اعتراض رہائی کے بعد کا واقعہ ہے؛ دوسرے یہ کہ باقی حکمران خود تو کسی حسینہ سے نکاح کرنے کے خواہش مند تھے نہیں کہ وہ اس فتوے پر ناراض ہوتے، اور تیسرے، ماخذوں سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ امام کی غائر بینی اور نکتہ رسی سے خفا ہونا تو درکنار، وہ ان کا اور گرویدہ ہو گیا تھا۔

جامعۂ استانبول کے ''عمومی ترکی تاریخ'' کے پروفیسر احمد زکی ولیدی طوغان نے ایک مرتبہ زبانی گفتگو کے دوران میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس زمانے میں ابونصر احمد بن سلیمان الکاسانی نامی ایک بدطینت شخص تھا۔ یہ پہلے قاضی القضاۃ بنا، پھر وزیر؛ اور بالآخر باشاہ کے حکم سے اس نے سزائے موت پائی۔ یہ سب کچھ اُسی کا کیا دھرا ہے۔ لیکن طوغان صاحب کے اس بیان سے اوّل تو قید کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، دوسرے یہ شخص مغربی قرہ خانیوں کا وزیر تھا، اور ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اوزجند (جہاں سرخسی قید رہے، اور جو مشرقی قرہ خانیوں کا پایۂ تخت رہا ہے) اُس زمانے میں مغربی قرہ خانی خاقان کے زیرِ نگین رہا ہے۔

شہاب الدین المرجانی (ف ۱۳۰۷ھ) نے ''عرفۃ الخواقین فی غرفۃ الخواقین'' کے نام سے ترکستانی حکمرانوں کی جو تاریخ لکھی اور جو ۱۲۸۱ھ میں قازان میں چھپی تھی، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ خاقان شمس الملک نصر (۴۶۰ھ-۴۷۳ھ) جس نے ۴۶۱ھ میں فقیہ ابو ابراہیم اسماعیل بن شیث الوائلی الصفار کو سزائے موت دی تھی، غالباً اسی نے سرخسی کو بھی قید کیا تھا۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، سرخسی ۴۸۰ھ میں قید سے رہا ہوئے۔ اس اثنا میں ان مغربی قرہ خانیوں کے تین حکمران تخت نشین رہ چکے تھے۔

۱۔ نصر ۴۶۰ھ تا ۴۷۳ھ

۲۔ اس کا بھائی خضر خان ۴۷۳ھ تا ۴۷۴ھ

۳۔ اس کا بیٹا احمد بن خضر خان ۴۷۴ھ تا ۴۸۷ھ

سرخسی کی سی با اثر اور ممتاز شخصیت ان تین حکمرانوں کے دَور میں مسلسل قید رہی ہو، یہ بات کچھ دل کو نہیں لگتی۔

ہیفینگ (حوالۂ بالا) نے قید کو ''خاقان حسن'' کی طرف منسوب کیا ہے اور لکھا ہے کہ جب رہا ہوئے، تو انھوں نے مرغینان میں ''امیر حسن'' کے مہمان رہ کر اس کے محل کی دہلیز پر ''شرح السیر الکبیر'' کے ماقبی حصے کی تکمیل کی۔ خاقان حسن اور امیر حسن کیا ایک ہی شخص رہا ہیں؟ بے شک سوانح نگار ابن قطلو بغا نے امیر حسن کا ذکر کیا ہے۸۔ لیکن خاقان کو یا تو کاشغر میں رہنا چاہیے تھا یا اوزجند میں کہ یہی دونوں پایۂ تخت بیان کیے جاتے ہیں۔ مرغینان جیسے صوبائی شہر میں قصرِ شاہی کا ہونا درست نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس زمانے میں ایک خاقان حسن مغربی قرہ خانیوں کا حکمران تھا (۴۶۷ھ-۴۹۵ھ)۔ اس کا پایۂ تخت کاشغر اور ذیلی پایۂ تخت اوزجند ہی تھا۔ حال میں کچھ پرانے کاغذات دستیاب ہوئے ہیں، جو کاشغر کے انگریز قُنصل نے دہلی بھیج دیے تھے (غالباً اب بھی وہیں ہوں گے)۔ ان میں امیر الحسن بن سلیمان ارسلان قراخاقان نامی حکمران کے ایک شخص کو یارکندہ (یارکند) کا قاضی نامزد کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ اس دستاویز کی تاریخ مٹ سی گئی ہے، ۴۷۴ھ اور ۴۹۴ھ دونوں پڑھے جا سکتے ہیں۹۔ لیکن یہ خیال آرائی اس بنا پر قابلِ قبول نہیں کہ خود سرخسی کے

اپنے بیان کے مطابق جب وہ قید سے رہا ہوئے، تو مرغینان میں امام سیف الدین ابراہیم بن اسحاق (بعض مخطوطوں میں: سیف الدین ابو ابراہیم اسحاق بن اسماعیل) کے مہمان رہے اور انھیں کے گھر پر انھوں نے تدریس واملا کا باقی کام سرانجام کیا۱۰۔ یہ ممکن ہے کہ مرغینان کے امیر یعنی گورنر کا نام حسن ہو، اور اُم ولد کے نکاح کا مشہور واقعہ بھی اسی سے متعلق ہو۔ لیکن خاقان حسن کے متعلق جس کا نام ہیفینگ نے لیا ہے، کسی ماخذ میں صراحت نہیں ملتی۔

اس سلسلے میں ممکن ہے کہ مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی مرحوم، سابق صدر شعبۂ دینیات، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد کا خیال صحیح ہو۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں صلیبی جنگوں کے باعث عالمِ اسلامی میں بحران تھا۔ ہر روز نئے نئے ٹیکس لگ رہے اور بے پناہ مظالم ہو رہے تھے، سرخسی نے بعض ٹیکسوں کو ناجائز قرار دیا، اور گویا عدم ادائیگیٔ محاصل کی تحریک کی قیادت کی تھی۔ مجھے سرخسی کے ایک سوانح نگار محمود بن سلیمان الکفوی کے ہاں اس کا تائیدی مواد ملا ہے''۔ فرماتے ہیں: فی فتاوی قاضی خان فی فصل من یوضع فیه النذور: السلطان الجائر إذا أخذ صدقة الأموال الظاهرة، اختلفوا فیه. والصحیح ماقال أبو جعفر أنه یسقط الزکاة عن أربابها، ولایؤمر بالأداء ثانیا، لأن له ولایة الاخذ، فصحّ أخذه وإن لم یضع الصدقة فی مرضعها: وإن أخذ الجبایات أوأخذ مالًا بطریق المصادرة، ونوی صاحب المال عند الدفع الزکاة، اختلفوا فیه. قال بعضهم: لاتصح. وقال شمس الأئمه: الصحیح أنه یجوز فتسقط عند الزکاة''۔ یعنی سرخسی کی رائے میں ناجائز محصول کی ادیگی کے بعد جائز محصول کی ادائیگی کا وجوب باقی نہیں رہتا۔ مولانا فقیر محمد کے الفاظ ہیں۱۲: ''جب آپ کو ظالم نے قید کر کے اُوز جند کی طرف بھیجا.....الخ''۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ آپ کو بخارا میں قید کر کے اُوز جند جلاوطن کیا گیا تھا۔

زمانۂ قید کی قابلِ رشک علمی سرگرمی: قلعۂ اوز جند کے سپاہی اور افسر احکامِ حکومت کے تابعدار تو تھے، لیکن امام سرخسی جیسی زاہد و دیندار شخصیت سے عقیدت اور احترام کے برتاؤ

کے سوا اور کیا کر سکتے تھے! ابتدائی زمانہ جس نفسی کیفیت میں بھی گذرا ہو، لیکن بعد میں تو کوئی نہ کوئی مشغولیت پیدا کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ سرخسی کی عرصے سے خواہش تھی کہ امام محمد شیبانی کی ''کتاب الاصل'' کا جو خلاصہ ''المختصر'' (نیز ''الکافی''، یا ''المختصر الکافی'') کے نام سے محمد بن احمد الحاکم المروزی نے کیا تھا، اس کی شرح لکھیں۔ زمانۂ قید میں عقیدت مندوں نے اس کی یاد دلائی، اور خود سرخسی کے الفاظ ہیں:

''وقد انضمَ اِلی ذلك سؤال بعض الخواص من أصحابی زمن حبسی، حین ساعدونی لأنسی أن املی علیهم ذلك. فأجبتهم الیه، وأسأل الله التوفیق.'' ۱۳

امام محمد کی ''کتاب الاصل'' ابھی چھپی نہیں (بجز ایک باب کے)۔ مخطوطۂ عاطف (استانبول، نمبر ۷۴۲ تا ۷۴۵) کی چار جلدوں کی ضخامت ۲۵۳+ ۴۳۶+ ۴۷۶ +۲۴۲ =۱۴۰۴ ورق ہے۔ مروزی کی ''المختصر الکافی'' کے مخطوطۂ فیض اللہ (نمبر ۹۲۳) میں ۶۰۱ ورق ہیں۔ سرخسی نے اس آخر الذکر کی جو شرح ''مبسوط'' کے نام سے لکھی تھی، وہ مصر میں بڑی تقطیع کی تیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے جس کے جملہ ۶۳۳۵ صفحے ہیں۔

اسی طرح سرخسی نے امام محمد کی ''جامع صغیر''، ''جامع کبیر''، ''زیادات'' اور ''زیادات الزیادات'' کی شرحیں بھی اسی قید خانے میں املا کرائیں۔ ان میں سے آخر الذکر احیاء المعارف حیدرآباد کی طرف سے چھپی ہے۔ ''شرح جامع کبیر'' کا ایک ٹکڑا مصر میں مخطوطے کی شکل میں موجود ہے۔

بعد ازاں انھوں نے قید ہی میں اصولِ فقہ پر ایک کتاب املا کرائی، تاکہ امام محمد کی کتابوں کی شرح میں جو باتیں بیان کی گئی تھیں، ان کے اصول اور اساسات بھی معلوم ہو جائیں۔ یہ کتاب بھی دو جلدوں میں احیاء المعروف حیدرآباد نے شائع کر دی ہے۔

قید کے آخری زمانے میں انھوں نے امام محمد کی ''سیر کبیر'' کی جو قانون بین الممالک کی ایک اہم کتاب ہے اور جس کا یونیسکو کی جانب سے ترجمہ بھی ہو رہا ہے، شرح املا کرائی شروع کی۔ اسے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے (۳۶۸ +۳۱۳ +۳۳۹ +۳۸۸

=١٤٥٨ صفحوں کی چار ضخیم جلدوں میں) شائع کیا ہے، اور اب ایک نیا اڈیشن مصر میں بھی چھپ رہا ہے۔ سرخسی کتاب کے باب الشروط تک (جو چوتھی جلد سے صفحہ ٦٠ سے شروع ہوتا ہے، یعنی ١٢٨٠ صفحات کے اختتام تک) پہنچے تھے کہ بالآخر انھیں رہائی ملی۔ جیسا کہ ذکر ہوا۔ ماتبقی املا کے ٣٢٨ صفحے انھوں نے مرغینان پہنچ کر دس دن میں مکمل کرائے۔

قید کی مدت:

اس عظیم الشان کام کی بعض تاریخیں معلوم ہیں:

١۔ ''مبسوط''، ج ٢٧، ص ١٢٤ سے شروع ہونے والی کتاب المعاقل کا آغاز۔ چہار شنبہ ١٤/ ربیع الاول ٤٦٦ھ۔

٢۔ ''مبسوط''، ج ٣٠، ص ٢٨٧ سے شروع ہونے والی کتاب الرضاع کا آغاز پنجشنبہ ١٢ جمادی الآخرہ ٤٧٧ھ۔

٣۔ ''اصول الفقہ'' کا آغاز — شنبہ سلخ شوال ٤٧٩ھ

٤۔ ''شرح السیر الکبیر'' کا آغاز (ایک روایت میں) دوشنبہ یکم ذی قعدہ ٤٧٩ھ

٥۔ قید سے رہائی — جمعہ ٢٠ ربیع الاول ٤٨٠ھ

٦۔ قید کے مقام یعنی شہر اُوز جند سے روانگی — یکشنبہ سلخ ربیع الاول ٤٨٠ھ

٧۔ مرغینان میں آمد — چہار شنبہ ١٠ ربیع الآخر ٤٨٠ھ

٨۔ مکرر آغازِ املا، تکمیل کار کے لیے — چہار شنبہ ٢٤ ربیع الاخر ٤٨٠ھ

٩۔ ''شرح السیر الکبیر'' کے املا کی تکمیل — جمعہ ٣ جمادی الاولی ٤٨٠ھ

ان تاریخوں میں پیچیدگیاں بھی ہیں۔ مثلاً نمبر (٣) غالباً ٢٩ شوال ہے، جسے سلخ (آخری تاریخ) سے تعبیر کر کے روز شنبہ تو بیان کیا گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ مہینہ تیس کا ہو، اسی لیے نمبر (٤) میں یکم ذی قعدہ یکشنبے کی بجائے دوشنبہ کو لکھا ہے، لیکن نمبر (٣) کی تصحیح نہ کی۔ مزید برآں یہ بھی قرینِ قیاس نہیں کہ ''اصول الفقہ'' اور ''شرح السیر الکبیر'' دونوں کا املا ایک ساتھ شروع ہوا ہو۔ رہا دنوں کا تفاوت، تو اس کے متعلق فرنگی مؤلفوں نے ہجری

عیسوی سنوں کے مطابق کی جو جنتریاں شائع کی ہیں وہ پورے طور پر قابلِ اعتماد نہیں۔ وہ ہجری مہینے کی پوری مدت (۲۹) دن (۱۲) گھنٹے (۴۴ منٹ) (۲ ۹/۱۰) سکنڈ کا حساب کر کے یکم محرم تو ٹھیک بتا دیتے ہیں، لیکن سال کے (۳۵۴) دنوں کو بارہ مہینوں میں بانٹنے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ ہر سال محرم تیس دن کا ہوگا، جو ظاہر ہے کہ کسی طرح مطابقِ واقعہ نہیں۔ اسی لی وِنسفلڈ اور کاتنوز کی جنتریوں میں زیرِ بحث تاریخوں کے جو دن بیان ہوئے ہیں، وہ بعض صورتوں میں سرخسی کے بیان کے مطابق ہیں اور بعض میں نہیں۔ انتیس کو ابر کے باعث رویت نہ ہو، تو سرخسی کے زمانے میں اس کے اثرات بھی پڑنے ناگزیر تھے۔
اس سے قطع نظر، نمبر (۱) اور (۲) بھی دشواری پیدا کرتے ہیں۔ نمبر (۱) کے مطابق ''کتاب المعاقل'' جو ستائیسویں جلد میں ہے، ۴۶۶ھ میں شروع ہوئی اور نمبر (۲) کے مطابق ''کتاب الرضاع'' جو تیسویں میں ہے، ۴۷۷ھ میں شروع ہوئی۔ گویا تین جلدیں گیارہ سال میں تمام ہوئیں۔ ساری تیس جلدیں اس رفتار سے کہیں (۱۱۰) سال میں پوری ہوتیں۔ پھر یہی نہیں۔ تاریخ ۴۷۷ھ مصر کے ایک مخطوطے[14] میں ہے۔ مصر ہی کے ایک دوسرے مخطوطے[15]، نیز استانبول و دمشق کے (۱۶) مخطوطوں میں سال ۴۷۹ھ ہے۔ دوسرے لفظوں میں تین جلدیں گیارہ نہیں، تیرہ سال میں املا کرائی گئیں، گویا ساری کتاب ''المبسوط'' (۱۳۰) میں پوری ہوئی، یہ سارا عرصۂ قید میں گذرا، اور رہائی مزید ایک سال بعد ۴۸۰ھ میں ہوئی، یعنی (۱۳۱) سال قید میں گذرے۔ حالانکہ ولادت ۴۰۰ھ میں اور وفات ۴۸۳ھ میں بیان ہوئی ہے۔ اس طرح یہ سارا واقعہ ناممکن ہو جاتا ہے۔

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ ''اصول الفقہ'' کا آغاز ۲۹ شوال ۴۷۹ھ کو ہوتا ہے، اور ایک اور بیان کے مطابق ''شرح السیر الکبیر'' کا آغاز ایک دن بعد یکم ذی قعدہ ۴۷۹ھ کو ہوتا ہے، اور جب اس کے چار ماہ بیس دن بعد رہائی ہوئی ہے، تو اس وقت ''اصول الفقہ'' تمام ہو چکی تھی (اس کے ۸۰۰ مطبوعہ صفحے ہیں) اور ''شرح السیر الکبیر'' کے (۱۲۸۰) صفحے بھی املا ہو چکے تھے یعنی چار ماہ بیس دن میں دو ہزار سے زائد صفحے املا کرائے گئے۔ بعد ازاں مرغینان میں مکرر کام شروع کیا، تو صرف دس دن میں (۳۲۸) صفحے املا کرائے۔ اگر روزانہ

(۳۲) صفحے املا کرانا ممکن ہے،تو مبسوط کی تین جلدوں کے (۷۸۳) صفحے گیارہ یا تیرہ سال (یعنی ۳۸۹۴ یا ۴۶۰۲ دن میں کسی طرح درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں ایک اور بات بھی قابلِ ذکر ہے۔ ''مبسوط'' (۸: ۸۰) میں سرخسی خود کہتے ہیں کہ دو سال میں ساڑے سات، آٹھ جلدیں مکمل ہوسکتی ہیں (جن میں ۱۷۰۲ صفحے ہیں)، تو تین جلدوں کے (۷۸۳ صفحوں) کو گیارہ یا تیرہ سال کیوں لگیں۔

میری رائے میں اصل قصہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمبر (ا) کے ۴۶۶ھ کا تعلق اصل میں ''مبسوط'' کے آغاز سے ہے جو کسی سہو سے ستائیسویں جلد میں آ گیا ہے۔ مثلاً ستائیسویں جلد املا کراتے وقت دردِ دل کے تحت سوچا کہ کب سے یہ کام چل رہا ہے اور خیال کیا کہ اس ابتلا کی یادداشت ان آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑی جائے، جو اسے پڑھیں گی، اور جب یاد آیا کہ یہ ۴۶۶ھ سے شروع ہوا تو املا کراتے ہوئے کہا ہوگا کہ اسے کتاب کے آغاز میں لکھ لو۔ ظاہر ہے کہ طالب علموں نے اس وقت تو ستائیسویں جلد ہی میں استاد کے الفاظ نقل کرنا تھے، اگرچہ خواہش یہی ہوگی کہ گھر جا کر مناسب اصلاح کرلیں گے۔ فرض کیجیے کہ ''مبسوط'' کا موجودہ متن اس طالب علم کی بیاض پر مبنی ہے جو (۱) گھر جانے کے بعد بھول گیا کہ تاریخ کی تصحیح کرنے سے، یا (۲) وہ خود اس دن موجود ہی نہ تھا اور اس نے کسی رفیق کا نسخہ مستعار لے کر اس دن کا املا نقل تو کرلیا، لیکن رفیق سے یہ تحقیق نہ کرسکا کہ استاد نے زبانی کیا کہا تھا، یا (۳) وہ املا میں موجود تھا، لیکن کسی وجہ سے استاد کا وہ جملہ سُن نہ سکا، جو اس املا کو کتاب کے آغاز میں نقل کرنے کی ہدایت پر مشتمل تھا، مثلاً اس لیے کہ وہ درس میں کچھ دیر سے پہنچا، یا (۴) ابتدائی مسوّداتِ املا کی بعد میں تبیض ہوئی اور یہ تبیض ایک دو نسل بعد ہوئی۔ غرض متعدد امکانات ہیں۔

ان امکانات کی تائید دو تین واقعات سے ہوتی ہے:۔

(الف) ''مبسوط'' میں تاریخ کے ساتھ دردِ دل کا اظہار تو دو جگہ پر ہے، لیکن بلا تاریخ اپنے قید و بند پر اظہارِ درد مجھے دو نہیں، مندرجہ ذیل سولہ مقاموں پر ملا ہے:

(۱) آغاز کتاب پر، ''مبسوط'' ۱ : ۲، ۳، ۴

(۲) آخر المناسک ۴ : ۱۹۲

(۳) آخر النکاح ۵ : ۲۹

(۴) آخر اللعان ۶ : ۵۹

(۵) آخر الایمان ۷ : ۲۴۱

(۶) آخر شرکۃ المکاتب ۸ : ۸۰

(۷) آخر کتاب الولا، عتق مافی البطن ۸ : ۱۲۵۔

(مطبوعہ نسخے میں تو نہیں، لیکن بعض مخطوطوں میں (مثلاً کو پرلو، استانبول) کتاب السرقہ کے آخر میں بھی ایک یادداشت ہے۔

(۸) آخر کتاب السیر ۱۰ : ۱۴۴

(۹) در دورانِ بیوع ۱۲ : ۱۰۸

(۱۰) آغاز کتاب القسمۃ ۱۵ : ۲

(۱۱) مطبوعہ نسخے میں تو نہیں لیکن توپقائی احمد ثالث کے مخطوطے میں ادب القاضی کے آخر میں۔

(۱۲) ایضاً، درآخرِ کتاب الرجوع عن الشہادات

(۱۳) ایضاً، درآخر کتاب الاقرار۔

(۱۴) ایضاً، درآخر کتاب الوکالۃ

(۱۵) آغاز کتاب المعاقل ۲۷ : ۱۲۴

(۱۶) آغاز کتاب الکسب (۳۰ : ۲۴۴)، نیز آغاز کتاب الرضاع ۳۰ : ۲۸۷

(ب) ان میں سے چھٹے مقام پر وضاحت ہے:۔ ''باملاء المحصور المعاتب والمحبوس المعاقب وھو منذ حولین علی الصبر مواظب'' یعنی دو سال سے قید میں ہیں۔

(ج) جتنے قدیم مخطوطے ملے ہیں، ان سب میں صراحت ہے کہ وہ محمود ابن احمد بن عبد السید الحصیری کا نسخہ ہیں یا اس سے نقل ہوئے ہیں۔ یہ صاحب سرخسی سے تین نسل بعد

دمشق میں آبسے تھے۔ ممکن ہے ان کا تعلق سرخسی کے شاگرد ابو بکر محمد بن ابراہیم الحصیری کے خاندان یا کسی شاگردوں کے خاندان سے ہو۔ وہ کسی سیاسی انقلاب میں ترکستان چھوڑ کر شام آئے اور اپنے ساتھ کتابوں کا جو ذخیرہ لائے، اس میں ان کے جد کے مسودات (''کتاب المبسوط'' کے متعلق) بھی ہوں گے، جن کی انھوں نے تبییض کی تا کہ درس وقضات میں کام آئیں؛ ابن قطلو بغا نے تاج التراجم میں لکھا ہے کہ جمال الدین ابو المحامد محمود بن احمد بن السیّد بن عثمان بن نصر بن عبد الملک الحصیری کی ولادت بخارا میں جمادی الاولی ۵۴۶ھ میں ہوئی اور وفات ۸ صفر ۶۳۶ھ کو، ''ونسخ بخطه المبسوط وشرح السير (الكبين) وغيرهما...''

غرض گمان ہوتا ہے کہ سرخسی ۴۶۶ھ سے ۴۸۰ھ تک قید کی ابتلا میں رہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے کہ ان کا قید کا یہ زمانہ ہم بے قیدوں سے لاکھ درجے بہتر گذرا، اور انھوں نے ہمیں اسیرِ منّت فرمایا۔

تاریخِ وفات عام طور پر ۴۸۳ھ بیان کی جاتی ہے۔ بعض جگہ ''فی حدود التسعین'' اور بعض جگہ ''حدود خمس مائة'' کے مبہم اور تخمینی الفاظ بھی ملتے ہیں۔ لیکن ابن قطلو بغا، کفوی وغیرہ نے صراحت کی ہے کہ ''فخرج فی آخرِ عمره الى فرغانه'' ہم جانتے ہیں کہ خود سرخسی کے بیان کے مطابق وہ ۴۸۰ھ میں علاقۂ فرغانہ کے شہر مرغینان میں جا ٹھہرے تھے، لہذا سالِ وفات ۴۸۳ھ ہی زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ مولانا عبدالحی لکھنوی نے تو ماہ جمادی الاولی کی صراحت کی ہے، لیکن اپنا ماخذ نہیں بتایا۔ یہاں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ اختلاف بھی قدیم ہے۔ استانبول کے مختلف مخطوطوں پر ان کے سابقہ مالکوں نے سرخسی کی تاریخ وفات لکھی ہے، کسی میں کچھ، کسی میں کچھ، مگر بہر حال یہی تین تاریخیں ہر پھر کر سامنے آتی ہیں۔ ایک معین اور دو تخمینی۔

قید کی سرگذشت:

سوانح نگار لکھتے ہیں کہ انھیں ''فی الجبّ'' ایک کنوئیں میں قید کیا گیا تھا یہ اندھا

کنواں، بے آب گڑھا ہوگا جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت یوسف کے حال میں مذکور ہے۔ ممکن ہے، یہ کسی کمرے کے اندر رہا ہو، تا کہ بارش اور برف باری سے بھی محفوظ رہے، اور قیدی کے فرار کا امکان بھی نہ ہو۔ لیکن خود مؤلف کے درد ہائے دل میں جہاں کئی بار اس کی صراحت موجود ہے، وہاں صرف اتنا ہے:

(۱) فی الحبس بأوزجُند (مبسوط، ۱/۲)

(۲) زمن حبسی (ایضاً، ۱/۴)

(۳) المحبوس عن الجمع والجامعات ب(ایضاً، ۴/۱۹۲)

(۴) المحصور عن الانطلاق المبتلی بوحشة الفراق... کتبه العبد البری من النفاق (ایضاً، ۷/۵۹)

(۵) المحصور فی طرف من الآفاق (ایضاً، ۷/۲۴۱)

(۶) المحصور المعاتَب والمحبوس المعاقَب (ایضاً، ۸/۸۰)

(۷) الممتحن بأنواع البلاء یسأل الله تعالی تبدیل البلاء والجلاء بالعز والعلاء (ایضاً، ۸/۱۲۵)

(۸) المحصور بتزویراهل السخف (فی آخر "کتاب السرقة"، ایک مخطوطے میں)

(۹) المتکلّم بالحق المنیر المحصور لاجله شبه الاسیر (مبسوط، ۱۰/۱۴۴)

(۱۰) الملتمس لرفع الباطل الموضوع، المنفی لاجلهٗ المحصور الممنوع، عن الاهل والولد والکتاب المجموع (ایضاً، ۱۲/۱۰۸)۔

(۱۱) المحبوس فی موضع الاشرار (درآخر "کتاب الاقرار"، ایک مخطوطے میں)

(۱۲) أملاه المستخلص من السجن موضع الملالة، المنتظر لتمام الفرج والاقالة (درآخر کتاب الوکالۃ، ایک مخطوطے میں)

(۱۳) امليتها وأنا فى السجن محبوس، وعن أسباب الخلاص فى الدنيا مأويس، (درآخر ''شرح زیادات الزیادات'')

(۱۴) أملاء يوم السبت سلخ شوال سنة ٤٧٩ھ فى زاوية من حصار اوزجند (درآغازِ ''اصول الفقہ'')

(۱۵) المبتلى بالهجرة الحصير، المجفو من جهة السلطان الخطير... وقد كان الافتتاح باوزنجد فى آخر أيام المحنة عند هبوب النعمة... وكان إبتداء الاملاء باوزجند فى يوم الاثنين غرة ذى القعدهسنة ٤٧٩ھ فى دار الشيخ الصابر الزكى المقب بأمير كون أبى على بن ابى القاسم الى تمام باب الامان، ثم أمرنا بالكتابة فى حصار اوزجند إلى أول كتاب الشروط، وتبيَن الخلاص فى يوم الجمعة عشريقين من شهر ربيع الاول سنة ٤٨٠ھ، وقد خرجنا من اوزجند يوم الاحد سلخ شهر ربيع الاول سنة ٤٨٠ھ ودخلنا بمرغينان يوم الاربعا العاشر من شهو ربيع الآخر ونزلنا فى دار الشيخ الامام الاجل الزاهد سيف الدين أبى ابراهيم اسحاق بن اسماعيل... فابتدأ كتاب الشروط فى داره يوم الاربعا الرابع العشرين من شهر ربيع الاخروتم بعون الله وقوّته فى داره يوم الجمعة الثالث من جمادى الاولى سنة ٤٨٠ھ والحمد لله تعالى. انتهىٰ كلام شمس الائمه رحمه الله رحمة واسعة ''(مخطوطہ ''شرح السیر الکبیر'' کتب خانۂ عاطف استانبول کا خاتمہ)

ان سارے اقتباسات سے گمان ہوتا ہے کہ اولاً انھیں واقعی ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا پھر ان کی ریاضت اور صبر سے متاثر ہوکر رفتہ رفتہ حالت میں اصلاح عمل میں آئی ہوگی۔ ایک زاویے یعنی چھوٹے سے حجرے میں بند رہے، اس کے بعد کسی افسر اور معتمدِ حکومت کے مکان میں زیرِ نگرانی رکھے گئے، اور دوبارہ قلعے میں لائے گئے شاید

اس لیے کہ ملک کی آئے دن کی جنگوں جھگڑوں میں دشمن انھیں نہ لے اُڑیں۔ بالآخر رہا کیے گئے۔

عام طور پر طریقہ املا کا تھا۔ سوانح نگار لکھتے ہیں کہ طلبہ ''مِن أعلی الجب'' کنوئیں کے منڈیر پر بیٹھے یاداشتیں لکھا کرتے تھے۔ لیکن مذکورۂ بالا دردِ دل نمبر (۴) میں ''أملاه المحصور'' کے بعد ''کتبه العبد البری من النفاق'' کا جملہ تشویش پیدا کرتا ہے۔ کس نے لکھا؟ کیا اس سے وہ شاگرد مراد ہیں جو معتوب شاہی کے پاس حاضر ہونے سے نہیں ہچکچاتے؟ یا اسے ''کتبہ'' پڑھنا چاہیے یعنی ''لکھوایا'' نہ کہ ''لکھا''؟

طریقۂ املا:

مبسوط وغیرہ کتابوں کے کوئی دس ہزار صفحے سرخسی نے شاگردوں کو املا کرائے۔ اوپر دردِ دل نمبر (۱۰) میں وہ صراحت کرتے ہیں کہ بیوی، بچوں اور کتابوں تک سے محروم ہوں۔ ان کی املا کرائی ہوئی کتابیں سوائے ''اصول الفقہ'' کے، ساری کی ساری امام محمد شیبانی کی کتابوں کی شرحیں ہیں۔ امام محمد کی کتابوں میں سے جو ہم تک پہنچی ہیں، ان کا سرخسی کی شروح سے مقابلہ کیا جائے، تو نظر آتا ہے کہ امام محمد ہی کے الفاظ کو سرخسی املا میں دہراتے اور مناسب اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شرح کرتے وقت اصل متن سامنے ہو، تو بہت سی تحت الشعور باتیں یاد آجاتی ہیں، اور بات میں بات پیدا ہوجاتی ہے۔ متن کہیں مشکل ہو، تو شرح میں اطناب وتفصیل کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اس لیے شرح تو شارح کی اپج ہے۔ لیکن امام محمد کے اصل الفاظ کے ہزار ہا صفحات کو کس طرح دہرایا؟ سوانح نگاروں کو اصرار ہے کہ یہ سب انھیں حفظ تھا۔ کیا اسے حسنِ ظن سمجھا جائے؟ اس سے یہ بات کہیں آسان ہے کہ شاگرد کتاب ساتھ لائیں اور پڑھیں، اور استاد اس کی اساس پر شرح لکھوائے۔ نہ دردِ دل نمبر (۱۰) غلط اور نہ سوانح نگاروں کا بیان غلط۔ کیونکہ شاگردوں کو تو کتاب حاصل کرنے کی ممانعت نہیں تھی؛ اور اگر کنوئیں کے قیدی استاد کی آواز شاگرد سن سکتے ہیں، تو شاگردوں کی آواز بھی استاد سن سکتا ہے کہ فاصلہ دونوں طرف سے یکساں ہے۔

''شرح السیر الکبیر'' میں کئی بار ذکر ہے: ''فی بعض النسخ '' یا ''فی نسخة قدیمة''
یہ بھی اسی قیاس کی تائید کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ متعدد شاگردوں کے ہاتھ میں کتابیں
ہوتی تھیں۔

املا کے وقت کتنے شاگرد حاضر رہتے تھے، معلوم نہیں۔ کفوی نے ان کے بڑے
شاگردوں کے نام یہ لکھے ہیں: برہان الائمہ عبدالعزیز بن عمر بن مازہ، شیخ الاسلام الامام محمود
بن عبدالعزیز الاوزجندی، الشیخ الامام رکن الدّین ابومحمد الخطیب مسعود بن الحسن بن الحسین
بن محمد بن ابراہیم الکشانی، عثمان بن علی بن محمد البیکندی (یہ شاگردوں میں سب سے متاخر
فوت ہوئے)۔ ان کے علاوہ اوپر ذکر شدہ الحصیری۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ زمانۂ قید میں کون
حاضر رہے؛ ان شاگردوں میں شیخ الاسلام اوزجندی کا اس نوع کا تعلق ہونے کا زیادہ
امکان ہے۔

ان کی تالیفیں، جو چھپ گئی ہیں، ان میں سے ''مبسوط''، ''شرح السیر الکبیر''،
''اصول الفقہ'' اور ''شرح زیادات الزیادات'' کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ مخطوطات میں
''اشراط الساعۃ'' کا پیرس میں اور ''شرح الجامع الکبیر'' کے ایک ٹکڑے کا مصر میں ہونا بھی لکھ
چکا ہوں۔

جو کتابیں ناپید ہیں، ان میں سے ''شرح مختصر الطحاوی'' کے متعلق ابن قطلو بغا نے
لکھا ہے: ''رأیت قطعة منه''۔ ''شرح الجامع الصغیر'' اور ''شرح الزیادات'' کا ذکر خود
انھوں نے ''شرح السیر الکبیر'' میں جابجا کیا ہے۔ خصاف کی کتابوں کی جو شرح الصدر الشہید
نے کی، اس میں ان کی ''شرح النفقات فلخصاف'' اور ''شرح ادب القاضی
للخصاف'' کا ذکر ہے، جیسا کہ مولانا ابوالوفا افغانی نے تحریر فرمایا ہے۔ کشف الظنون
میں لکھا ہے کہ ''الفوائد'' سرخسی اور حلوانی کی تالیف ہے؛ اس کا مفہوم واضح نہیں۔ ''کشف
الظنون'' میں سہو بیانی کی بھی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

بعض وقت اور کتابوں کے بھی حوالے ملتے ہیں، لیکن یہ عام طور پر ''مبسوط'' کے
مختلف ابواب ہی کی الگ اشاعت ہوتی ہے مثلاً ''کتاب الکسب''، ''کتاب الحیض''

وغیرہ۔ ان کو مستقل تالیف شمار کرنا درست نہیں۔

مؤلّف شخصیت:

امام سرخسی کو اہل ہند سے کافی واقفیت معلوم ہوتی ہے۔ ''شرح السیر الکبیر'' وغیرہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ وہ مثالوں میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ سنِ بلوغ کی قدرتی علامتوں کے متعلق لکھا ہے [۶] کہ اس بارے میں ترکوں اور ہندیوں میں فرق ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں ان کے پاس کوئی ہندی الاصل لونڈی رہی ہو۔

انھیں علمِ تاریخ سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ سیرت النبی کی قانونی اہمیت سے وہ خوب باخبر ہیں۔ یوں ابھی کتاب کے املا میں جابجا خود اپنے حالات کی طرف اشارہ کرنا ذوقِ تاریخ ہی کی دلیل ہے۔ یہ چیز، ممکن ہے، انھوں نے امام محمد سے سیکھی ہو، جو کثرت سے تاریخی واقعات سے مسائل استنباط کرتے ہیں، حتّٰی کہ اپنے کم عمر ہمعصر عالم واقدی کا بھی کثرت سے حوالہ دیتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں جو امام محمد نے یہ ذوق اپنے رفیقِ درس اور بعد کے استاد امام ابو یوسف سے حاصل کیا ہو۔ ان کا ایک دلچسپ واقعہ ابن خلکان نے ''وفیات الاعیان'' میں لکھا ہے: ایک دن ابو یوسف کو آنے میں دیر ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ ابن اسحاق کے پاس سیرت النبی وغیرہ کے لکچر سننے گئے تھے۔ تو ابوحنیفہ نے طنز سے پوچھا: اچھا یہ بتاؤ کہ طالوت کی فوج کے سپہ سالار کا نام کیا تھا؟ (مراد یہ تھی کہ ان معلومات سے آخر فائدہ کیا ہے؟) ابو یوسف نے کہا: میں مجمع عام میں کہوں گا کہ ابوحنیفہ جیسے امام کو یہ تک نہیں معلوم کہ غزوۂ اُحد پہلے ہوا یا غزوۂ بدر (اور فقہ میں سنّتِ نبوی سے استدلال میں مقدّم و مؤخّر طرزِ عمل کی بڑی اہمیت ہے) اس پر ابوحنیفہ چپ ہوگئے۔

سرخسی کی کتاب میں ہمعصر معاشرتی اور معاشی معلومات بھی کثرت سے ملتے ہیں، جن سے مورخ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بخارا کے مکانوں کا کوفے کے مکانوں سے مقابلہ کیا ہے [۷]۔

سرخسی سیاسی قیدی تھے۔ اس لیے جب وہ اپنی سیاسی بصیرت کا جابجا مظاہرہ

کرتے ہیں تو کوئی تعجب نہیں ہوتا مثلاً سب جانتے ہیں کہ رسول اکرم نے صلح حدیبیہ بظاہر دب کر کی تھی، لیکن کوئی سیرت نگار یا سیاست نگار مؤلف ہمیں نہیں بتاتا کہ اس کی وجہ کیا تھی۔ اب امام سرخسی کی توجیہ ۱۸؎ کو پڑھیے اور سر دُھنیے: لأنه كان فيه نظر للمسلمين لما كان بين أهل مكة وأهل خيبر من المواطأة على أن رسول الله صلى الله عليه وسلم اِذا توجه اِلى أحد الفريقين أغار الفريق الآخر على المدينة. فوادع أهل مكة حتى يأمن من جانبهم اِذا توجه اِلى خيبر. یعنی مدینے کا محلِ وقوع مکّہ اور خیبر کے بیچوں بیچ ہے اور اس وقت نہ صرف دونوں ہی دشمن تھے، بلکہ ان دونوں دشمنوں کے درمیان سمجھوتا بھی تھا کہ اگر پیغمبر اسلام ایک پر حملہ کریں، تو دوسرا مدینے پر دھاوا بول دے۔ اسی لیے رسولِ اکرم نے اہلِ مکّہ سے ان کی منھ مانگی شرطوں پر صلح فرمالی، تاکہ خیبر پر حملہ کرتے وقت ادھر سے اطمینان رہے۔

''شرح السیر الکبیر'' میں خاص کر اور اپنی دوسری کتابوں میں بھی عام طور پر سرخسی جب بھی امام محمد کی کسی ذاتی رائے کی توجیہ کرتے ہیں، تو فقہ کے اصول کلیہ سے استدلال کرتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں سرخسی سے متعلق مقالہ نگار ہیفینگ کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ''سرخسی اپنی اس کوشش کے باعث ممتاز ہیں کہ وہ قانون کے عام اساسات (اصول کلیہ) کو نمایاں کرتے ہیں''۔

خاتمہ:

یہ چند معلومات جو پیچیدگیوں سے خالی نہیں، اہلِ علم کے ملاحظے میں پیش ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو دلچسپی ہوئی، اور تلاش کی فرصت بھی، تو اپنی تحقیقت سے وہ ان میں اصلاح واضافہ کرسکیں گے۔ یہی علم کی ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی میرا اخلاقی فریضہ ہے کہ اس مقالے کے سلسلے میں دار الکتب المصریہ کے محترم مدیر، اور اس طرح کلیۃ الآداب دمشق کے عزیز پروفیسر صبحی صالح نے قاہرہ اور دمشق کے مخطوطاتِ ''کتاب المبسوط'' وغیرہ کو میری خاطر دیکھنے اور تفصیلات لکھ

بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ جزاھما اللہ خیر الجزاء۔ نیز مجھے معلوم ہوا کہ جامع ازہر میں بھی ''مبسوط'' کے مخطوطے ہیں، لیکن ان سے استفادے کی تا حال کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ وللہ عاقبۃ الامور۔

حواشی

۱ ''بیان طبقات المجتہدین والمقلدین'' مخطوطۂ انقرہ: ۶۲ ب

۲ حدائق الحنفیہ: ۲۰۵

۳ مقدمۃ الہدایۃ: ۱۸

۴ حدائق الحنفیہ: ۲۰۷

۵ عربی نمبر ۲۸۰۰، مجموعہ، ورق ۴۴۲ ب تا ۴۶۵ ب، ۳۱ سطر والی بڑی تقطیع پر

۶ مسالک الابصار، مخطوطۂ آیا صوفیا ۳۴۱۹، جلد پنجم، ص ۲۸ ب

۷ المبسوط: ۱۲: ۱۰۸

۸ تاج التراجم، نمبر ۱۵۷

۹ دیکھو: BSOS, London, 111, 151-8, Barthold : The Buhgra Khan mentioned.

۱۰ شرح السیر الکبیر، جلد چہارم کا خاتمہ

۱۱ دیکھیے، کتائب اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار، مخطوطۂ اسعد آفندی، استانبول: نمبر ۵۴۸، ورق ۱۹۱ الف

۱۲ حدائق الحنفیہ: ۲۰۵

۱۳ المبسوط: ۱: ۴

۱۴ دار الکتب، فقہ حنفی ۴۹۰

۱۵ دار الکتب، فقہ حنفی، ۹۴۳

۱۶ شرح السیر الکبیر، ج ۱، ص ۳۶۶

۱۷ مبسوط ج ۱۵، ص ۳۰

۱۸ شرح السیر الکبیر: ۱:۲۰۱

کتابیات

(۱) ابن فضل اللہ العمری (ف ۷۴۹) : مسالک الابصار (مخطوطہ آیا صوفیا وتوپقاپی، استانبول)

(۲) ابن قطلع بغا (ف ۸۷۹): تاج التراجم (طبع جرمنی)، سوانح نمبر ۳۸

(۳) ابو الوفا الافغانی (ہمارے محترم معاصر) نے ''اصول سرخسی'' اور ''شرح زیادات الزیادات'' کو مرتب کرتے مقدمے میں سرخسی کے حالت دیے ہیں۔

(۴) التمیمی الغزی (ف ۱۰۰۵): الطبقات السنیہ (مخطوطہ یکی۔ جامع، استانبول)

(۵) حاجی خلیفہ (ف ۱۰۶۷ھ): کشف الظنون۔

(۶) طاشکوبری زادہ (ف ۹۶۸ھ): مفتاح السعادہ (طبع حیدرآباد)، ج ۲، ص ۵۵۔۵۶۔

(۷) عبدالقادر بن ابی ابوفا القرشی (ف ۷۷۵ھ): الجواہر المضیئۃ (طبع مصر)، ج ۲، ص ۹۲

(۸) عبد الحی لکھنوی (ف ۱۳۰۴ھ) : الفوائد البہیّۃ (طبع مصر) ص ۱۵۸۔۱۵۹: انھیں کی ''السعایۃ شرح شرح الوقایۃ'' (طبع دہلی) ص ۳۲:؛ انھیں کی: ''عمدۃ الرعایۃ فی حل شرح الوقایۃ'' (طبع لکھنؤ ص ۴۱؛ انھیں کی: ''مقدمۃ الہدایۃ للمرغینانی'' (طبع دہلی)، ص ۱۸۔

(۹) فقیر محمد جہلمی ثم لاہوری (ف؟): حدائق الحنفیہ (اُردو) (طبع لکھنؤ): ص ۲۰۵۔۲۰۷۔

(۱۰) الکفوی محمود بن سلیمان (ف ۹۹۰): کتائب اعلام الاخیار (مخطوطہ اسعد افندی، استانبول)

(۱۱) کمال باشازادہ الرومی (ف ۹۵۰): طبقات المجتہدین والمقلدین (مخطوطہ انقرہ ۷۶۸، در مجموعہ)

(۱۲) الکوثری محمد زاہد (جن کا ۱۹۶۳ء میں انتقال ہوا) بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن

الشیبانی
(۱۳) محمد منیب دباغ زادہ عینتابی (ف ۱۲۳۸): تیسیر المسیر فی شرح السیر الکبیر (مخطوطۂ جامعہ استانبول) کا دیباچہ؛ انھیں کی: ''شرح السیر الکبیر کا ترکی ترجمہ''، طبع استانبول کا دیباچہ۔
(۱۴) المرجانی شہاب الدین (ف ۱۳۰۷ھ): غرفۃ الخواقین فی غرفۃ الخواقین (طبع قازان) ص ۲۷
(۱۵) المنجد صلاح الدین (ہمارے معاصر ہیں): شرح السیر الکبیر کے نئے ایڈیشن کا دیباچہ۔
(۱۶) Brockelmen. GAL+Supplement. 1.172.373 Encyclopedia of Islam. s.v. Sarakhsi by Heffening.
(۱۷) Flungel. Classen der hanefitischen Rechtsgelehrten. p.270-358 (p. 275. 303-4. 301-2. 305-7. 320. 322).
(۱۸) Hamidullah. Contribution de I'Iran a la botanique ef a la science juridique: Dinawari et Sarakhsi, in : pensee Chiite. Paris. vol.1.13-18.
(۱۹) Heffening. Das islamische Fremdenrecht. appendix.
(۲۰) Schacht. Sur la transmission de la doctrine dans les ecoles juridiques de I'Islam. in : Annales de l'Institut d'Etudes Orientales. Algiers. 1952. X. 399-419; : Aus den Bibliotheken von Konstantinopel und Kairo; : Aus Kairiner Bibliotheken; : Aus orientalischen Bibliotheken; etc.

۳

حافظ سخاوی کے سب سے پہلے گجراتی شاگرد
مولانا راجح بن داؤد احمدی

-مولانا ضیاء الدین اصلاحی
(دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ)

ہندوستان میں علم حدیث کا اصل فروغ نویں صدی ہجری کے آخر اور دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ہوا، یہ وہ زمانہ ہے جب مصر وشام اور حجاز میں امام الحدیث حافظ محمد بن عبدالرحمان بن محمد سخاوی (م ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) کے فضل وکمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور ان کے فیض وافادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ کو منور کررہی تھیں، مدینہ منوری میں ان کے کمال نے مورعلی نور کا مرتبہ حاصل کیا، مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) رقم طراز ہیں:۔

> ''ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا یعنی بحر عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجد اور مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں''۔[1]

اور گجرات میں بھی جس مبارک شہر کے مایہ ناز شخص کو سب سے پہلے حافظ سخاوی کی بارگاہ فضل وکمال میں باریاب ہونے کا فخر حاصل ہوا وہ اس کا پایہ تخت اور آپ کا یہی شہر احمد آباد تھا اور یہاں کے وہ خوش قسمت شخص مولانا راجح بن داؤد تھے، مولانا سید سلیمان

ندوی تحریر فرماتے ہیں:۔

''حافظ سخاوی کے تلامذہ میں سے سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں، ۸۹۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقے میں داخل ہوئے اور الفیۃ الحدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا'' ۲۔

مگر گجرات اور احمد آباد کا یہ یگانہ شیخ ومحدث ایسے گوشۂ گمنامی میں چلا گیا کہ بہ قول حکیم مولانا سید الحیٔ مرحوم (م ۱۹۲۳ء) سابق ناظم ندوۃ العلماء:۔

''افسوس ہے کہ ایسے باکمال شخص کی تصنیفات سے ملک محروم ہے اور کوئی کتاب ان کی اب نہیں ملتی، ۹۰۴ھ میں وفات پائی، احمد آباد میں دفن ہوئے مگر اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ان کی قبر کہاں ہے؟'' ۳۔

آج ان کا نام اور تھوڑا بہت جو حال محفوظ ہے وہ ان کے شیخ واستاذ حافظ سخاوی کی دین ہے، اگر انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''الضؤ اللامع لاھل لقرن التاسع'' میں ان کے متعلق چند سطریں نہ لکھی ہوتیں تو ہندوستان اور گجرات کے لوگوں کو ان کا کوئی سراغ بھی نہ لگتا، ہم بھی ان کے بارے میں کوئی نئی اطلاع نہیں دینے جارہے ہیں تاہم الضؤ اللامع اور اس کے حوالے سے جن لوگوں نے مولانا راجح کے حالات وکمالات کی داستان سنائی ہے، اسی کو یہاں یہ کہتے ہوئے پیش کررہے ہیں کہ ۔

در موسم گل گر بہ گلتاں نہ رسیدیم از دست نہ دادیم تماشائے خزاں را

امید ہے کہ یہ اعادہ وتکرار لطف سے خالی نہ ہوگا۔

نام ونسب: مولانا کا نسب نامہ جس قدر ملتا ہے وہ یہ ہے:

راجح بن داؤد بن محمد بن عیسیٰ بن احمد ۴۔

نسبتیں : الہندی، الگجراتی، الاحمد آبادی وطنی اور الحنفی مسلکی نسبتیں ہیں۔

خاندان : مولانا راجح ایک ذی علم گھرانے کے فرد تھے، ان کے خاندانی بزرگوں کے حالات مفقود اور ہماری دست رس سے باہر ہیں مگر اپنے والد کے متعلق خود مولانا راجح نے

حافظ سخاوی کو بتایا تھا کہ وہ ایک فاضل شخص تھے اور ۸۷۲ھ/ ۶۷۔۱۴۶۸ء میں ان کی وفات ہوئی۔۵

علامہ سخاوی نے ان کے ایک چچا اور بھائی کا بھی تذکرہ کیا ہے، چچا کا نام سلیمان بن محمد تھا، یہ ۸۴۰ھ/ ۳۶-۱۴۳۷ء میں پیدا ہوئے، انہیں علم وفن سے اشتغال تھا اور بعض فنون میں ممتاز تھے، مولانا راجح نے ان سے استفادہ کیا تھا اور میری کتاب شرح الفیۃ الحدیث کے لکھنے میں انہوں نے اپنے بھتیجے کی معاونت کی تھی۔۶

علامہ سخاوی نے مولانا راجح کے ایک بڑے بھائی قاسم بن داؤد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ۸۶۹ھ/ ۶۵-۱۴۶۴ء میں پیدا ہوئے، انہیں بھی علم وفن سے اشتغال تھا اور ان کا نام ان کے چھوٹے بھائی مولانا راجح کے ساتھ آتا ہے اور یہ ان ہی کے ساتھ مکہ میں مجھ سے ملے تھے اور مجھ سے درس بھی لیا تھا ور شرح الفیہ کی نقل میں اپنے بھائی کی معاونت کی تھی۔۷

پیدائش : مولانا راجح ۹؍صفر ۸۷۱ھ/ ۱۴۶۶ءکو احمد آباد میں پیدا ہوئے۔۸

پرورش وپرداخت : مولانا راجح کی نشوونما ان کے مولد احمد آباد میں ہوئی، وہ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے تھے، ابھی مکمل دو برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہوگیا تھا۹، اس لیے ان کی پرورش وپرداخت چچا کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ہوگی۔

تعلیم اور اساتذہ : مولانا راجح کی مکمل تعلیم احمد آباد میں ہوئی جو اس زمانے میں پایہ تخت ہونے اور سلاطین گجرات کی علم وادب نوازی کی وجہ سے علما واعیان کا مرکز تھا، ان کے حسب ذیل تین اساتذہ کا ذکر حافظ سخاوی نے کیا ہے:۔

محمود بن محمد مقری، حنفی، احمد آباد : حافظ سخاوی لکھتے ہیں کہ شیخ فاضل محمود بن محمد مقری اپنے زمانے کے مشاہیر علما میں تھے، ان سے جن فضلائے روزگار نے استفادہ کیا ان میں راجح بن داؤد بھی تھے بلکہ راجح کے اصل استاد یہی تھے، ان سے جن فضلائے روزگار نے استفادہ کیا ان میں راجح بن داؤد بھی تھے بلکہ راجح کے اصل استاد یہی تھے اور ان سے انہوں نے زیادہ استفادہ کیا تھا اور احمد آباد میں ان سے نحو، صرف، منطق اور عروض وغیرہ کی تحصیل

کی تھی ١٠، ٨٩١ھ/ ١٤٨٦ء میں وفات پائی۔

مخدوم بن برہان الدین احمد آباد: حافظ سخاوی کے بیان کے مطابق یہ بھی طلبہ کو درس دیتے تھے، راجح نے ان سے معانی و بیان کی کتابیں پڑھیں، امام سخاوی نے مولانا راجح کے حوالے سے ان کو عالم، فاضل کہا ہے، تقریباً ٤٠ برس کے سن میں ٨٩٠ھ/ ١٤٨٥ء میں وفات پائی، انہوں نے ایک مدرسہ قایم کیا تھا، ان کا مدفن ان کے گھر اور مدرسہ کے درمیان تھا۔ ١١

محمد بن تاج حنفی احمد آبادی: یہ علما و طلبہ کو ہیئت و کلام پڑھاتے تھے، مولانا راجح نے بھی ان فنون کا درس ان سے لیا تھا، حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ ٨٩٤ھ/ ١٤٨٩ء میں مولانا راجح نے مجھ کو بتایا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہیں اور اس وقت ان کی عمر تقریباً ٤٠ برس ہوگی۔ ١٢

وطن میں رسمی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا راجح نے حج بیت اللہ کیا اور وہاں امام الحدیث محمد بن عبد الرحمٰن بن سخاوی کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور ان سے فیض یاب ہوئے جو شارح بخاری، صاحب فتح الباری حافظ ابن حجر احمد بن علی عسقلانی (م ٨٥٢ھ/ ١٤٤٨ء) کے اجل تلامذہ میں تھے، ان کا مختصر حال بھی قلم بند کیا جاتا ہے۔

محمد بن عبد الرحمٰن بن محمد سخاوی: یہ ربیع الاول ٨٣١ھ/ ٢٨-١٤٢٧ء میں پیدا ہوئے اور ٢٨ رشعبان ٩٠٢ھ/ ١٤٩٦ء کو وفات پائی، مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں امام مالکؒ (متوفی ١٧٩ھ/ ٧٩٥ء) کے پہلو میں مدفون ہوئے، ان کے شیوخ کی تعداد چار سو سے زیادہ پائی جاتی ہے جن میں مکہ و مدینہ کے مشائخ اور شام کے علما بھی شامل تھے، محمد بن فہد المعروف بابن فہد مکی (م ٨٧١ھ- ٧٩٥ھ) کے پہلو میں مدفون ہوئے، ان کے شیوخ کی تعداد چار سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے جن میں مکہ و مدینہ کے مشائخ اور شام کے علما بھی شامل تھے، محمد بن فہد المعروف بابن فہد مکی (م ٨٧١ھ/ ٦٦-١٤٦٧ء) ان کے خاص شاگرد تھے، کئی بار حج بیت اللہ کی سعادت اور اس کے جوار میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔

سخاوی کی عظمت و جلالت کا اندازہ بعض علما کے اس قول سے ہوتا ہے کہ ''حافظ ذہبی (م ٧٤٨ھ/ ١٣٤٧ء) کے بعد ایسا فاضل و کامل شخص پیدا نہیں ہوا، ان کی وفات سے

فن حدیث کی موت ہوگئی، امام شوکانی (م ۱۲۵۰ء/ ۱۸۳۴ھ) کے خیال میں ان کی کتاب الضوء اللامع کو حافظ ابن حجر کی تصنیف الدرر الکامنہ پر ترجیح حاصل ہے، وہ اگر اس کے علاوہ کوئی اور کتاب نہ بھی لکھتے تو تنہا یہی کتاب ان کی امامت وفضل کی دلیل تھی، کاش اس میں انہوں نے اپنے معاصرین اور کبار علما کی تنقیص اور عیب جوئی نہ کی ہوتی۔ [۱۳]

مولانا راجح کی یہ خوش قسمتی ہے کہ ان کے استاد وشیخ حافظ سخاوی نے ان کا اور ان کے تعلق سے ان کے چچا اور بڑے بھائی کا حال اپنی اس عظیم الشان کتاب میں کہا، انہوں نے اپنے شاگرد مولانا راجح بن داؤد سے اپنی ملاقات، ان کے تلمذ، جودت فہم، معقول ومنقول میں ان کی دست گاہِ کامل اور شعر گوئی سے ان کی مناسبت طبع وغیرہ کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے۔

''راجح گجراتی ۸۹۴ھ/ ۱۴۸۹ء میں مکہ معظمہ میں مجھ سے ملے تھے، جب وہ اپنے بھائی قاسم اور چچا کے ساتھ حج کے لیے آئے تھے، حج وہ اس سے پہلے والے سال کر چکے تھے، اس کے بعد وہ روضۂ نبوی کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ گئے تھے، وہاں سے مکہ واپس آئے تو میری ملاقات اور مجھ سے میری مکمل کتاب شرح الفیۃ الحدیث [۱۴] پڑھی اور ربیع الاول میں اس سے فراغت حاصل کی اور میری مدح میں کچھ اشعار کہے، میں نے ان کو اہم امور پر مشتمل ایک جامع ومکمل اجازت عطا کی جو تین چیزوں کے بقدر تھی، مولانا راجح تمام فنون میں ماہر تھے، انہوں نے مجھ سے بدر دمامینی [۱۵] کا ترجمہ دریافت کیا تھا جو ان کو تحریر کرادیا تھا، بدر کی وفات ہندوستان ہی میں ہوئی تھی، مزید برآں محمد [۱۶] بن محمد بن العلا البخاری العجمی الحنفی کے ترجمے سے بھی ان کو آگاہ کردیا تھا اور اس سے بھی خبردار کیا تھا کہ وہ ابن عربی [۱۷] اور ان کے معتقدین کی تکفیر کرتے تھے، یہ تنبیہ اس لیے تھی کہ وہ اس سے فایدہ اٹھا کر ان کے معتقدین کا دفاع کرسکیں، کیونکہ ابن عربی کی عظمت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ ان سے بڑی عقیدت اور ان کی تصنیفات سے نہایت اشتغال رکھتے تھے۔

جس زمانے میں مولانا راجح اور ان کے بھائی مجھ سے پڑھ رہے تھے، دونوں مجھ سے برابر چمٹے رہتے تھے، ان لوگوں نے بخاری شریف کے کچھ حصوں اور میری بعض دوسری

تصنیفات کا سماع بھی مجھ سے کیا اور میں نے اپنی کتاب کے نسخے بھی ان کو دیے تھے''۔ ۱۸؎

حافظ سخاوی سے مولانا راجح کا استفادہ، شرح الفیہ کی اجازت حاصل کرنا اور صحیح بخاری کے بعض اجزا کا درس لینا ہی ان کی عظمت اور بلند پائگی کے لیے کچھ کم نہ تھا کہ مزید براں خود استاد بھی اپنے شاگرد کے فضل وکمال کا اعتراف بڑے شان دار لفظوں میں کر رہے ہیں، مختلف علوم وفنون میں ان کی مہارت کی شہادت دے رہے ہیں اور ان کے ذوق شعر وسخن کی داد دے رہے ہیں، اس کے بعد کس کو ان کی جامعیت وکاملیت، تجر اور رسوخ فی العلم میں شک وشبہ ہوسکتا ہے، وکفی به فخرا۔

مولوی رحمان علی بناری (م ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۷ء) فرماتے ہیں:

در جملہ فنون تجر پیدا کرد وطبع مایل بشعر داشت واجازت الفیہ حدیث از سخاوی گرفتہ ۱۹؎	مولانا راجح تمام فنون میں متجر تھے اور ان کی طبیعت کا میلان شعر کی جانب بھی تھا اور حافظ سخاوی سے الفیہ حدیث کی اجازت پائی تھی۔

یہ باکمال عالم ومحدث جب حجاز سے حافظ سخاوی اور دوسرے اساتذہ فن سے فیض یاب ہوکر اپنے وطن احمد آباد واپس آیا تو قدر دانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی، ظاہر ہے جب وہ مسند درس پر رونق افروز ہوا ہوگا تو طلبہ اور علوم نبوت کے شیدائیوں کا تانتا اس کے درس میں لگ گیا ہوگا، اس کے قلم نے بھی اپنے جوہر دکھائے ہوں گے اور اس کی تحریروں نے علم وفن کے عقیدے بھی حل کیے ہوں گے لیکن واحسرتا کہ آج نہ اس کی درس گاہ کا پتا ہے، نہ طلبہ کے ناموں اور تعداد کا علم ہے، اس کی بھی خبر نہیں کہ اس نے کتنی تصانیف یادگار چھوڑیں۔

مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے　　زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

وفات: مولانا راجح نے کم عمر پائی، ۳۳ برس کی عمر میں ۹۰۴ھ/ ۱۴۹۸ء میں وفات ہوگئی ۲۰؎، ان کے مدفن کا پتا نہیں۔

حواشی

(۱) مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی: مقالات سلیمان حصہ دوم ص:۱۰، معارف پریس اعظم گڑھ طبع اول ۱۳۸۷ھ/ ۱۹۶۸ء۔

(۲) ایضاً ص:۱۱

(۳) مولانا حکیم سید عبدالحئی: یاد ایام تاریخ گجرات، ص:۵۴، شاہی پریس لکھنؤ بدون سن

(۴) محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد سخاوی: الضؤ اللامع جلد۳، ص:۲۲۲، مکتبہ القدسی قاہرہ، ۱۳۵۴ھ۔

(۵) ایضاً ص:۲۱۶۔

(۶) محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد سخاوی: الضؤ اللامع جلد۳ ص:۲۶۹ و ۲۷۰، مکتبہ القدسی قاہرہ، ۱۳۵۴ھ۔

(۷) ایضاً جلد۶، ص:۱۸۰۔

(۸) ایضاً جلد۳، ص:۲۲۲۔

(۹) ایضاً۔

(۱۰) الضؤ اللامع ج۳ ص:۲۲۲، وجلد۱۰ ص:۱۴۸، مکتبہ قدسی ۱۳۵۵ھ۔

(۱۱) ایضاً ص:۱۵۰۔

(۱۲) الضؤ اللامع ج۷، ص۲۰۷۔

(۱۳) نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ/ ۱۸۹۰ء): التاج المکلل من جواہر مآثر الطراز الآخر والاول ص:۳۰۳، مطبع صدیقی بھوپال، ۱۲۹۸ھ۔

(۱۴) الفیۃ الحدیث اصول حدیث میں حافظ زین الدین عبد الرحیم بن حسین عراقی (م۸۰۵ھ/۱۴۰۲ء) کی مشہور کتاب ہے جو ابو عمرو بن عثمان بن عبدالرحمٰن المعروف بابن صلاح (م ربیع الاول ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء) کی کتاب علوم الحدیث یعنی مقدمہ ابن صلاح کی تلخیص ہے مگر عراقی نے اس میں اس پر بہت سے اضافے بھی کیے ہیں،

حافظ سخاوی نے عراقی کی کتاب کی شرح لکھی تھی جو بہت مقبول ہوئی اور اس فن کی جامع ومحقق کتاب خیال کی جاتی ہے (کشف الظنون ج ا ص ۱۴۵ و ۱۴۶، مطبع عالم ترکی طبع اول)۔

(۱۵) علامہ بدر الدین محمد بن ابی بکر دمامینی القریشی المخزومی علوم ادب کے ماہر تھے، ۷۶۳ھ/ ۶۳-۱۲۶۴ء میں اسکندریہ میں پیدا ہوئے، وہاں کے علما سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد قاہرہ میں سراج الدین بن ملقن (م۸۰۴ھ/ ۱۴۰۱ء) وغیرہ سے سماع کیا، مکہ کے علما سے بھی استفادہ کیا، اسکندریہ کے متعدد مدارس کے علاوہ جامع ازہر مصر میں درس دیا، ایک سال یمن کی جامع زبید میں بھی مسند درس کو رونق بخشی، عربیت وادب کے علاوہ فقہ میں بھی درس تھا، اسکندریہ وقاہرہ میں نایب قاضی مقرر ہوئے، دمشق میں قضاے مالکی پر مامور ہوئے، شعر اچھا کہتے تھے، کئی تصانیف یادگار چھوڑیں، جمال الدین ابوعبداللہ محمد بن عبد السلام (م۶۷۲ھ/ ۱۲۷۳ء) جو ابن مالک کے نام سے مشہور ہیں اور نحو میں ان کی معروف کتاب تسہیل الفواید وتکمیل المقاصد ہے، دمامینی نے اسی کی شرح تعلیق الفراید کے نام سے لکھی تھی جو شرح التسہیل کے نام سے مشہور ہے، صحیح بخاری کی شرح مصابیح الجامع کے نام سے لکھی، اس میں نحو واعراب کے مباحث سے زیادہ تعرض کیا ہے، محمد بن موسی کمال الدین (م۸۰۸ھ/ ۱۴۰۵ء) دمامینی کی مشہور کتاب حیاۃ الحیوان کا خلاصہ مختصر حیاۃ الحیوان کے نام سے کیا تھا، یہ تینوں کتابیں انہوں نے فرماں روائے گجرات سلطان احمد شاہ کے نام سے معنون کی تھیں، دمامینی یمن سے سمندری راستے سے گجرات آئے یہاں لووگس نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور خوب استفادہ کیا، احمد آباد میں برسوں درس وتدریس کی خدمت انجام دی اور یہیں ان کو تسہیل کا نسخہ بھی ملا تھا اور اپنے تلامذہ کی فرمایش پر اس کی شرح لکھی تھی، شعبان ۸۲۷ھ/ ۱۴۲۴ء کو دکن کے شہر گل برگہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے، کہا جاتا ہے کہ انہیں زہر دیا گیا تھا (الضوء اللامع کے علاوہ سیوطی (م۹۱۱ھ) کی بغیۃ الوعاۃ، ابن عماد حنبلی

(م۱۰۸۹ھ) کی شذرات الذہب، شوکانی کی البدر الطالع اور مولانا عبد الحیٔ کی نزہۃ الخواطر میں بھی ان کے حالات درج ہیں)۔

(۱۶) علاء بخاری علامہ تفتازانی کے شاگرد تھے جو معقول و منقول میں دست گاہ کامل رکھتے تھے، علاء ۷۷۹ھ/ ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوئے، تصوف وادب سے شغف تھا، علم وفن کی اشاعت کے لیے ہندوستان بھی آئے تھے پھر مکہ وقاہرہ گئے، ابن عربی اور ان کے نظریہ وحدت کے مخالف تھے، ان کا انتقال ۸۴۱ھ/ ۱۴۳۷ء میں ہوا۔

(۱۷) یعنی شیخ اکبر محمد بن علی ابوبکر المعروف بابن عربی اندلسی صاحب فتوحاتِ مکیہ (ولادت ۵۶۰ھ/ ۶۴-۱۱۶۵ء، وفات ۶۳۸ھ/ ۱۲۴۰ء)، یہ عجیب بات ہے کہ شیخ ابن عربی صوفیہ کے یہاں جس قدر مقبول ہیں اسی قدر فقہا ومحدثین کے حلقے میں مردود سمجھے جاتے ہیں، حافظ سخاوی نے مولانا راجح کو اس لیے علاء بخاری کی تنبیہ سے آگاہ کیا تھا اور خود بھی القول المنبی فی ترجمة ابن عربی کے نام سے ایک مفصل کتاب لکھی جس کا خلاصہ ایک جز میں الکفایة فی طریق الهدایة کے نام سے کیا تھا، ان کی ایک اور کتاب تجرید اسماء الآخذین عن ابن عربی بھی ہے (الضؤ اللامع، ج۸، ص۱۷)۔

(۱۸) الضؤ اللامع جلد۳، ص۲۲۲۔

(۱۹) مولوی رحمان علی : تذکرہ علماے ہند، ص: ۶۲، طبع اول، مطبع نورکشور، ۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء۔

(۲۰) مولانا سید عبدالحیٔ حسنی: نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر، ج۴، ص۱۱۱، مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدرآباد، ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۴ء۔

۴

نظیری نیشاپوری کی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں

- پروفیسر سید امیر حسن عابدی
(دہلی یونیورسٹی)

مغلیہ دور کا سب سے بڑا غزل گو نظیری نیشاپوری[۱] ہے، جسکے لئے صائب[۲] نے کہا تھا۔

صائب چہ خیالست شوی ہمچو نظیری
عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

کئی سو برس تک نظیری کا جادو ہم سب پر چلتا رہا۔ اگر غالب نے ان کی پرستش کی، تو علامہ اقبال نے ان کے ایک مصرع کو جمشید کی سلطنت پر ترجیح دی ہے۔

بہ ملک جم نہ دہم مصرع نظیری را
کسی کہ کشتہ نشد از قبیلۂ مانیست

مگر کتنی بدقسمتی ہے کہ آج تک کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کے کلام کو جمع کر کے شائع کرتا۔ ایران میں پروفیسر مظاہر مصفا* نے وہاں کے قلمی نسخوں کی مدد سے ان کا دیوان شائع کیا ہے۔ مگر ان کے دیوان کے بے شمار قلمی نسخے ایشیا اور یورپ کے کتب خانوں اور میوزموں میں موجود ہیں۔ اگر ان سب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس بڑے شاعر کا بہت سا کلام، جو اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا ہے، ہم تک پہنچ سکے گا۔

---

* دیوان نظیری نیشاپوری از روی سہ نسخۂ معتبر فارسی با مقابلہ و تصحیح و تنظیم و جمع و تدوین مظاہر مصفا، بہ سرمایۂ کتابخانہ ھای امیر کبیر و زوار، خرداد ماہ ۱۳۲۰ھ ش۔

میں نے کچھ سال پہلے، نظیری کے دیوان کے دو قلمی نسخوں[4] سے کئی غیر مطبوعہ غزلیں نکالیں اور شائع کی تھیں[5]۔ علاوہ ازیں ان کا ایک ترجیع بند شایع کیا جو جہانگیر[6] کی تخت نشینی پر کہا گیا تھا اور جس میں ہر بند کے آخر میں یہ مصرع دہرایا جاتا ہے ۔

شہ جہانگیر ابن اکبر بادشاہ

رام پور رضا لائبریری میں دیوان نظیری کے کئی قلمی نسخے ہیں، جن سے ان کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام نکالا جا سکتا ہے۔ میں نے صرف دو قلمی نسخوں[8] سے حسب ذیل ایسی غزلیں نکالی ہیں، جو آج تک شائع ہو کر منظرِ عام پر نہیں آئی ہیں :

بستم در تصرّف گفت وشنید خویش
دارم بفیض ربط تو قفل کلید خویش

رفتم بآہ گریہ کنم سازِ خلوتی
بردم ز مجلس تو نشید ونبیذ خویش

شب از خیال وصل تو خوابم نمی برد
چون کودکان خویش را روز عید خویش

با صد ستارہ سوختہ دارم قرینہ ای
در منّتم زاختر بخت سفید خویش

برھر نظر دو جلوہ بیک رنگ دیدہ اند
بینم ہمیشہ در غلط از لہو دید خویش

ترسم کہ یار روز جزا سر بسر کند
با ذوق تیغ خویش ثواب شہید خویش

چہل سال شد کہ مرثیہ خوانم بہ صوب عمر
تا کی بشور خویش سرایم نبیذ خویش

شد عمر و قید بندگی از گردنم نرفت
سرمایہ باختم بفروش و خرید خویش

تلخ مسیح از تہ چشم کہ دیدہ اند
درنیستی خویش علاج مفید خویش
از جان مرید پیر مغانم کہ خلق او
کردہ است منکران جہاں را مرید خویش
سودای چون توئی بہ نظیری کجا رسد
صد زھرہ مشتری تو در من مرید خویش ۳؎

بر غمزدہ ای خندہ زدم گفت حزین باش
گر با تو ہم اندیشۂ ماھست چنین باش
گفتم شدۂ دل، منکر دین گفت غمی نیست
گفت عاشق ما باش وصنم خانہ نشین باش
کافیست اگر عشق بود عرض شہادت
تصدیق کن وبی خبر از مذھب ودین باش
از دور فلک شکر کن و دور کواکب
بخت تو کہ خوبست بد روی زمین باش
از خط سیہ کار تو در فکر شبیخونست
گو آہ مرا توسن شبرنگ برین باش
آزردہ مگردیدی از ابرام نظیری
ھر چند کہ بہتر شدہ ای بہتر ازین باش ۴؎
در فکر ھما بودن صیاد ھمایونست
در دام تو ھر چند نیفتد بہ کمین باش
کس را (چو) بہ جولان گہ سیمرغ نبردہ
شاید کہ مثالی بنماید بچنین باش

افلاک و زمین بار امانت نکشیدند

آن حوصله پیدا کن و آنگاه امین باش

تاهست نزاعی بدلت دشمن خویش

گر دوست نه‌ای باهمه باخویش یکمین باش

از تلخ سخنهای تو ما پند گرفتیم

گو خاتم یاقوت تو الماس نگین باش۵

بفالی از لب تو تا ابد هما قانع

بیک نگاه ز چشم تو بادشا قانع

جهان و آخرت از راندگان راه تواند

دو عالم از تو بیک حرف آشنا قانع

فروغ روز تو بر فرق ما نمی آید

به نکهت دم صبحم از صبا قانع

کتاب قول و غزل گر و عشق تا نشویم

بآب و دانه چو مرغان بی نوا قانع

صفای۶ فطرت ما کرد خاک ما اکسیر۷

نگشته ایم به نیرنگ کیمیا قانع

هوای چشمهٔ آب بقا ست در سر ما

کجا شویم بهر آب و هر۸ هوا قانع

غبار دیدهٔ ما برد و قدر خود ننمود

نمی شویم ز عیسی بتوتیا قانع

تفقدی . نمائی تعرضی فرما

ز شکر تو به تلخی شود گدا قانع

چه رنجها که نظیری ز عہد دوست ندید
پس از ھزار بلا شد بیک عطا قانع ۹

تو این کشادہ کرمہا بدام فکر مباف
امید نیست که عنقا بر آید از پس قاف
درین دیار که مائیم آدمیت نیست
تو ھر کجاش به بینی بگو چه شد انصاف
مراز سنّت و فرضت ۱۰ که انتخاب افتاد
امام سادہ رخ و عشق پاک و بادۂ صاف
ز حلم و زھد و ورع بوی شید می آید
کجاست بادہ که از خود بشوئیم این اوصاف
جمالِ جاں بخش وفا صفا دارد
ترا که حسن وفا نیست از جمال ملاف
شجاعتی که بر آید ۱۱ بدیگری سہل است
اگر بخویش بر آید تہمتنی ۱۲ بمصاف
کی این جماعت ما خدا شناس شوند
که در امور خلافت ھمی کنند خلاف
ترا چنانکه توئی وصف می توانم کرد
خطیب شہر اگر تیغ می نہد بغلاف
نه عارفست که گفت از حسد نظیری را
چگونه صیت تو اقلیم را گرفت اطراف
نه لطف شه شدہ دیہیم پوش درزی شہر
چه حیرت است اگر جوھری شود صرّاف

آتشین گفتار خاک پیکرم
قطعۂ باغ خلیل آزرم[13]
در دم احیای عیسی معجزم
در ید بیضای موسیٰ دفترم
جای گل بلبل بر آرد شاخ گل
گرفشانی بر چمن خاکسترم
غوطہ ہا در بحر معنی صنع کرد
تا بزاد از نہ صدف یک گوھرم
عالم معنی نبورم روشن است
در حقیقت آفتاب دیگرم[14]
از سخن حق کس ھیولائی نمود
من ھیولای سخن را جوھرم
کس بہ معیارم[15] نمی آرد سخن
ھین محک صاحب عیار این[16] زرم
وصل معنی دیر اگر دستم دھد
پردۂ افلاک را درہم درم
اختران چون سرمہ در چشم کشند
آسمان گوید غبار آن درم
جوھرم جسمم نمی دانم چہ شد
ھرچہ ھستم غرق مہر حیدرم[17]
بر تر از حال نظیری نکتہ ہا
گویم و از خود نیاید باورم[18]

خوشا باتو بابالین سر نهادن
شراب و شمع را بر در نهادن
بایوان مطرب و دلاله راندن
به مجرا ۱۹ و چادر نهادن
کف وساقت بدست وساق سودن
بروی دوشت دوش و بر نهادن
رخ مانند برگ زعفران را ۲۰
بروی چون گل احمر نهادن
لبان شکرینت را گزیدن
زبان تا کام در شکر نهادن
ز مهرت پای بر گردن گرفتن
بنازت پشت بر بستر نهادن
دم جبریل در حریم دمیدن
مسیحی تازه بر منظر نهادن
پس آن گه شاد و خندان با نظیری
نشستن عود در مجمر نهادن ۲۱

سبو بیار و پر از آب زندگانی کن
زجام می طلب و عمر جاودانی کن
نگفت جم به فریدون جز اینک ۲۲ جورمکن
جهان زتست دگر هرچه می توانی کن
نشاط طبع حکیمان علاج بیماریست
غم شکسته دلان دار و شادمانی کن

زسال خوردہ بکش سر۲۳ کہ ھست کارآموز
شراب کھنہ بچنگ آور و جوانی کن
شب از خرابہ شنیدم کہ باقدح می گفت
چو ماہ باش و بہ۲۴ خورشید ھم قرانی کن
تہی ز خویش شوی پر ز مہر سازندت
نظر بہ کاسہ مہ و دور آسمانی کن
پدر بشکّر و مادر بشیر پروردت
بہر دو شیر و شکر باش و کامرانی کن
سبیل حق شو و عالم سبیل خود گردان
کفیل شاہ شو و پادشہ نشانی کن
چو نام فرّخ خود باش در طریق سلیم
دگر چو نظم نظیری جہانستانی کن۲۵

حسن از خط شود قوی بازو
یار تو خط خوش است و چار ابرو
از نظر خط حجاب بر دارد
گرچہ از خط نقاب سازد مو
..... ز جوان کہ این مثلّث
..... تیر بہتر کہ پیر در پہلو
ہر کہ خود را کند بہ کعبہ نماز
من و محراب و آن خم ابرو
موسیٰ و طور و ما و کوچۂ یار
ہر کسی بر رھی کند تگ و پو

هم بت خانگی کہ دلبر غیب

هست در پود پود تو بر تو

مشہد غمزه زایرش کفار

کعبۂ چہره حاجبش هندو

قد بر افروختہ چو مشعل نار

مغ آتش پرست هر سرمو

در ہمہ شہر کافرستانی

کس ندید ست سرِّ آن کو

ملک ومال و خرد نظیری را

همہ یک سو وعشق او یک سو۲۷

چند بیخود روی بر خاک دری ساید کسی

جان دهد در انتظار و روی ننماید کسی

چند دل در رہگذار جسم وجاں نزدیک است

منتظر افتاده باید شد چہ فرماید کسی

اوّل عشق تو پند هیچکس نشنیده ام

این زمان گر جان دهم برمن نہ بخشاید کسی

دین بغارت داده ام بتخانۂ گبران کجاست

کز مسلمانان برویم دیده نگشاید کسی

چند در خونم کشی ای شوق کافر نیستم

صبر کن چندان کہ یک ساعت بیاساید کسی

گر نبا شد بند برپا زود رسوا می شویم

مہربان ما درین هنگامہ می باید کسی

می کند امروز یا فردا نظیری ترک تو

جان من تا چند از غیرت جگر خاید کسی ۲۸

آخر میں ڈاکٹر محمد محسن گورنمنٹ پوسٹ گریجیوٹ ویمنس کالج رام پور کا شکریہ ادا کروں گا جنھوں نے رامپور سے ان غزلوں کو نقل کر کے ارسال کیا ہے۔

حواشی

۱ وفات : ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء

۲ وفات : ۱۰۸۰ھ / ۷۰-۱۶۶۹ء

۳ ۳۴۳۴، ۳۴۳۷ رامپور رضا لائبریری

۴ ۳۴۳۴، ۳۴۳۷ نسخہ ھای خطی دیوان نظیری کتابخانہ رام پور

۵ ۳۴۳۷- صفا وفطرت

۶ ۳۴۳۴ بہ نزدیک

۷ ۳۴۳۴ - آب در ہوا

۸ دیوان خطی نظیری، ۳۴۳۴، ۳۴۳۷ رام پور رضا لائبریری

۹ ۳۴۳۴ - براہ

۱۰ ۳۴۳۴ برای لمتنی

۱۱ دیوان خطی نظیری، ۳۴۳۷ کتب خانۂ رضا رام پور

۱۲ دیوان خطی نظیری ۳۴۳۴ کتب خانۂ رضا رام پور

۱۳ ۳۴۳۴ - از آدزم

۱۴ ۳۴۳۴ - عالم معنی - غوطہ ہا

۱۵ ۳۴۳۴ - تجیاری

۱۶ ۳۴۳۷ - آن

۱۷ ۳۴۳۴ جوهرم - افتراں

۱۸ ۳۴۳۴ ۳۴۳۷ - رام پور رضالائبریری

۱۹ ۳۴۳۷ تجبرای موزہا

۲۰ ۳۴۳۷ زعفرانو

۲۱ نسخہ خطی دیوان نظیری شمارہ ۳۴۳۷

۲۲ ۳۴۳۷ اینکہ

۲۳ ۳۴۳۷ هر

۲۴ ۳۴۳۴ ۳۴۳۷ : با

۲۵ ۳۴۳۴، ۳۴۳۷، نسخہ خطی دیوانِ نظیری رام پور رضالائبریری۔

۲۶ مشید - قدیر - درهمہ یہ تینوں شعر حاشیہ میں ہیں۔

۲۷ نسخہ خفی - ۳۴۳۴۔

۲۸ نسخہ خطی دیوان نظیری شمارہ ۳۴۳۷ رام پور رضالائبریری۔

۵

شرح بحرالعلومی

پروفیسر سید امیر حسن عابدی
(دہلی یونیورسٹی)

جب میں ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ میں ایران گیا تو تہران یونیورسٹی میں پروفیسر فیروزانفر مرحوم کے کلاس میں شرکت کرتا تھا۔ وہ مثنوی مولانا روم کو پڑھاتے تھے۔ وہاں کے اساتذہ میں ڈاکٹر سید صادق گوھرین بھی تھے، جن کی کتاب ''فرہنگ لغات وتعبیرات مثنوی'' قابل قدر ہے۔

جب ۱۹۶۴ء میں World Congress of Oriental Studies میں شرکت کے لئے مرحوم فروز انفر صاحب تشریف لائے تھے تو انھیں شرح بحرالعلومی کی تلاش تھی۔

محمد تقی جعفری نے ''تفسیر ونقد وتحقیق مثنوی جلال الدین محمد مولوی'' ۱۵ جلدوں میں لکھی ہے جسے شرکت سہامی (؟) انتشار نے شایع کیا ہے۔ آپ ہندوستان تشریف لائے تھے، نیز دہلی یونیورسٹی میں آپ نے ایک لکچر دیا تھا۔ انقلاب اسلامی کے بعد کئی مرتبہ آپ سے ایران میں ملاقات بھی ہوئی تھی۔

مثنوی معنوی مولوی کے سلسلہ میں سب سے پہلے شیخ عبداللطیف عباسی گجراتی نے کام کیا ہے۔ انھوں نے ۸۰ نسخوں سے بھی زاید مخطوطات کی بنا پر ایک ''نسخۂ ناسخہ مثنویات سقیمہ'' تیار کیا تھا جو آج تک شایع نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے شرح اور

فرھنگ لغات بھی لکھی ہے۔[1]

بہر حال بے شمار علما نے مثنوی مولوی معنوی کی چھوٹی بڑی شرحیں لکھی ہیں جن میں سے شرح بحر العلوم[2] بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ چار دفتروں کی شرح ہے جو ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں نولکشور پریس میں چھپی تھی۔ اس کے مصنف ابن عربی کے مقلدوں میں سے تھے۔ ان کو ''شیخ اکبر'' اور قدوۃ محققان کہا ہے۔

حضرت بحر العلوم نے شارحین میں سے محمد رضا لاہوری، شیخ عبد اللطیف عباسی گجراتی، شیخ محب اللہ، شیخ افضل الہ آبادی، شاہ ولی محمد اکبر آبادی کا نام لیا ہے۔

یہاں ہم اس شرح کی نسبت سے چند مسائل کا ذکر کریں گے۔ سب سے اہم کام تو تصحیح متن کا ہے۔ میرے استاد مرحوم پروفیسر مجتبی مینوی نے فرمایا تھا کہ مثنوی کی پہلی ہی دو بیتیں عام اور مشہور متن سے مختلف اس طرح ہیں:

بشنو در نی چون حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند
از نیستان تا مرا ببریدہ اند
در نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

میرے دوست پروفیسر محمد استعلامی نے مثنوی کے دفتر اول کی شرح میں[3] پہلے دو شعر کو اس طرح نقل کیا ہے:

بشنو این نی چون حکایت می کند
از جدا ییہا شکایت می کند
کز نیستان تا مرا ببریدہ اند
در نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

شرح بحر العلومی میں حسب ذیل بیت کو الحاقی بتلایا گیا ہے:

عمر چون آب ست و وقت اورا چو جو
خلق باطن ریگ چوں عمر تو

علاوہ براین حسب ذیل ابیات کو بعض نے الحاقی اور بعض نے غیر الحاقی بتلایا ہے۔

آدم از فردوس و از بالای هفت

پاس ما ____ از برای عذر رفت

________ دوا را سرست

زانکه خاریدن فزونی کرست

حاجیان از صوفیا نند ای پسر

ساده و آزادهٔ افگند سر

شیخ افضل نے اس مصرع پر شک کیا ہے اور کہا ہے کہ غالباً یہ مصرع مولانا کا کہا ہوا نہیں ہے:

کرد رو اندر غزایش کا ہی[۴]

ایک شارح نے اس بیت کو الحاقی بتلایا ہے:[۵]

هر که از حسِ خدا دید آیتی

در برحق هست بهتر طاعتی

اس لئے کہ اگر یہ بیت نہ ہو تو ابیات زیادہ مربوط ہونگے!

ایک شارح نے اس بیت کو بھی الحاقی بتلایا ہے:

آینه کلی بر آوردم ز دود

دیدم اندر آینه نقش تو بود[۶]

مگر شیخ افضل نے کہا ہے کہ یہ شعر پرانے نسخوں میں نہیں ہے، اگرچہ شیخ عبداللطیف کے نسخۂ ناسخہ میں موجود ہے۔[۷]

ایک شارح نے اس بیت کو ملحقات میں شمار کیا ہے:

درد کی گیرد ____ من قرار

چون ضمیرت می کشد اورا بکار[۸]

ایک اور شارح نے اس بیت کو ملحقات میں شمار کیا ہے:

خانۂ ویران کار بی سامان شدہ
دل ز افغان ھمچو نی انبان شدہ [9]

بحر العلوم لکھتے ہیں کہ اس بیت ؎

بار تو باشد گراں در راہ چاہ
کج مروزورمست اندر شاھراہ

کے بعد ٦ بیتیں ایسی ہیں جو قدیم نسخوں میں نہیں ہیں، البتہ جدید نسخوں میں موجود ہیں جو عبداللطیف ''جامع ملحقات'' نے نقل کی ہیں۔[10]

شیخ عبداللطیف نے اس بیت کو اغلباً زاید بتلایا ہے:

ھست کین وحرص از طبایع مختلف
_____ کہ چار صد شد مکتنف

شارح نے حسب ذیل ابیات کی شرح میں حافظ [11] وغیرہ کے اشعار سے استفادہ کیا ہے:

بشنو از نی چون حکایت می کند
وز جدائیها شکایت می کند
کز نیستان تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

عارف جامی [12] معنی این دو بیت را بنظم آوردہ:

حبذا روزی کہ پیش از روز وشب
فارغ از اندوہ و آزار وطلب
متحد بودیم با شاہ وجود
حکم غیریت بکلی محو بود
بود اعیان جهان بی چند وچون
ز امتیاز علمی وغیبی _____
نی بر لوح علم مثال نقش ثبوت

نی زفیض خوان هست خوان قوت
نی ز حق ممتاز نی از یکدگر
غرق در دریای وحدت سر بسر
ناگہان در جنبشی آمد بحر جود
جملہ را در خود ز خود پیدا نمود
امتیاز علمی آمد درمیان
بی نشانی را نشانہا شد عیان
واجب و ممکن ز ہم ممتاز شد
رسم و آئین دوئی آغاز شد
بعد ازان یک موج دیگر زد محیط
سوی ساحل آمد ارواح بسیط
موج دیگر رو پدید آمد عیان
برزخ جامع میان جسم وجان
پیش آن کز زمرۂ اہل حق است
نام آن برزخ مثال مطلق است
موج دیگر باز درکار آمدہ
جسم وجسمانی پدیدار آمدہ
جسم ھم گشتہ است طوراً بعد طور
تا بنوع آخرش افتادہ دور
نوع آخر آدمست و آدمی
گشتہ محروم از مقام محرمی
بر مراتب سر بسر کردہ عبور
پایہ پایہ ز اصل خود افتادہ دور

چون نگردد زار مسکین زین سفر
نیست از وی هیچکس مهجور تر

نی که آغاز حکایت می کند
از جدائیها شکایت می کند

کز نیستانی کرد دور هر عدم
رنگ وحدت داشت یا نور قدم

تا ز تیغ فرقت می بریده اند
از نفیرم مرد و زن نالیده اند

کیست مرد اسمای خلاق ودود
کان بود فاعل در اطوار وجود

چیست زان اعیان جمله ممکنات
منفعل گشته ز اسما و صفات

چون همه اسماء اعیان بی قصور
دارد اندر رتبۂ انسان ظهور

جمله را در ضمن انسان ناله هاست
که چرا هریک ز وصل خود جداست ۱

شد گریبان گیر شان حبّ الوطن
این بود سرّ نفیر مرد وزن

والله در هذا معارف الجامی، آنچ حاصل بیتین بیان فرمود۔ زبان برآن ______ نیست و ما این را اصل گردانیده شرح ابیات مناسب آن خواهم کرد۔ ۱۳

بد ز گستاخی کسوف آفتاب
شد عزازیلی ز جرأت رد باب

... مثل این حافظ شیرازی می فرماید:

گناه می کنی و بر زمین نمی دانی

که ماه بر فلک از شومی گناه می گیرد[14]

چون بنالد زار بی شکر وگله

افتد اندر هفت گردون غلغله

''وباین نالہ اشارت ست درقول حافظ شیرازی:

گفتمش در عین وصل این ناله وفریاد چیست

گفت مارا جلوهٔ معشوق درین کار داشت[15]

پیر ایشانند کاین عالم بنود

جال ایشاں بود در دریای جود

کی شرح میں شارح نے حافظؔ کے یہ اشعار نقل کئے ہیں:

مشکل خویش بر پیر مغان بردم دوش

کو بتائید نظر حلِ معما می کرد

گفتم این جام جہاں بین بتو کی داد حکیم

گفت آں روز کہ این گنبد مینا می کرد

حسب ذیل ابیات:

جز مگر پیری کہ از حق مست است

در درون او حیات طیب است[16]

پس کریم آنست کز خود را دہد

آب حیوان کہ ماندتا ابد[17]

گوید از جام لطیف آشام من

یار روزم تا نماز شام من[18]

خانۂ غم بین زغم ژولیدہ شد

بیکناس از توبدای روئیدہ شد[19]

ایہا العشاق الستیا لکم
الختم الباخون والبقیا لکم ۲۰؎

کی شرح میں حافظ کے اس شعر کو نقل کیا گیا ہے:

ھرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

حسب ذیل ابیات: ۲۱؎

جسم دریا دیگر است وکف دگر
کف بہل از دیدہ و دریا نگر

کی شرح میں حافظ کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را

حسب ذیل ابیات:

______ چوں گیا اندر زمین
سر بجنبانی بیادی بی یقین ۲۲؎

کی شرح میں حافظ کا یہ شعر نقل کیا گیا ہے ؎

در طریقت ہر چہ پیش سالک آید خیر اوست
در صراط مستقیم ای دل کسی گمراہ نیست

سنائی ۲۳؎ کی بزرگی کو تو مولانا نے تسلیم ہی کیا ہے:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پی سنائی و عطار آمدیم

نیز ان کی طرف ان ابیات میں اشارہ کیا گیا ہے:

بشو الفاظ حکیم پردہ اند سر ہم ہمان جائے کہ بادہ خوردہ اند
''شیخ افضل گفتہ مراد حکیم سنائی است و بیت حکیم سنائی این است

بر مدار از مقام ھستی بی

سر ھماں جابنہ کہ خود ______

ایک جگہ مولانا فرماتے ہیں:

آنچنان گوید حکیم غزنوی

در الٰہی نام گر خویش بشنوی

اور سنائی کی بیت یہ ہے:

تو فضول از میاں بیروں برو

گوش خر درخواست یا سرخرو

مولانا کی اس بیت ؎

خوش بیاں کرد آں حکیم غزنوی

بہر محجوبان مثال معنوی

کے بعد شارح نے سنائی کے اس شعر کو نقل کیا ہے:

عجب نبود کہ از قرآن نصیبی نیست جز نقش

کہ از خورشید جز گرمی نیاید مرد نابینا

مولانا نے قصوں کے سلسلہ میں کلیلہ و دمنہ کے قصوں کو شامل کیا ہے۔ خود کہتے ہیں:

از حکیم باز جو این قصہ را

واندراں قصہ طلب کن حصہ را

یہاں ایک قصہ کا صرف عنوان دیا جا رہا ہے:

''حکایت خرگوشان کہ خرگوش را برسالت پیش فیل فرستادند کہ بگو کہ من رسول ماہِ آسمانم در پیش تو کہ ازیں چشمۂ آب حذر کن، چنانچہ در کتاب کلیلہ آمدہ۔ ۲۵؎

حواشی

۱ ملاحظہ ہو میرا مقالہ ''لطایف اللغات'' غالب نامہ ۲۰۰۲ء

۲ عبدل العلی محمد بن نظام الدین بحر العلوم لکھنوی

۳ مولانا جلال الدین محمد بلخی، مثنوی، دکتر محمد استعلامی، کتابفروشی افرازی؟ ۱۳۷۲ش

۴ ص:۳۵۲

۵ دفتر دوم۔ ص:۱۳

۶ دفتر دوم۔ ص:۱۹

۷ دفتر دوم۔ ص:۱۹

۸ دفتر دوم۔ ص:۱۲۳

۹ دفتر دوم۔ ص:۱۴۹

۱۰ دفتر دوم۔ ص:۱۵۶

۱۱ وفات: ۷۹۱ہجری / ۱۳۹۸عیسوی

۱۲ وفات : ۸۹۸ہجری / ۱۴۹۳عیسوی

۱۳ ص : ۵ - ۷

۱۴ ا۔ص : ۲۲

۱۵ ۲۔ص : ۱۶۲

۱۶ دوم

۱۷ سوم

۱۸ سوم، ۳۱۳

۱۹ چہارم، ۳۳

۲۰ دفتر چہارم، ص:۶۰

۲۱ دفتر سوم، ص:۷۲

۲۲ سوم، ۷۲

۲۳ وفات : ۵۴۵ہجری / ۱۱۵۰عیسوی

۲۴ دفتر سوم ، ص:۱۷۵

۲۵ ص: ۳۳

۲۶ دفتر سوم،ص:۱۷۵

٦

محبت ہی تصوّف ہے

-ڈاکٹر شریف حسین قاسمی
(دہلی یونیورسٹی)

حضرت شیخ مخدوم علی ھجویری معروف بہ داتا گنج بخشی نے تصوف کے مختلف امور پر اپنی بنیادی کتاب کشف المحجوب میں تصوف کے بارے میں مختلف عرفا کے عقاید ونظریات سے بحث کی ہے۔اس میں ایک باب عشق ومحبت کے بارے میں بھی موجود ہے۔تصوف کی جوتوجیہات اورتعریفیں اس کتاب میں نظر آتی ہین ان کا اگر خلاصہ کیا جائے تو اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہیں کہ محبت ہی تصوف ہے!۔ کس سے محبت؟ محبت خالقِ کائنات سے،محبت اس کی مخلوق سے، (انسان دوستی اس کا ایک حصہ ہے) اور یہی اصل تصوف ہے۔تصوف کے بارے میں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔صوفیا کے تذکرے،عرفا کے ملفوظات،عرفان پر نظریاتی مباحث اوراس کا عملی پہلو۔ان تمام امور پر اہم کتابیں محفوظ ہیں۔ان کا مطالعہ کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ ہمارے عرفا نے اس کائنات کے خالق سے ٹوٹ کے محبت کی۔اس کے عرفان کے لیے،اس تک پہنچنے کے لیے ہر وہ طریقہ اپنایا جس کی شریعت نے کسی نہ کسی انداز سے اجازت دی ہے،اسی طرح ہمارے صوفیا نے خدا کی مخلوق سے بھی والہانہ محبت کی اوراسے عرفان الٰہی کے لیےایک بنیادی ذریعہ سمجھا۔

عرفا نے خدا کو اپنی طرف متوجہ کرنے، اس کے بارے میں جاننے اوراس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جس جس انداز اورطریقوں سے اس کی عبادت اورریاضت کی ہے، وہ خدا سے ان کی بے پناہ محبت کا بیّن ثبوت ہے۔نمازیں پڑھنا، وظائف پڑھنا،

روزے رکھنا، کلام اللہ کی تلاوت کرنا، یہ سب ان کے معمولات میں شامل تھا۔ ان کاموں اور عبادتوں میں ان کا غلو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ یہ تو عام رعیت کی عبادات ہیں جو صوفیا کی زندگی کا معمول رہی ہیں۔ خدا تک رسائی کے لیے بعض عرفا نے ایسی عبادتیں بھی کی ہیں جن کی مشکل ہی سے مثال ملتی ہے۔

ایک بار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنے مرید و خلیفہ فرید الدین گنج شکر کو چلۂ معکوس کا حکم دیا۔ یہ نہایت مشکل عبادت اور انوکھا مجاہدہ ہے۔ یہ سن کر بابا فرید نے خود کو اس مجاھدے کے لیے تیار کیا، لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ چلۂ معکوس ہوتا کیا ہے۔ آپ شیخ بدرالدین غزنوی کے پاس گئے اور کہا کہ حضرت مرشد نے مجھے چلۂ معکوس کا حکم دیا ہے، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں، چنانچہ شیخ بدرالدین غزنوی نے حضرت شیخ قطب الدین بختیار کاکی سے چلۂ معکوس کی کیفیت پوچھی۔ شیخ نے جواب دیا کہ چلۂ معکوس یہ ہے کہ چالیس روز یا چالیس راتیں پاؤں میں رسّی باندھ کر اور کنویں میں الٹا لٹک کر خدائے تعالیٰ کی عبادت کرے۔ حضرت بابا نے اُچھ کی مسجدِ حاج میں وہاں کے موذن خواجہ رشید الدین مینائی کی مدد سے یہ عبادت بھی انجام دی۔[۲]

نمازِ معکوس کے بارے میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا فرماتے تھے کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر (جو ایران کے ایک معروف صوفی ہیں) کہا کرتے تھے کہ مجھے جو کچھ حضرت مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم وآلہ سے پہنچا ہے، میں نے وہی کیا ہے۔ یہاں تک کہ جب مجھے معلوم ہوا کہ ایک وقت رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے نمازِ معکوس بھی پڑھی تھی تو میں بھی گیا اور اپنے پاؤں کو رسّی میں باندھ کر اور کنویں میں سرنگوں ہوکر، نمازِ معکوس ادا کی۔[۳]

یہاں یہ عرض کر دیا جائے کہ شیخ ابوسعید ابوالخیر ہندوستانی مشائخِ چشت میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں اور ان کی تعلیمات کا اثر چشتی دبستانِ تصوف پر بڑا گہرا رہا ہے۔

خدا سے انتہائی محبت اور اس کی یاد میں استغراق کا ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ خواجہ

نظام الدین اولیا فرماتے تھے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ذکر الٰہی میں مشغولیت کی جو علامت ظاہر ہوئی وہ یہ تھی کہ آپ نے سونا چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ آپ کبھی بھی بستر نہ بچھاتے تھے۔ ابتدائی زمانے میں جب نیند زیادہ غالب آجاتی تو کچھ دیر سو رہتے تھے، لیکن آخر میں نیند بھی بیداری سے بدل گئی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں ذرا سی دیر بھی سو لیتا ہوں تو تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ شغل حق کا ذوق اس حد تک پہنچ چکا تھا اور استغراق کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی آپ کی زیارت کے لیے آتا تو اس کو دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا یہاں تک کہ آپ ہوش میں آتے، آنے والے سے گفتگو کرتے، پھر معذرت کر کے اسے رخصت کردیتے اور دوبارہ ذکرِ حق میں مشغول ہوجاتے تھے۔[۴]

حضرت محبوب الٰہی نے اسی استغراق کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے کہ خواجہ بختیار کاکی کا ایک چھوٹا لڑکا تھا اس کا انتقال ہوگیا۔ لوگ اسے دفن کرنے کے بعد آپ کی خدمت میں واپس آئے تو بچے کی والدہ کے رونے کی آواز حضرت خواجہ کے کانوں میں پڑی۔ آپ نے دریافت کیا کہ یہ رونے کی آواز کیسی ہے۔ آپ کو بچے کی وفات کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے اظہارِ افسوس کیا۔ آپ سے پوچھا گیا کہ یہ افسوس کیسا؟ آپ نے جواب دیا کہ مجھے اب یاد آتا ہے کہ میں نے کیوں اس بچے کی بقا کے لیے خدا سے التجا نہیں کی۔ اگر میں التجا کرتا تو ضرور اپنی مراد پالیتا[۵]۔ یہ تھا خدا کی یاد میں استغراق کا عالم۔ بیٹے کی زندگی اور موت کی بھی خبر نہ تھی۔

خدا سے اس نوعیت کی محبت، اس کا عرفان حاصل کرنے کے لیے عبادات، ریاضات اور مجاہدے، ان کا اثر خود صوفی پر کیا ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی پر ایک مجلس سماع میں اس شعر پر وجد طاری ہوا:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانی دیگر است

اسی تحیّر و وجد کے عالم میں آپ کو خانقاہ سے گھر لایا گیا۔ آپ چار روز و شب اسی عالم میں رہے اور پانچویں شب میں آپ نے رحلت کی۔ رحلت سے قبل آپ کو ایک حاذق

طبیب کو جس کا لقب شمس الدین تھا، دکھایا گیا۔ طبیب نے آپ کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ علالت اُس مرد کی ہے جس نے اپنے آپ کو آتش محبت میں جلالیا ہے اور جس کا جگر پگھل گیا ہے[6]۔ یہ ہوتا ہے سچی محبت کا اثر محبّ صادق پر۔

مشائخ نے جس طرح خالق کائنات سے ٹوٹ کر محبت کی اسی انداز سے انہوں نے خدا کی مخلوق کے ساتھ بھی شدید محبت کا برتاؤ کیا۔ خدا کی مخلوق میں اسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے، صوفیاے کرام نے انسانوں سے دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ رنگ، نسل، مذہب اور دیگر امتیازات کو نظر انداز کیا اور تمام انسانوں سے محبت کی، ان کی بہبودی کے لیے پیہم جستجو کی، ان کا دل رکھنے کے لیے خود بہت کچھ برداشت کیا۔ دوسروں کو اطمینان حاصل ہو، ان کا دل نہ دکھے، وہ خوش رہیں، اسی کو حج اکبر سمجھا:

دل بہ دست آور کہ حج اکبر است

صوفیاے کرام کی زندگی اور تعلیمات پر نگاہ ڈالیے تو ایسے بے شمار واقعات نظر آتے ہیں جن سے ان مشائخ کی انسان دوستی کا ثبوت ملتا ہے۔ واقعات اس حقیقت کی نشاندھی کرتے ہیں کہ صوفیا نے سماج میں ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں تمام انسان بلا امتیاز مذہب وملت، صلح وآشتی سے زندگی بسر کرسکیں۔ سعدی نے اس کی بڑی حقیقت افروز توضیح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بنی آدم اعضای یک دیگرند   کہ در آفرینش زیک گوھرند
چو عضوی بدرد آورد روزگار   دگر عضو ھا را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی   نشاید کہ نامت نہند آدمی [7]

| یہ آدم کی اولاد، انسانی جسم کے مختلف اعضا اور حصوں کی مانند ہیں۔ ان کی پیدائش بھی ایک ہی انداز سے عمل میں آئی ہے، جس طرح جسم کا ایک عضو اگر تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرے حصے، جنہیں بہ ظاہر کوئی بیماری لاحق نہیں ہوتی، درد محسوس کرتے ہیں۔ اے انسان! اگر تو دوسروں کی تکلیف سے لا پرواہ ہے، دوسروں کے غم تجھے غمگین نہیں کرتے، تو مناسب نہیں کہ تجھے آدمی اور

انسان کہا جائے]

یہ ہے انسان دوستی کہ جس کی تبلیغ کی ہے صوفیاے کرام نے۔

اس سلسلے میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا ایک بیان نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے ایک بار عبادت کی دو قسموں کا ذکر کیا۔ ایک لازمی عبادت اور دوسری متعدی عبادت۔ لازمی عبادت نماز ہے، روزہ ہے، زکوٰۃ وغیرہ ہے۔ جو یہ عبادتیں کرتا ہے اسی کو اس کا ثواب ملتا ہے۔ اس کے برخلاف متعدی عبادت خدمتِ خلق ہے۔ اس کا ثواب تو ملتا ہی ہے لیکن دوسروں کو بھی اس سے فائدہ ہوتا ہے اور اس کا ثواب زیادہ ہے۔

خدمتِ خلق کا یہی تصور تھا کہ جس کی وجہ سے ایران میں پانچویں صدی ہجری کے ایک معروف صوفی ابوالحسن خرقانی نے اپنی خانقاہ کے دروازہ پر لکھوا دیا تھا کہ: ''ھر کہ دراین سرا درآید، نانش دھید و از ایمانش پرسید، چہ آن کس کہ بہ درگاہِ باری تعالیٰ بہ جان ارزد، البتہ برخوانِ بوالحسن بہ نان ارزد۹ [اس سرائے کے دروازے پر جو بھی آئے، اس کے مذہب کے بارے میں دریافت کیے بغیر اسے کھانا پیش کیا جائے، اس لیے کہ جو باری تعالیٰ کی نظر میں اس لائق ہے کہ اسے زندگی عطا کی جائے، وہ البتہ ابوالحسن کے دسترخوان پر کھانے کا مستحق ہے] قرآن کریم میں خدا کے اس حکم ''لا اکراہ فی الدین'' [دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں] اور ''لکم دینکم ولیَ دین'' [تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین] کی عملی صراحت اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مشائخ نے دوسرے مشائخ کی تصانیف اور ان کی تعلیمات پر نگاہ رکھی ہے، ان کا مطالعہ کیا ہے اور بہ وقت ضرورت ان سے نقل واقتباس بھی کیا ہے۔ ابوالحسن خرقانی کا جو قول ابھی نقل کیا ہے، اسے ذہن میں رکھیے اور پھر آٹھویں صدی ہجری کے شیخ جمال الدین احمد کھٹو کے اِس ارشاد عالی کا کو دھرائیے کہ: زنہار طعام از گبر و مسلمان دریغ مدارید و در ایثار آن تا توانید دست باز نکشید و خلق را محفوظ دارید۱۰۔ [وہ غیر ہو یا مسلمان، انہیں کھانا کھلانے سے کبھی دریغ نہ کریں اور جہاں تک ہو سکے مذہب کا خیال کیے بغیر، سب کو کھانا پیش کرنے میں ہاتھ نہ روکیں اور مخلوقِ خدا کی حفاظت کریں]

شیخ جمال الدین احمد کھٹو بابا اسحاق مغربی کے خلیفۂ ارشد اور گجرات کے معروف عارف ہیں جن کے احوال اور تعلیمات مرقات الوصول میں محفوظ ہیں۔

جس کا خمیر ہی محبت سے اٹھا ہو، جو سرتاپا محبت ہو، اس سے درشتی اور غیظ وغضب کوسوں دور ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کی سختی اور حتی بے ادبی کا بھی محبت وشفقت سے جواب دیتا ہے۔ انہی شیخ جمال الدین احمد کھٹو نے ایک بار فرمایا کہ میں نے قدیم مشائخ کے بارے میں یہ حکایت پڑھی ہے کہ ان کے ہمسایہ میں ایک ناجنس رہتا تھا۔ اس نے کبوتر پال رکھے تھے جو اُس دیوار پر بیٹھتے تھے جو خود شیخ صاحب اور اس کے گھر کے درمیان واقع تھی۔ جب وہ کبوتر اڑانا چاہتا تھا تو دیوار پر بیٹھے کبوتر پر پتھر مارتا اور وہ پتھر خانقاہ کے صحن میں آگرتا تھا، خانقاہ میں موجود درویشوں کو اس پتھر سے چوٹ لگتی اس لیے وہ اس صورت حال سے پریشان اور دکھی تھے۔ ایک روز اس نے پتھر اٹھایا اور کبوتروں پر مارا۔ وہ پتھر شیخ صاحب کے سر پر لگا اور ان کا سر پھوٹ گیا۔ مریدوں نے خیال کیا کہ اب ہمارے شیخ اس کبوتر باز کے حق میں بددعا کریں گے اور یا حاکم وقت سے اس کی شکایت کریں گے۔ اسی اثنا میں انھوں نے ایک درویش کو بلایا، اسے چند دام دیے اور کہا: جاؤ بازار سے ایک لمبا بانس خرید لاؤ۔ وہ بانس لے آیا۔ آپ نے پھر فرمایا: اب یہ بانس ہمسایہ کو لے جا کر دید و اور کہو کہ آئندہ سے وہ اس بانس سے کبوتر اڑائے۔ درویش ہمسایے کے پاس وہ بانس لے گیا اور جو کچھ شیخ صاحب نے فرمایا تھا وہ اس کے سامنے دھرا دیا۔ وہ کبوتر باز ہمسایہ اپنی نازیبا حرکت پر شرمندہ ہوا، توبہ کی اور شیخ صاحب کے مخلص مریدوں میں شامل ہو گیا۔[11]

صوفیاے کرام کی نگاہ میں خدمت خلق اور انسان دوستی کا کیا درجہ تھا، اس کے بارے میں ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ یہ گجرات ہی سے متعلق ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے ایک بار ایک درویش کے بارے میں فرمایا کہ وہ گجرات گیا تھا۔ اس نے یہ حکایت بیان کی:

''میں جب گجرات میں تھا تو وہاں میں نے ایک واصل باللہ اور صاحب کشف دیوانے کو دیکھا۔ وہ دیوانہ اور میں، ایک ہی گھر میں مقیم تھے اور ایک ہی کمرے میں سوتے

تھے۔ ایک بار میں حوض پر گیا جس کی حفاظت کی جاتی تھی۔ کسی کو اجازت نہیں تھی کہ وہ اس میں پیر ڈال سکے۔ حوض پر متعین نگہباں سے میری دوستی تھی۔ اس نے مجھے اجازت دے دی کہ میں وضو کرلوں۔ وہاں کچھ عورتیں آگئیں۔ وہ مٹکوں میں پانی بھر کر لے جانا چاہتی تھیں، لیکن چوکیدار نے انہیں اجازت نہیں دی۔ ایک بوڑھی عورت نے درویش سے کہا کہ وہ اس کا مٹکا پانی سے بھر دے۔ درویش نے مٹکا بھر دیا۔ اور اس طرح دوسری عورتوں کے مٹکے بھی اس درویش نے پانی سے بھر دیے۔ وہ چلی گئیں۔ درویش وضو کرنے کے بعد اپنی قیام گاہ پر لوٹ آیا۔ نماز کا وقت تھا۔ اس نے بہ آواز بلند تکبیر کہی۔ دیوانہ، جو سو رہا تھا، تکبیر کی آواز سے بیدار ہوگیا اور درویش سے کہا۔ یہ کیا شور مچا رکھا ہے؟ کام تو وہی تھا کہ جو تو نے ان عورتوں کے مٹکے پانی سے بھرے تھے۔'' ١٢ یعنی دوسروں کے کام آنا، مخلوقِ خدا کی دستگیری کرنا، عبادت سے کم نہیں۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے یہ واقعہ ٧١٤ھ میں بیان کیا تھا جب گجرات پر خلجی بادشاہوں کی حکومت تھی۔

یہ اور ایسے ہی دیگر بے شمار واقعات اور حکایات تصوف سے متعلق کتابوں میں نظر آتے ہیں جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا سے سچی محبت کے بغیر عبادت بے معنی ہے اور خدا کی مخلوق سے پرخلوص محبت بغیر تصوف ادھوری ہے۔

حواشی

(١) دیکھیے: کشف المحجوب: شیخ علی ہجویری، اردو ترجمہ وقار علی بن مختار علی، مکتبہ تھانوی، دیوبند، یوپی، ص: ٣٥، ٣٧٣۔

(٢) سیر الاولیا: امیر خورد کرمانی، اردو ترجمہ اعجاز الحق قدوسی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ١٩٨٠، ص: ١٦١۔

(٣) ایضاً، ص: ١٦٢۔

(٤) ایضاً، ص: ١٣٣۔

(۵) ایضاً،ص:۱۳۳

(۶) سیر الاولیا،ص:۱۴۳

(۸) یہ اشعار سعدی کی گلستان سے ماخوذ ہیں۔

(۹) نور العلوم: شیخ ابوالحسن خرقانی، از انتشارات کتابخانہ بہجت، طہران ۱۳۶۳،ص:۴

(۱۰) ثمرات القدس من شجرات الانس: میرزا لعل بیگ لعلی بدخشی، تہران ۱۳۷۶، ص:۸۸۰۔

(۱۱) ایضاً،ص:۹۸۳

(۱۲) فوائد الفواد؛ حسن سجزی، تہران ۱۳۷۷،ص:۲۰۹۔

۷

اقبال اور تصوف کا دوسرا رخ

- ڈاکٹر عبدالحق
(دہلی یونیورسٹی)

تصوف دنیائے دانش کا دلچسپ موضوعِ سخن ہے۔ مگر اسے مقبولیت کے قرار تک بلندی بخشنے میں اسے تلازمۂ شعر کے لئے ضروری گردانا گیا۔ شعرگوئی کے لئے خوب بتایا گیا۔ جس کے نتیجے میں ذکر وفکر سے دور کا بھی تعلق نہ رکھنے والے فن کاروں نے اسے خوب برتا۔ شعری اظہار میں رمز وایما کے ساتھ ابہام وایہام کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ برہنہ گفتاری، کمال گویائی کی منہاج نہیں ہے۔ انتہائی ذہن کی کج ادائی تخلیق میں شاید سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ تحریر میں متعین مفاہیم کے ساتھ دوسرے تصورات کا جہانِ معنی پنہاں ہوتا ہے۔ جو قاری کے بہ قدر ظرف ہاتھ آتا ہے۔ حقیقت بے مجاز اور مجاز میں حقیقت کی تصویر فروزاں ہوتی ہے۔ تصوف کی اس تعلیم میں بڑی دِل کشی تھی۔ اقبال جیسا مفکر شاعر بھی مدتوں اس کے دامن سحر سے دست بردار نہ ہوسکا۔ وہ عالم خودی کی طرح ان تصورات کے حصار میں گرفتار رہے۔

حُسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچہ میں وہ چٹک ہے
کثرت میں ہوگیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
(جگنو)

ان تاثرات کے اسباب کی نشاندہی یہاں بے محل ہے۔ دانشِ فرنگ کے مطالعہ نے اقبال کے وجودی تصورات میں تبدیلی پیدا کی۔ جو بعد ازاں احتجاج اور بیزاری میں بدلنے لگی۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ مخالفت میں وہ شدت پیدا ہوئی جن کی تمثیل مشکل سے ہی ملے گی۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

(تصوف)

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد
مجاہدانہ حرارت نہ رہی صوفی میں
بہانہ بے عملی کا ہے شراب الست

(ہندی اسلام)

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

(ساقی نامہ)

یہ اشعار ضرب کلیم کے ہیں جو آخری دور کا کلام ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقبال آخری دور میں صوفی ہوگئے تھے۔ آپ کے استصواب کے لئے یہ اشعار پیش کئے گئے۔ یورپ میں تحقیقی مقالے کی تیاری میں کئی ایسے مقام بھی آئے جنہوں نے درِ دل کو کشادگی بخشی۔ فکر اقبال کے دو عناصر ایسے ہیں جو وارفتگی کی حد تک اقبال کو عزیز تھے۔ مگر اسی مختصر قیام نے ان سے نفرت پیدا کر دی کہ وہ پایانِ عمر تک ان کی مخالفت کرتے رہے اور ان کے ساتھ ہر طرح کی مفاہمت سے گریز کیا۔ جغرافیائی نظریۂ قومیت اور وجودیت کی تنقیص میں شاید ہی کوئی دوسرا اقبال کا حریف بن سکے۔

کسی بھی حرکی نظریۂ حیات کے مبلغ کے لئے صوفیانہ قیل وقال قابل قبول نہیں

ہو سکتے۔ وحدت و کثرت یا وجود و موجود کے دل فریب تصورات نے تفکر اور توہم کی ایک دنیا آباد کی ہے۔ جن سے شریعت گریباں گیر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے شریعت نے ہر دور میں ان کی ضرورت رسانی سے معاشرہ کو محفوظ رکھنے کی تاکید کی ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلام میں یہ اجنبی پودا ہے جس نے یونانی، عجمی اور ہندی تصورات کے بطن سے جنم لیا ہے اور قوائے عمل کو شل کیا ہے۔ اقبال نے کم سے کم دس خطوں میں ان نظریات کی مخالفت کی ہے۔ جن کے مندرجات کا ماحصل یہ ہے کہ تصوف یونان و عجم اور ہند کا زائیدہ ہے، اسلام سے مغائرت رکھتا ہے۔ ایرانی شعرا نے اسے طرح طرح سے بیان کر کے مقبول بنایا۔ یہ تمام دور انحطاط کا مرہون منت ہے۔ مذہب کا مقصد عمل ہے۔ ترک عمل نہیں۔ اسلام کے روشن ترین تصور توحید کے بعد ہمہ اوست کی ضرورت نہیں ہے۔ اقبال کے مضامین بھی بڑی مقبولیت رکھتے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اور پھر ان کی ناتمام کتاب ''تاریخ تصوف'' جسے پروفیسر صابر کلوروی نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ انہیں خیالات کی حامل ہے۔ ان کے علاوہ اشعار میں جگہ جگہ ان مباحث پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔

اولین شعری مجموعے 'اسرارِ خودی' میں اقبال نے خواجہ حافظ کے حوالے سے تصوف پر تنقید شروع کی۔

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار — جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

نغمۂ چنگش دلیل انحطاط — ہاتِف او جبرئیل انحطاط

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر — الحذر از گوسفنداں الحذر

اس کے بعد

راہبِ اول فلاطونِ حکیم — از گروہِ گوسفندان قدیم

گوسفندِ در لباس آدم است — حکم او بر جانِ صوفی محکم است

گوسفندی کا بنیاد گزار افلاطون ہے۔ جس نے عینیت (سکونی تصوریت) کی بنیاد رکھی۔ اس نے عالم امکاں سے الگ عالم اعیان کی تخلیق کی اور عالم امکان کے برعکس عالمِ اعیان کی وکالت کی۔ جس کی رو سے یہ مادی کائنات اور اس کی ہر شے بعینیہ علمِ خداوندی میں

ہے۔ جسے صورِ مجردۂ علمیہ کہتے ہیں۔ وہی صورِ علمیہ، یعنی اعیان اس عالم آب وگل میں محسوسات اور مادے کی صورتوں میں دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ یہ اصل نہیں بلکہ عکس ہیں۔گمانِ حقیقت کی مظہراور نظر فریب ہیں۔فنا پذیری ان کا مقدر ہے، یہ ابدیت سے محروم نقش ناتمام ہیں۔ اور صورِ علمیہ کے سبب شہود میں آئے ہیں.... گویا استقرار سے عاری ہیں۔غرض یہ وہ مباحث ہیں جن سے صوفیا اور شعرا نے بڑی موشگافیاں پیدا کیں۔ اقبال خودی کے علم بردار تھے جس کی اساس اثبات و استقرار ذات کے ساتھ جہد وعمل پر قائم ہے۔اپنے وجود کے ساتھ عالمِ موجودات کے مناظر ومظاہر کے استحضار کا یقین واعتماد ہی خودی کے انتظام کا ضامن ہے۔یہی حقیقت ہے اور وہم گماں سے ماورا۔ ہر ذرۂ کائنات کی طرح تارِنفس بھی لمحہ آگہی کا احساس دلاتا ہے۔

من از بود و نبود خود خموشم
اگر گویم کہ ہستم، خود پرستم
ولیکن این نوائے سادہ گیہا
کہ در سینہ می گوید کہ ہستم

اسرار کے ابتدائی اشعار اور پیش گفتار کے مندرجات کی اشاعت پر بعض نام نہاد اور کم نظری کے شکار متصوفین اقبال کے خلاف صف آرا ہوگئے۔مسائل کی موشگافیوں نے بڑی مکروہ صورت اختیار کی۔اقبال بھی مطالعہ وفکر کی پوری تاب کاری کے ساتھ میدان میں اترے۔اور اپنے موقف اعتراضات کی دِفاع میں فروگذاشت کا کوئی موقع فراہم نہ ہونے دیا۔مولانا اسلم جیراجپوری کے نام خط کی ایک عبارت ملاحظہ ہو۔

”..... تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرنِ اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے“۔(اقبال نامہ حصہ اول)

نیاز الدین خاں کے نام مکتوب کی مختصر عبارت ملاحظہ ہو:

''تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے نہایت قابل قدر ہے۔ کیوں کہ اس کے پڑھنے سے طبعیت پر سوز و گداز کی حالت طاری ہوتی ہے۔ فلسفہ کا حصہ محض بے کار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں قرآن کے مخالف۔ اس فلسفے نے متاخرین صوفیہ کی توجہ صور و اشکالِ غیبی کے مشاہدہ کی طرف کردی''۔

اقبال اپنے معروضات کو کتابی شکل میں بہ صراحت بیان کرنا چاہتے تھے جو نہ ہوسکا۔ تاریخ تصوف لکھنی شروع کی تھی، کچھ ابواب مکمل ہوگئے تھے، مگر کتاب کی تکمیل نہ ہوسکی۔ اس میں ''تصوف اور اسلام'' کے بارے میں کچھ حوالے بھی موجود ہیں۔ خاص طور پر موازنے کے نوٹس خاص اہمیت رکھتے ہیں جس میں اسلام کے اقوال اور صوفیا کے اقوال میں تضاد وتخالف کا ذکر ہے۔

باب تصوف اور شاعری کے متلق فارسی کے 34 اشعار محفوظ کئے گئے ہیں۔ جن میں شعائر اسلام کی تردید وتنسیخ کا پہلو غالب ہے۔ اس سے اقبال کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ عجمی شاعری نے مسلم معاشرے میں مکروہ تصورات کو دبے پاؤں داخل کیا۔ جس نے نظریۂ حیات کو نقصان پہنچایا۔ ایرانی ذہن کی ثنویت یہاں بھی رنگ لائی۔

مطالعۂ اقبال میں قرآن ہی اصل الاصول ہے۔ باقی فروعات وتادیلات کا دفتر بے معنی۔ اس صحفِ سماوی سے تصادم یا مغائرت رکھنے والے ہر تعلیم کی انہوں نے نفی کی ہے۔ عظمتِ آدم کی برگزیدگی کا جو تصور قران دیتا ہے وہ بے عدیل و بے نظیر ہے۔ نظریۂ اسرارِ خودی اسی کے فیض سے تابندہ وتاب دار ہے۔ اس پر ضرب لگانے والے ہر فلسفے کو اقبال نے ناپسند کیا ہے۔ نفی ذات اور قطرہ ودریا کے صوفیانہ خیالات بھی ان کی فکر کے منافی ہیں۔ اسی میزان پر خواجہ حسن نظامی کو اقبال نے لایقِ اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

''بہر حال وہ معذور ہیں۔ صوفی ضرور ہیں مگر تصوف کی تاریخ وادبیات وعلوم القرآن سے مطلق واقفیت نہیں رکھتے۔ اس واسطے مجھے ان کے مضامین کا مطلق

اندیشہ نہیں ہے''۔

اقبال کی شکایت ہے کہ کم نظر صوفیا نے تصوف کے اعلیٰ اقدار کو جس طرح پامال کیا ہے وہ بہت ہی اندوہ ناک ہے۔ وہ اخلاقی اور عملی پہلوؤں کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ مستیِ احوال کو مذموم اور مستیِ کردار کو بنی نوع بشر کی منہاج قرار دیتے رہے۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال
ملاّ کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

سُکر کی لذت ہی میں نقدِ حیات کا گنوا دینا اقبال کو ہرگز گوارا نہیں ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ ۱۹۳۶ء کی یادگار ہے۔ پہلا شعرا اپنے آقا ابلیس سے ہم کلام ہے۔

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی وملا ملوکیّت کے بندے ہیں تمام
طبعِ مشرق کے لئے موزوں یہی انمول تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علمِ کلام

اُس آقا کا آخری ارشاد بھی ملاحظہ ہو۔ شرارِ آرزو سے خالی اور حاملِ قرآن کے حق میں یہی بہتر ہے کہ وہ ذات وصفات، محروم الیقین، مجاہد وہ حارث وقدیم جیسے ابیات کے مرتے ہوئے لات ومنات میں الجھا رہے۔

ہے یہی بہتر الاہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے بری، یا عینِ ذات
تم اسے بے گانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر

جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے

پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

فکر و نظر کے حامل اشعار کے حوالوں سے ان خیالات کی تردید ہو جاتی ہے۔ جن میں گلشنِ رازِ جدید یا فارسی کے دوسرے اشعار کی مدد سے یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اقبال آخری ایام میں تصوف کی تنقید سے تائب ہو گئے تھے۔ بعض مفاہیم کی تاویلات سے یہ گمان گزرتا ہے کہ اقبال کی گریز پائی گرویدگی میں بدل جاتی ہے۔

میکش اکبر آبادی کہتے ہیں:

''اقبال کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ علمائے ظاہر کی خشک تعلیم اور فلسفۂ مغرب کی سرد مادیت پر اقبال کی روحانیت رفتہ رفتہ فتح حاصل کرتی گئی ہے اور وحدت الوجود کی مخالفت کے ساتھ صوفی شعراء کی مخالفت بھی ختم ہو گئی''۔ (نقدِ اقبال ص: ۲۵۳)

موصوف وحدت الوجود کے بڑے مبلغ ہیں اور پوری کتاب میں اس کا جواز فراہم کیا ہے۔ مگر اس کے معترف ہیں کہ

''جہاں تک وحدت الوجود کا تعلق ہے یہ نظریہ سوائے نفیِ محض اور ثنویت کے کسی اور نظریہ سے نہیں ٹکراتا''۔ (۲۶۸)

گلشنِ راز جدید کو پیش نظر رکھ کر غلطی وگماں کا در کھولا گیا۔ اشعار میں تاویل و تفہیم کی بڑی گنجائش ہو سکتی ہے۔ مثلاً میکش صاحب لکھتے ہیں کہ ''علامہ صوفیوں کی طرح خودی کی تکمیل کے لئے فنا کو ضروری سمجھتے ہیں''۔ دلیل میں یہ شعر درج کرتے ہیں ؎

بخود گُم بہرِ تحقیق خودی شو

انا الحق گوئے وصدیق خودی شو

انا الحق اور بخود گُم تو خیال کی خیر خواہی میں قبول کیا گیا مگر تحقیق خودی یا صدیق

خودی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بعض بزرگوں نے اپنی حمایت میں یہ دلیل دی ہے کہ اقبال کے صوفی شعرا سے انحراف اقرار واعتراف میں بدل جاتا ہے۔ جیسے عراقی وسنائی وغیرہ۔ یہاں اس امر پر آپ کا التفات چاہتا ہوں۔ مطالعۂ اقبال میں یہ بات بہت فکر انگیز ہے کہ وہ اپنے نظریہ کی حمایت میں متضاد عناصر سے استفادے میں پس وپیش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ روحانیت کے علم برداروں کے ساتھ مارکس اور اینجلز بھی ہم دوش ہیں۔ خاک نشینوں کے ساتھ عظمت وجاہ کے پیکر بھی پسند ہیں۔ غرض اقبال کی تخلیقات میں صوفیا، علماء، شعراء، مفکرین، امرا وسلاطین کے دلاویز پیکروں کا ایک مرقع موجود ہے۔ جو بلاشبہ دنیا کے کسی ادبی تخلیقات کا جوہرِ فن نہ بن سکا۔ یہ اعزاز صرف اقبال کو حاصل ہے۔

چنانچہ ان کتابوں کو ملاحظہ فرمائیں جو ان ذیلی اور ضمنی اشاروں سے اکتساب کرتی ہیں، جیسے اقبال کے ممدوح صوفیا، اقبال کے ممدوح علما وغیرہ۔

دوسرا اہم نکتہ بھی پیش نظر رکھیے۔ اقبال نے اکثر کل سے صرف نظر کیا ہے اور شخصیت کے ایک جزوی حصے کی حمایت میں غلو کی حد تک اپنی وارفتگی کو وقار بخشا ہے۔ اس سے غلط فہمی اور بدگمانی بھی پیدا ہوتی ہے۔ معاش ومعشیت کے موید یا مزدوروں کی مسیحائی کے لئے حکم معاش کو اقبال نے جو خراج پیش کیا ہے وہ ایک طبقہ کو ناپسندِ خاطر ہے۔ شاہینی صفات اور مسولینی کی ندرتِ فکر اور ذوقِ انقلاب کی ستایش کی وجہ سے ترقی پسند حضرات نے اقبال کو ہدف بنایا۔ اس استنباط اور استخراج کے عمل میں یہ غالباً فراموش کر دیا گیا کہ اقبال کے افکار وآرا کو جن عناصر سے تقویت ملتی ہے اسے اپنانے میں وہ عار نہیں محسوس کرتے۔ فلسفۂ عجم میں رومی پر تنقید موجود ہے۔ جو پیر رومی مرشد روشن ضمیر بھی ہیں۔ سنائی پر اعتراض موجود ہے۔ مگر ۱۹۳۲ء میں سنائی کی قبر کی زیارت کے بعد جن افکار کا اظہار ہوا ہے وہ تمام تر اقبال کی فکر ونظر کے حامل ہیں۔ دوسرا شعر دیکھیے۔

خودی سے اس طلسم رنگ وبو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا

نہ ایراں میں رہے باقی نہ توراں میں رہے باقی
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاکِ قیصر و کسریٰ

وہ چمن گاری خس وخاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو شان کے واسطے پیدا

اسی غزل میں درمیان کے دو اشعار مہروحِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بہ روح میں ہیں جو ادبیاتِ عالم میں لا فانی ولا ثانی ہیں، عطار، رومی، رازی وغزالی کی پسند ہیں مگر اقبال کی اپنے شرائط پر ۔

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اسی طرح فصوص الحکم کو اِلحاد و زندقہ کہنے والے اقبال نے نظم 'تقدیر' (ضربِ کلیم) کو ابنِ عربی سے ماخود بتایا ہے۔ جس کا آخری شعر توجہ طلب ہے ۔

دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام
ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود

دوسری جہات بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اقبال نے جو خراج نظیری نیشاپوری کو پیش کیا ہے وہ مولانا رومی کو بھی میسر نہ آیا۔ ایک مصرعہ پر متاعِ مال ومنال کو قربان کر رہے ہیں۔

بملکِ جم ند ہم مصرعِ نظیری را
کسی کہ کشتہ نشد از قبیلۂ ما نیست

یہ محض اضطراری اظہار نہیں ہے۔ پورے کلام میں دو جگہ بڑے اہتمام اور دو خطوط میں گہرے ادراک کے ساتھ اپنی فکری قرابت کو قلم بند کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ نظیری کا خیال فکر اقبال کا سرنامۂ تحریر کی حیثیت رکھتا: اب دوسرے خیالات جو اقبال کے فلسفہ وفکر سے متصادم ہوں گے۔ وہ کیسے انگیز کر سکتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ اختتام کے طور پر یہ معروضہ بھی پیشِ نظر ہے کہ اقبال نے حضور رسالت پناہ کو ذکر وفکر کا سب سے منزہ محور تسلیم کیا ہے۔

در جہانِ فکر وفکرِ انس وجاں
تو صلوۃِ حج تو بانگِ اذاں

فکر وعمل کا تمام مصدر انہیں کی ذات گرامیؐ ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ہماری تمام فکری عظمت وراجمندی ان کی تعلیمات کو بے چون وچرا تسلیم کرتے ہیں۔

۸

کرتا ہے ترا جوشِ جنوں تیری قبا چاک

-ڈاکٹر عبدالحق
(دہلی یونیورسٹی)

میرؔ و غالبؔ کی طرح اقبال بھی محرومیوں سے دو چار ہے۔ اگر چہ اقبال کی محرومیوں کی نوعیت مختلف ہے۔ آرزو مندی اور اس کی دریابی ان کے تصورات کا ایک اہم پہلو ہے۔ بہتر سے بہتر صورت گری کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ کچھ حاصل بھی ہوئے، مگر زیادہ تر تشنۂ تکمیل ہی رہے۔ ان کی ناکامیوں کی عبرت ناک فہرست ہے۔ ہر سنجیدہ قاری محسوس کرتا ہے کہ ان کی نارسائیاں کہیں کہیں نالۂ دل دوز بنکر دبیز پردوں کو چاک کرتی ہیں۔ ان کی شخصیت کا یہ تضاد بھی کم حیرت خیز نہیں ہے کہ ان کے درونِ دل میں ایک پیہم اضطراب اور نا آسودگی نظر آتی ہے۔ جو ذاتی کم اور اجتماعی بے حسی کی بدولت زیادہ ہے۔ دوسری طرف بیرونی سطح پر افکار و اظہار میں بلا کی توانائی ہے اور طرب نا کی عزم و جلال سے معمور ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے محبّ اور مخاطب دونوں نے مل کر ان کی مایوسیوں میں مزید اضافے کیے ہیں۔ حین حیات سے ہی یہ سلسلہ شروع ہوا۔ سر عبد القادر اقبال کی تحسین میں تاریخ تک پہنچے۔ اقبال کی نظر میں وہ بڑے محترم تھے۔ ان سے پہلے اُردو شعری مجموعے کا مقدمہ لکھوایا۔ بعد ازاں اقبال کی مقبولیت سے وہ اتنے خائف ہوئے کہ ان کی ترقی میں حارج ہوئے۔ کئی دوسرے دوستوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ معاصر دوستوں کی بات تھی۔ اب ذرا مخاطبین کو ملاحظہ فرمائیں۔ اقبالؔ کے مطالعہ میں فرقوں یا عقیدوں کے نام ونسب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ اخوت ومساوات پر قائم بنی نوعِ بشر کا ایک عالم گیر تصور

رکھتے ہیں۔ دنیائے ادب میں اس تصور پر اس شدت سے فکری بنیادیں فراہم کرنے والا دوسرا فن کار نظر نہیں آتا۔ برصغیر کے اقوام یعنی ہندو مسلمان ان کے مخاطب اول تھے۔ اسلامی سیاق وثقافت ان کی فکر اور شاعری کا نقطۂ پرکارِ حق ہے۔ مسلمانوں کے معاملات ومسائل پر ان کی خاص توجہ ہے۔ اس گروہ نے اقبالؔ کو سب سے زیادہ مایوس کیا اور ان کو خلش میں مبتلا رکھا۔ جب کہ اقبالؔ زندگی بھر ان کے سوز و ساز میں شریک رہے۔ انہوں نے اقبالؔ کو ہدفِ تنقید بنایا۔ ایک فرقے نے تفضیلی کہا کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اقبالؔ کے خلاف شرم ناک تحریریں شائع کیں۔ ذاتیات پر رکیک حملے کیے اور محاذ آرائی بھی کی۔ ثبوت کے طور پر ڈاکٹر ایوب صابر کی کتاب ''اقبال دشمنی'' دیکھی جاسکتی ہے۔ اقبالؔ نے اہلِ بیت کے حضور جن انقلاب آفرین عقیدت کا اظہار کیا ہے وہ ان کے افکار کا لاثانی سرمایۂ احترام ہے۔ کوئی مؤرخ اور مرثیہ نگار اس منزلت تک رسائی حاصل نہ کرسکا۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس طبقے کے ادیب ودانشور اور ناقدین نے اقبال پر زیادہ سے زیادہ ملامتی رویہ اپنایا۔ ایک دو استشنائی صورتوں کے علاوہ اس گروہ نے اقبالؔ کو قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا اور کتاب بھی نہیں لکھی۔ جنہوں نے تصنیف پیش کی وہ مخالفانہ اور معاندانہ ہی رہی۔ اسی ذیل میں ترقی پسند ادیب وناقد بھی شامل ہیں۔ ترقی پسندی کی آڑ میں اقبالؔ کے خلاف دل کا سارا بخار نکالا گیا۔ اس میں تفضیلی طبقے کے لوگ پیش پیش رہے۔ انہیں شاید اس حقیقت کا ادراک نہ تھا کہ زمانے نے اس نظریہ اور نہاد کو خس وخاشاک کی طرح اڑادیا۔ دوسری حقیقت بھی دیکھیے کہ اقبالؔ نے جن ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ مارکس اور لینن کے حامی وحمایتی مل کر بھی پیش نہ کرسکے۔

اب ذرا ہندوؤں پر نظر ڈالیے۔ اقبالؔ نے اس عقیدے کے رہنماؤں اور رُشیوں نیز فلسفہ وفکر سے جس وابستگی کا اظہار کیا ہے وہ اردو، فارسی اور انگریزی کے کسی شاعر ودانشور کے احاطۂ تحریر میں موجود ہے؟ اس حقیقت کے باوجود غیر مسلم مصنفین نے اقبالؔ کو نہیں بخشا۔ ان کی تمام وکمال تحریریں اقبالؔ کے خلاف ہی ملیں گی۔ حد یہ کہ ملک راج آنند ہوں یا آنند نرائن ملا یا اُردو کے معروف شاعر فراق اور محقق پروفیسر گیان چند جین، جنہیں اقبال کی

حجازی لے پسند نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو، ''اقبال کا عروضی مطالعہ''۔ ہاں چند نام ایسے ہیں جنہیں مخالفین کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس تکلیف دہ تمہید کے پس منظر میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی خدمات کا صدق دل سے معترف ہوں۔ وہ صف اول کے اقبال شناسوں میں ہرگز شامل نہیں ہیں اور نہ ان کی اقبال شناسی اقبال کے فکر وفن کی تفہیم میں کوئی اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ مگر اقبال کو مقبول عام بنانے میں ان کی تصانیف نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ اقبال کے خیالات کی ترجمانی وتشریح میں انہیں یاد کیا جائے گا۔ ان کی اہم کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' ہے۔ یہ بھی ایک سرسری اور عمومی تقابل وتجزیہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ ظاہر ہے کہ آزاد کا نہ تفکیری مزاج تھا اور نہ مطالعہ۔ وہ شاعر تھے اور زماں ومکاں کے پردۂ ساز کے پروردہ بھی۔ وہ مقدور بھر ہر مقام اور ہر لمحے کا احتساب اور استفادہ حاصل کرنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ مشاعرے ہوں یا مذاکرے مال ومتاع کی دنیائے دوں آباد رہتی اور اس کے لیے وہ سو سو جتن بھی کرتے تھے۔ جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ نہ شاعری میں استفادہ حاصل کر سکے اور نہ انتقادی ادب میں مقام پیدا کر سکے۔ یوں بھی شاعر معتبر نقاد نہیں بن سکتا اور اقبال شناس بننے کے لیے شاعری کو غرقِ مئے ناب کرنا پڑے گا۔ مقتدر اقبال شناسوں کی تحریریں یہی ثابت کرتی ہیں۔ راقم کا یہ خیال ہے کہ انہوں نے مصلحتوں اور مجبوریوں کی بناء پر اقبال شناسی کے کوچے میں قدم رکھا تھا۔ یہ بات بھی حیرت ناک ہے کہ اقبال کے معتقد ہونے کے باوجود ان کی شاعری اقبال کے اسلوب وآہنگ سے خالی ہے۔ فیض کو اقبال سے ایک ذہنی وفکری تعلق تھا ان کی شعری تخلیقات میں اقبال کا پرتو اور پرچھائیں نظر آتی ہیں۔ سردار جعفری اقبال کے بہت حد تک معترف تھے۔ ان کی شاعری میں اقبال کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے رگ وپے میں اقبال کا خروشِ احساس رواں نہ تھا۔ ان کی عقیدت محض تحریر وتقریر تک محدود تھی۔

اس کی دوسری مثالیں بھی ہیں۔ انہوں نے جوش کے حوالے سے اپنے دل کی خوب بھڑاس نکالی ہے۔ جوش ملیح آبادی اقبال سے کدورت رکھتے تھے۔ یہ وہی جوش ہیں جن کے لیے اقبال نے سفارشی خط لکھا تھا اور ان کی تعریف کی تھی۔ آج کل کی ادارت کے

زمانے میں جوشؔ و آزاد بہت قریب تھے۔ بلکہ رفیق کار کی حیثیت رکھتے تھے۔ آزاد نے جوشؔ کے انتقال کے بعد اپنی تحریروں میں ان کا اکثر مذاق اڑایا ہے اور اقبالؔ کے بارے میں جوشؔ کے ایسے مکروہ مقولات مندرج کیے ہیں کہ خود راوی کی نیت مشتبہ نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ سے شائع شدہ کتابچہ ''اقبال ۵، ۱۹۸۹ء'' مجھے حیرت ہے کہ ایسا رکیک مضمون مرحوم اندرابی صاحب نے کیوں شائع کیا؟ وہ بھی اقبالؔ انسٹی ٹیوٹ سے اور بحیثیت ڈائریکٹر و مدیر کے۔ اگر جوشؔ کا بیان صحیح بھی ہو تو یہ نقلِ کفر بھی ارتکاب جرم ہے۔

پروفیسر آزاد کی اقبالیات کی طرف مراجعت بہت سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ ہے۔ ہم سب کی طرح ان کی بھی بشری کمزوری تھی۔ جس میں چند معزز ہستیوں کے مناسبات کے سہارے اپنے قد و قامت کو بلندی بخشنے کی سعی کی جاتی ہے۔ برصغیر کے دو عظیم فنکار ہیں۔ غالبیات کا دامن مالک رام تھام چکے تھے۔ اب اقبالیات کی باری تھی۔ ادبی دنیا حریف مئے مرادِ فگن اقبال کی صدا دے رہی تھی۔ یہ بات بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ کشمیر جانے سے پہلے آزاد کی توجہ اقبال پر برائے نام تھی۔ کشمیر میں مرکزی حکومت کی طرف سے رابطۂ عام کے منصب پر فائز کیے گئے۔ یہاں عوام و خاص میں اقبالؔ کی مقبولیت ایک جذباتی وابستگی کا درجہ رکھتی ہے اور شیخ عبد اللہ مرحوم کی اقبالؔ سے والہانہ شیفتگی بھی ایک حقیقت ہے۔ ملک کے سربراہ اور عوام کے محسوسات کی نبض شناسی مرکزی حکومت کے لیے بڑی معنویت رکھتی ہے۔ مرکز اور ریاست کے درمیان رابطے کی استواری کے لیے بھی آزاد کا انتخاب یا استصواب ناگزیر تھا۔ دھیرے دھیرے وہ شیخ صاحب سے قریب تر ہوتے گے۔ بہ ظاہر اقبال ایک بہانہ بنے۔ پھر شیخ صاحب بھی آئینۂ آزاد میں اس طرح اترے کہ آزاد کو مرحمتِ خسروانہ سے سرفراز کیا۔ تاحیات تنخواہ اور تمام مراعات کے ساتھ پروفیسر ایمیریٹس کا منصب تفویض کیا جانا بھی علمی و ادبی تاریخ کا عجوبہ ہے۔

ان اعزاز کی برکت سے فیضانِ ساوی کا نزول شروع ہوا۔ یونیورسٹیوں میں اُردو کی اسامیوں کی بھرتی کے لیے وہ کارشناس بھی قرار دیئے گئے۔ مشاعرے اور مذاکرے کی محفلوں میں توسیع ہوئی، تقررات اور اہم فیصلہ کن کمیٹیوں میں شمولیت کا دائرہ کار بڑھا۔ پھر

اقبالؔ اور اقبالیات پسِ پشت پڑ گئے اور آزاد کے اقرار و اعترافات کے لیے امکانی حد تک کوشش کی جانے لگی۔ آزادؔ کی خودی بڑھتی گئی اور ان کے رازِ درونِ سینہ کی غماز بن گئی۔ خود شناسی اور خود ستائی نے واحد متکلم کے طرزِ بیان کو اپنا لیا۔ ہر بات میں اپنی یافت اور فتوحات کا تذکرہ شعارِ زندگی بنتا گیا۔ چنانچہ آمادہ کر کے اور امداد فراہم کر کے اپنی ذات وصفات پر کتابیں لکھوانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُردو میں مذموم بدعت غالباً انہیں کی ذات سے اپنی ابتدائی نسبت رکھتی ہے۔ اپنے ساتھ اپنے والدِ محترم کو بھی زندۂ جاوید بنانے میں ان کی جد وجہد جاری رہی۔ جواز بھی تھا کہ کسی لائق فرزند کی یہی پہچان بھی ہے۔ انہیں مقدرت ملی تھی اور خوش قسمت بھی تھے کہ ایک فن کار باپ کے سپوت تھے۔ تلوک چند محروم اقبالؔ کے قدر شناسوں میں نہ تھے۔ اور نہ ان کے معاصر جوش ملسیانی جوشؔ تو اقبالؔ کی خامیوں پر کتاب بھی لکھ چکے تھے۔ ان کے بیٹے عرش ملسیانی بہت ہی باغ و بہار انسان تھے۔ اکثر صبح کے وقت چہل قدمی کے بعد پڑاؤ کے طور پر میری قیامگاہ ماڈل ٹاؤن میں تشریف لاتے اور کبھی کبھی اقبالؔ پر طنز وتضحیک سے کام لیتے۔ اس میں شدت نہ ہوتی مزاح وٹھٹھول کا پہلو غالب ہوتا۔ راقم ان کا پڑوسی تھا۔ روزانہ ملاقات کا سلسلہ رہتا۔ پنجاب کی ادبی محفلوں کا ذکر ہوتا۔ ان کی نظر میں بھی آزادؔ کی اقبالؔ شناسی بہت معتبر نہ تھی اور نہ ہی ان کی شاعری کا ان کے اندازِ ترنم پر عرش صاحب خوب مزہ لیتے اور نقلیں بھی اتارتے۔ خود اپنا کلام ترنم سے پڑھتے۔ مولانا گرامی کا نام بڑے احترام سے لیتے۔ انہوں نے اپنے نعتیہ مجموعے کے سرورق پر مولانا گرامی کا بے مثل شعر نقل کر کے اپنے جذبۂ احترام کو تابندگی بخشی ہے۔ یہ سلسلہ کئی برس تک قائم رہا۔ وہ جوش ملیح آبادی کے ساتھ رہ چکے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی اقبال کے بارے میں جوشؔ کے ناپسندیدہ بیانات کا ذکر نہیں کیا۔ جب کہ آزادؔ نے بڑی فراخی کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔ جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؔ و جوشؔ کے درمیان مغائرت پیدا کرنے کی یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ ان کے ساتھی میرے اچھے دوست اسکالر ڈاکٹر شیام لال کالرا بھی آزادؔ کے مطالعہ اور اقبالؔ شناسی کے معترف نہ تھے۔ وہ اکثر شاکی رہتے۔

ایک دوسرا پہلو بھی قابل ذکر ہے۔ آزادی کے بعد اُردو پر جو افتاد پڑی تھی وہ بہت ہی دل دوز کہانی ہے۔ اُردو کو مشترک زبان کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے پر توجہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس تصور اور تحریک میں ہندو مسلمان کے اشتراکِ عمل کی بڑی ضرورت تھی۔ بعض تفریق پسند طاقتوں کے سازشی منصوبوں کا جواب بھی اسی میں تھا۔ لہٰذا غیر مسلموں کی شرکت و سربراہی کو ناگزیر سمجھ کر انہیں مناسب توقیر سونپی گئی۔ ملا صاحب کی معیت مالک رام صاحب کی منزلت اتنی تھی کہ وہ اُردو فارسی کے معاملات میں دخیل تھا۔ سفارت خانۂ ایران میں مالک رام صاحب کی بازیابی کی وجہ سے دوسرے فارسی داں ان کی خوشامد کے لیے مجبور تھے۔ چنانچہ اس ضد میں ''اردو تحقیق اور مالک رام'' کتاب بھی شائع کی گئی۔ جس کا انہیں بڑا ملال تھا۔ ۱۹۶۹ء میں غالبؔ کا صد سالہ جشن منایا گیا۔ جس میں موصوف پیش پیش تھے۔ حالانکہ یہ خیال اور منصوبہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مرحوم کا تھا۔ لیکن احباب نے مل ملا کر فخر الدین علی احمد کی سرپرستی میں جشن کا اہتمام کیا اور فاروقی صاحب کو الگ کر دیا گیا۔ مالک رام غالب کے جشن سے فارغ ہوئے تھے کہ ۱۹۷۳ء میں اقبالؔ کے صد سالہ جشن کی تیاری شروع کردی۔ راقم نے ''اسٹیٹس مین'' میں ایک خط شائع کرایا کہ اقبال کی تاریخ ولادت متنازع فیہ ہے۔ بیشتر دستاویز ۱۸۷۷ء کی تائید کرتے ہیں۔ مالک رام صاحب چاہتے ہیں کہ جلد از جلد شہرت وسیم کی دولتِ بیدار سمیٹ لیں۔ اس خط کی اشاعت پر انہوں نے مجھے سخت دھمکی دی اور ہتک عزت کا مقدمہ دائر کرنے کی بات کہی۔ خاکسار نے بہ صد ادب عرض کیا کہ آپ کو اختیار ہے۔ وہ زندگی بھر خفا رہے۔ میں نے بھی کبھی معذرت نہ کی۔ وہ ایک ارمان رکھتے تھے کہ کسی صورت شعبۂ اردو میں ان کی پذیرائی ہو۔ فاروقی صاحب دہلیز پر بھی قدم رکھنے کے حق میں نہ تھے۔ وہ ایک سال کے لیے تاشقند گئے تو ظہیر احمد صدیقی مرحوم کارگزار صدر تھے۔ مالک رام صاحب نے وائس چانسلر پروفیسر سروپ سنگھ سے درخواست کی کہ شعبہ میں ان کا ایک لیکچر ہو جائے۔ ظہیر صاحب کم زور طبیعت کے شریف آدمی تھے۔ وائس چانسلر کی بات نہ ٹال سکے۔ پورے شعبہ کے لیے یہ سب سے گراں وقت تھا۔ اس تحصیل کا مقصد صرف یہ ہے کہ یونیورسٹیوں سے

باہر کے لوگ اساتذہ پر ہمیشہ خندہ زن رہے مگر آرزومند رہتے ہیں کہ کسی بہانے ان کی پذیرائی دانش گاہوں میں بھی رہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مالک رام ہوں یا جگن ناتھ آزاد دونوں کے یہاں یہ کسک تھی۔ آزاد نے تو کئی بار خاکسار سے فرمائش کی کہ انہیں بھی مدعو کیا جائے۔ پاسِ ناموسِ اقبال نے مجھے راضی نہ ہونے دیا۔ اسی سبب آزاد پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ہمیشہ رشک ورقابت رکھتے رہے کیوں کہ وہ یونیورسٹیوں میں بھی تھے ورعلمی ادبی فتوحات میں ان سے سبقت رکھتے تھے۔ غالباً مشاعرے کی حریفانہ کشاکش آزاد کے مزاج میں سرایت کر چکی تھی۔ یونیورسٹی میں شامل ہونے کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ مگر خودنمائی کے طور طریقوں میں تبدیلی نہ آسکی۔ خواہشیں بڑھتی رہیں، اقبالیات کے وسیلے سے نہ سہی شعری تخلیق کے سہارے اقبال سمان کے لیے سرگرداں ہوئے۔ میری بدتوفیقی تھی کہ اس کمیٹی میں موجود تھا۔ تقریباً سبھی ارکان تماشائی تھے۔ ایک صاحب آزاد کی حمایت میں لڑنے مرنے کو تیار اور آزاد کی فتوحات کی پوری فائل لیے ہوئے بحث وتکرار میں مشغول۔ دوسری جانب ہم لوگ پروفیسر آل احمد سرور مرحوم کی تائید میں تمام دلائل سے آراستہ آزاد کے Promotor کسی قیمت پر راضی نہ تھے۔ جناب حیات اللہ انصاری مرحوم کا نام پیش کیا گیا۔ اس پر بھی سخت برہمی کا اظہار کیا گیا اور وہ آزاد کی حمایت سے دست بردار نہ ہوسکے۔ آخر آخر اپندر ناتھ اشک کا نام پیش کیا گیا اور پروفیسر جین کا خط بھی دکھایا گیا جس میں سفارش تھی کہ اشک صاحب بسترِ مرگ پر ہیں ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا جائے۔ اس پر سب نے اتفاق کیا۔ آزاد کو اس کا بڑا قلق رہا اور وہ شکوہ سنج بھی رہے۔ بہ قول فیض دامن دل کو حسنِ دو عالم سے بھر دینے کے باوجود بھی اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی۔ مالک رام کے انتقال کے بعد میدان خالی ہوا تو ڈال کے طور پر بعض جیالے ان کے بغل گیر ہوئے۔ سایۂ شجر کے طور پر وہ راحت رسانی کرتے رہے۔ اقبال شناسی ان کا مقصود ومنتہا نہ تھا۔ یہ وسیلۂ جاہ جبروت کا ایک موثر اور مفید منصوبہ تھا۔ ان کی تیار کردہ یا لکھوائی گئی کتاب ''اقبالیاتِ آزاد'' کو دیکھیے۔ اقبالیات کم اور ان کے فتوحات کی داستان سرائی پر سب سے زیادہ موقوف ہے اور اس مکروہ بدعت میں ہمارے بہت سے ادیب

واساتذہ ملوث ہوئے۔ ان کی تصانیف اقبالؔ اور اس کا عہد سے لے کر ''اقبال اور کشمیر'' ا
تک یا جملہ تحریریں دیکھیے۔ وہ شرر سے شعلہ تک رسائی میں ہماری مدد نہیں کرتیں۔ وہ پروفیسر
گیان جین کے مضمون ''اقبال کا عروضی مطالعہ'' کے برابر بھی کوئی مضمون نہ لکھ سکے۔ پروفیسر
جین کی کتاب ''اقبال کا ابتدائی کلام'' تک رسائی کی ہم ان سے توقع ہی نہیں کرتے۔ یا
پروفیسر گوپی چند نارنگ کی مرتب کردہ کتاب ''اقبال کا فن'' کے برابر مقالات کا کوئی مجموعہ
بھی مرتب نہ کر سکے۔ وہ زندگی بھر دوسروں کی محفل میں زیب وزینت ضرور بنے مگر اقبالؔ
کے نام پر ایک قومی سطح کا مذاکرہ بھی منعقد نہ کر سکے۔ اگرچہ اسی کشمیر میں پروفیسر آل احمد
سرور تقریباً ہر سال قابلِ رشک مذاکرے کی محفل سجاتے رہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے
کہ وہ اقبالؔ سے کتنے قریب تھے۔ یا اقبالؔ کتنے عزیز تھے۔ اس فرضِ کفایہ کی ادائیگی کے
لیے فطرت نے پروفیسر ظہور الدین کو منتخب کیا۔ جو نہ اقبال چیر پر فائز تھے اور نہ ہی اقبالؔ
شناسی کے دعوے دار۔ ایک اور پہلو بھی دیدنی ہے۔ اقبال پر ان کی پہلی کتاب ''اقبال اور
مغربی مفکرین'' شائع ہوئی۔ وہ ۱۹۶۸ء میں کشمیر آچکے تھے۔ گویا کشمیر آنے کے سات سال
بعد یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔ ۱۹۷۶ء میں ایک کتاب ''اقبالؔ کی کہانی'' شائع ہوئی۔
۱۹۷۷ء میں چار کتابچے اور شائع ہوئے۔ جس میں تصویروں کا ایک البم اور ''بچوں کے
اقبالؔ'' بھی شامل ہے۔ یہی سال جشن اقبالؔ کے ہنگامے اور بہتی گنگا سے بہرہ مند ہونے کا
بھی ہے۔ اسی سال وہ پروفیسر ایمریٹس کے اعزاز سے بھی نوازے گئے۔ شعبے کی صدارت
بھی مالِ غنیمت کے طور پر ملی۔ بعد ازاں پانچ سال بعد ۱۹۸۲ء میں انگریزی میں کتاب
شائع ہوئی اور ۱۹۸۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۸۹ء کے بعد وہ اقبالؔ سے دست کش
ہوگئے۔ پھر پندرہ سال یعنی انتقال تک اقبال کی طرف رُخ بھی نہیں کیا۔ کم سے کم ان کی
Chronology سے یہی پتہ چلتا ہے جو پختہ روشنائی میں موجود ہے اور بڑے اہتمام سے
شائع کرائی گئی ہے۔ ترجیحات بدل گئیں۔ مذاکروں، مشاعروں اور میٹنگ نے مہلت نہ دی
کہ وہ اقبالیات کی طرف متوجہ ہوتے۔ اپنی بات پھر دہراتا ہوں کہ اقبالیات سے ان کا
شغف منصوبوں، مصلحتوں اور مجبوریوں کا محکوم تھا۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود وہ اقبالؔ

کے شارح، مداح اور تجزیہ نگار کے طور پر قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اقبال کو مقبول عام اور متعارف کرانے میں ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب اقبالؔ کے نام کو انگیز کرنے کے لیے ایک بڑا طبقہ آمادہ نہ تھا۔ برادرانِ وطن کے ساتھ ترقی پسند طبقہ بھی نالاں وگریزاں تھا۔ ایسی پرآشوب سیاہ رات میں مفلس کا دیا بھی رہبری کے لیے قندیلِ رہبانی کا کام کرتا ہے۔ آزادؔ کی شاعری اور شخصیت کا رنگِ سخن ماند پڑ جائے گا مگر اقبالیات میں ان کی تحریریں اور طرزِ بیان انہیں یاد دلاتی رہیں گی۔ اقبال پر لکھنے والے تمام غیر مسلم ادیبوں میں آزادؔ کی عقیدت مندی اور وسعتِ نظر ان کی بصیرت اور بشارت کی حامل ہے۔ جسے خراج پیش کرنے کے لیے ہم مامور بھی ہیں اور مجبور بھی۔

دربار خانخان کا ایک شاعر
محمد رضا نوعی خبوشانی

-ڈاکٹر عراق رضا زیدی
(جامعۂ ملیہ اسلامیہ، دہلی)

ہندوستان میں فارسی ادب کا عہد زرین اکبر بادشاہ کے دور حکومت کو قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب علم وادب کے افق پر ایک اور مرکز گجرات کی صورت میں نمودار ہوا جس کی آبیاری کا سہرا صوفیاء کرام عبد الرحیم خان خانان اور نظیری نیشاپوری کے سر رہا۔ اگر چہ غزنوی دور سے ہی ہندوستان میں فارسی ادب کے ارتقائی نقوش نظر آنے لگتے ہیں۔ اور مسعود سعد سلمان جیسا ایک نامور شاعر سرزمین ہند کو مفتخر کرتا ہوا فارسی ادب کے آسمان پر ایک روشن ستارے کی مانند جگمگا رہا ہے۔ غزنوی دور سے مغلوں کے زمانے تک ہر عہد میں فارسی ادب کے شاعروں اور ادیبوں کے کارنامے موجود ہیں۔ خصوصاً امیر خسرو ایک ایسا نام ہے جو ہر دور میں ملک سخن کا تنہا بادشاہ نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود اکبر کا دور وہ زمانہ ہے جس میں محمود غزنوی کے درباری شاعروں کی طرح کتنے ہی شاعر وادیب نظر آتے ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ایران کے شعرا اکبر کی فیاضیوں کے چرچے سن کر ایران سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔ کچھ دانش وروں نے اس ہجرت کی ایک وجہ ایرانی اقتدار پر فائز صفوی خاندان کے حکمرانوں کی ادب سے بے توجہی اور شاعروں کے ساتھ فیاضانہ سلوک روا نہ رکھنا بتایا ہے۔ لیکن فارسی ادب کے پہلے ناقد ودانش ور شبلی نعمانی اس خاندان کے فیاضیوں کے بڑے معترف نظر آتے ہیں۔

''صفوی خاندان خود صاحبِ علم وفضل اورسخن سنج اور سخن شناس تھا اس لئے
اس نے شعرا کی نہایت قدر و منزلت کی۔''[1]

یہاں تک کہ اس خاندان کے فرمانروا شاعروں اور ادیبوں کا اتنا احترام کرتے تھے کہ تمام فیاضیوں اور حسنِ سلوک کے باوجود شاہان مغل میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ جیسا کہ شبلی نعمانی نے سرو آزاد کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔

''شاہ عباس ایک دفعہ کوکبِ شاہی کے ساتھ جا رہا تھا ادھر سے حکیم شِفائی
مشہور شاعر آرہا تھا۔ شاہ عباس نے سواری سے اترنا چاہا، شفائی نے بڑے
اصرار سے روکا تاہم امراء اور درباری گھوڑے سے اتر پڑے، شاہ عباس
اکثر مسیح کاشی کے گھر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔''[1]

دراصل ایران سے ہندوستان کی طرف ہجرت کی وجہ یہاں کے بادشاہوں، شاہزادوں کے ساتھ ساتھ امراء ووزراء کی فیاضیوں اور شعرا کے ساتھ حسن سلوک کے چرچوں کا عام ہونا تھا۔ بادشاہ تک کسی شاعر کی رسائی ہونا کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن جب یہ رسائی کسی شاہزادے، وزیر یا امیر کی وساطت سے ہو تو یہ کام نہایت آسانی سے انجام پا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کسی امیر یا وزیر کے دربار تک رسائی بادشاہ تک رسائی سے کہیں زیادہ آسان ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ اکبر بھی کیا اس کے امرا ووزرا تک کی فیاضیاں زبان زد خاص وعام تھیں۔ جن کا شہرہ ایران وتوران تک پہنچا ہوا تھا۔

جب عبدالرحیم خان خانان نے مظفر شاہ کو شکست دے کر صوبۂ گجرات کو بھی اکبر کی سلطنت کا ایک حصہ بنا دیا تو اس صوبے میں بھی شاعروں اور ادیبوں پر فیاضیوں کے دروا ہونے لگے۔ اور یہ صوبہ بھی دہلی اور آگرے کی طرح فارسی تہذیب وتمدن کا مرکز بن کر ابھرنے لگا۔ یہاں تک کہ عبدالرحیم خان خانان کے دربار سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کی بھی ایک الگ شناخت بننے لگی۔ خان خانان کی فیاضیوں کے سامنے تو خود اکبر بادشاہ کی فیاضیاں بھی ماند پڑنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے تین اہم اور بزرگ ترین شاعروں فیضی، عرفی اور نظیری میں سے عرفی اور نظیری دونوں خان خانان سے وابستہ

ہو گئے۔ جن مہاجر شاعروں کے نام درج کئے ہیں ان میں سے اکثر ابوالفتح گیلانی، فیضی، ابوالفضل اور خان خانان وغیرہ کے وسیلے سے اکبر کے دربار تک رسائی حاصل کر سکے ہیں۔ ایران سے ہندوستان آنے کے لئے خشکی اور سمندری دونوں راستوں کا استعمال عام تھا۔ سمندری راستے سے آنے والے شاعروں کو گجرات سے ہوکر گزرنا لازمی تھا جہاں ان کی پہلی منزل نظیری نیشاپوری کا دولتکدہ تھا۔ نظیری کہنے کو تو خان خانان کے دربار سے وابستہ تھا۔ لیکن وہ خود بھی ایک بڑا تاجر، صاحب حیثیت، مہمان نواز اور خاصہ سخی تھا۔ اس کے مہمان خانے میں بھی شاعروں اور ادیبوں کا اکثر اچھا خاصا جمگھٹ رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر کے دور کے شعراء کی فہرست ابھی تک نامکمل ہے۔ شبلی نعمانی نے شعرالعجم میں آئین اکبری کے حوالے سے صرف اکیاون (۵۱) شاعروں کے نام درج کئے ہیں۔ جب کہ آئین اکبری میں یہ تعداد انسٹھ (۶۹) شاعروں تک پہنچتی ہے۔ جن میں درویشؔ ائی، صبوحیؔ چغتائی، مشفقیؔ بخاری، صرفیؔ شہیری، مظہریؔ شمیری، شیخ رہائی، شیری اور فیضؔ کے نام شبلی کی فہرست سے خارج ہیں۔ آئین اکبری میں اُن شاعروں کے نام بھی موجود ہیں جن کی رسائی دربار تک نہ ہوسکی تھی۔ ان شاعروں کے علاوہ بھی ایک خاصی تعداد ایسے شاعروں کی ہے جن کے نام صرف تذکروں کی زینت بنے ہوئے ہیں جیسے مولانا شہوار بیگ نادم گیلانی جو نظیری نیشاپوری کے شاگرد تھے۔ جیسا کہ نصرآبادی میں تحریر ہے:

''ملا نادم از لاھیجان است، طبعش نہایت شوخی وانگیز۔ واز شور کلامش رستخیز ظاہر بود، بہندوستان رفتہ ملانظیری مہربانی بسیار باوکرد۔ اوہم اعتقاد بملانظیری دارد۔'' [۳]

نادم کو اپنے استاد نظیری پر بہت ناز تھا۔ جنھیں وہ ہمیشہ تعظیم وتکریم کی نظر سے دیکھتا تھا۔ کہتا ہے ؎

مشتاق نظیری است چہ خاقان وچہ فغفور
یوسف بقفارفت زلیخا بہ نشا پور
سرتا بر آفاقِ جہاں معرکۂ ماست
استاد قوی پنجۂ وشاگرد قوی زور

نظیری کے انتقال پر ایک مرثیہ میں یوں غمگین نظر آتا ہے ۔

نعش خود را پیش تابوت کتل می خواستم وقت رفتن بودمرک بی اجل می خواستم

یہاں لفظ کتل نے جو غمزدہ ماحول پیدا کیا ہے وہ کسی اور لفظ سے ممکن نہ تھا۔ نظیری کے انتقال کے بعد وہ اصفہان واپس چلا گیا اور وہیں کی خاک میں پیوست ہو گیا۔

اکبری دور میں کتنے ہی شاعر ہیں جو ہنوز پردہ خفا میں ہیں جو صاحب دیوان ہوتے ہوئے بھی ابھی تک دیوان کے شائع ہونے سے محروم ہیں ایسا ہی ایک نام دربار دانیال وخان خانان سے وابسطہ مولانا محمد رضا نوعی خبوشانی کا بھی ہے۔ آئین اکبری میں جنھیں نوعی مشہدی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے نوعی خبوشانی کا ذکر اپنے تذکروں میں کیا ہے۔

عرفات العاشقین میں نوعی کو مولانا محمد صفائی لکھا گیا ہے۔ جب کہ میخانہ، ریاض القرا و مرآۃ آفتاب نما میں یہ نام محمد رضا لکھا گیا ہے اور یہی اس کا اصل نام بھی ہے۔ نوعی ۹۸۰ھ میں خبوشان میں پیدا ہوا جیسا کہ تذکرہ نگار ملا عبدالنبی نے ''میخانہ'' میں لکھا ہے۔

''نام او محمد رضا است، مولدش خبوشان است۔ و این خبوشان ملحق بہ نشاپور و خراسان است[۴]

ماثر رحیمی میں اور مرآت آفتاب نما میں یوں درج ہے:

'مولانا نوعی از قصبۂ خبوشان توابع مشہد مقدس است[۵] نوعی، نامش محمد رضا از شعرای مشہور۔ اصلش از خبوشان قصبہ است از توابع خراسان''[۶]

اور ایک تذکرے میں اس طرح درج ہے:

''نوعی خبوشانی، نام ونسب وی محمد رضا بن محمود بودہ است در ۹۷۰ھ در خبوشان ولادت یافتہ۔ وچون چندی در مشہد زیستہ بمشہدی معروف شدی۔[۷]

نوعی کے والد شیخ محمود ایک صوفی صفت انسان تھے جو خبوشان کے مشہور و معروف بزرگ حاجی محمد خبوشانی کی اولاد میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تاریخ نظم ونثر در ایران میں تحریر ہے:

''ملا نوعی خبوشانی، اصلاً از مردم خبوشان بافوجان یعنی فوجان امروز بوده وخود
راازباز ماندگان شیخ حاجی محمد عمود خبوشانی عارف معروف می دانست۔ ۸

منتخب التواریخ میں ملا بدایونی نے نوعی کو حاجی محمد خبوشانی کے خاندان کا فرد تو مانا ہے لیکن نوعی کی زندگی کی چندکمیوں کی مناسبت سے اس کے عمل پر تنقید بھی کی ہے۔

''نوعی خود را از بنائر حضرت شیخ حاجی عمود خبوشانی (قدس اللہ سرہ العزیز)
می گیرد۔ اما عملش تکذیب آن دعویٰ می نماید۔ ۹

خبوشان، صوبہ خراسان کا ایک خوبصورت اور قدیمی قصبہ ہے۔ جو مشہد مقدس سے بھی نزدیک ہے۔ عہد قدیم میں اس مقام کو''استو'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

نوعی نے ہندوستان کا پہلا سفر اپنے والد شیخ عمود کے ساتھ عہد طفلی میں کیا تھا۔ میخانہ میں ہے:

''بہ تحقیق پیوستہ کہ، در صغر سن همراه پدر خود شیخ محمود از وطن بہند آمد'' ۔۱۰

شیخ عمود کا یہ سفر خواجہ ابو القاسم سیری کے دیدار وشرف ملاقات اور کبھی اعانت کے لئے تھا۔ جو اس وقت گجرات میں صاحب حیثیت و وسعت اور شیخ محمود کے اعزا میں تھے۔ نوعی کے والد نے ان سے ملاقات کر کے کچھ مدد حاصل کی اور واپس مشہد چلے گئے۔ بقول عبدالنبی:

''وخواجہ مذکور در گجرلت صاحب سامان بودہ، پدر، او را فرا خورِ حال
امدادی نمودہ بوطن روانہ ساختہ۔ چون محمد رضا در خدمت پدر بہ مشہد مقدس
می رسد، پدرش در آن خطہ بقیۂ عمر بخدا پرتی مشغول می شد۔ وی گویند کہ:
خیلی صاحب حالت شدہ واز اکسیر ریاضت، بمرتبہ ولایت رسیدہ بود کہ
عالم فانی را وداع کردہ بعالم باقی می خرامد۔'' ۱۱

نوعی کے والد کی وفات کا نہایت رنج وملال ہوا۔ اور نوعی نے اپنے والد کی تمام میراث کو تھوڑے ہی عرصہ میں کچھ بانٹ کر اور کچھ خرچ کر کے تمام کر دیا اور خود دوبارہ ہندوستان کی جانب گامزن ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اکثر ایرانی شاعر ہندوستان کی طرف

ہجرت کرنے کے خواہشمند تھے۔ اس بار نوعی خراسان سے لاہور آیا۔ اور مرزا یوسف خان رضوی کے یہاں اقامت پذیر ہوا۔ جو مشہد مقدس کے صحیح نسب سادات سے تھے اور اکبر کی طرف سے چہار ہزاری منصب پر فائز تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۱۰ھ میں جونپور میں ہوا تھا مگر ان کی لاش دفن کے لئے مشہد لے جائی گئی تھی۔

یوسف خاں رضوی کی ملازمت میں ہی کشمیر کا سفر بھی کیا اور شاعری کے وسیلے سے عوام میں شہرت بھی حاصل کی اور نوعی تخلص اختیار کیا۔

نوعی شاعری کے ساتھ ساتھ فن سپہ گری میں بھی نہایت مشاق و ہنر مند تھا۔ تیراندازی میں اسے کمال حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن یوسف خاں کے حکم پر ایک ہی نشانہ پر پانچ مرتبہ کامیاب تیراندازی کی جس کی شہرت کا چرچہ عام ہوا۔ یہاں تک کہ یہ بات شہزادہ دانیال کے گوش گزار ہوئی جو نہایت نکتہ سنج وقدردان تھا۔ لہٰذا اس نے نوعی کو مرزا یوسف سے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ میخانہ میں اس واقعہ کو ضبط کیا گیا ہے۔

''گویند کہ: کماندار بی نظیر بود و شدسوار بشمشیر بودہ۔ یک بار پنج مرتبہ درحضور میرزا یوسف خان ھدف را بہ تیر ربودہ۔

چون رتبۂ موزونیت و مرتبہ اہلیت، ومعروف ومشہور گشت، رفتہ رفتہ بہ تقریبی بہ سمع مبارک شاہزادۂ دانیال شاہ رسید۔ آن قدردان نکتہ سنجان از مدوی خواہش، نوعی را از مرزا یوسف خان گرفتہ داخل بساط بوستانِ محفلِ حشمت وشوکتِ خود گردانید۔'' ۱۲

یہیں اس کی شاعری کو چار چاند لگے۔ قصاید کہنے کا موقع ملا اور غزلیات اور رباعی میں بھی کمال حاصل کیا۔ جیسا کہ مآثر رحیمی میں ہے:

''ودر زمانی کہ شاھزادہ عالم عالمیان شاھزادہ دانیال در برہانپور تشریف داشتند، در برہان پور بسری بردند، شاھزادہ مومی الیہ راصحبت مولانای مذکور پسند افتادہ ودر ترقی وترتیب او کوشیدند،'' ۱۳

نوعی نے شہزادہ دانیال کی فرمائش پر جب ساقی نامہ پڑھ کر سنایا تو شہزادہ نے

خوش ہوکر ایک زنجیر فیل، دس ہزار روپیہ اور ایک عراقی گھوڑا بطور انعام عنایت کیا۔ چنانچہ رسمی قلندر نے اس شہزادے کی مدح میں لکھے گئے ایک قصیدے میں اس واقعہ کو بطور تلمیح نظم کیا ہے۔ مآثر رحمی میں یہ واقعہ اس طرح موجود ہے:

''بجائزہ۔ ساقی نامہ۔ یک زنجیر فیل ودہ ہزار روپیہ واسپ عراقی وسروپای لائقہ یافت۔ چنانچہ رسمی قلندر در قصیدۂ کہ بمدح ایشان فرمودہ، اشارہ باین معنی نمود:'' ؎

ز نعمت تو بہ نوعی رسید آن مایہ	کہ یافت میر معزی ز نعمت سنجر
زگلبن املش صد چمن گل امید	شگفت تا کہ بمدح تو شد زبان آور[۱۴]

شراب نوشی کی زیادتی نے جب شاہزادہ دانیال کو مرض الموت میں مبتلا کیا اور ۱۰۱۳ھ میں اس کا انتقال ہوگیا تو نوعی نے ایک دل سوز مرثیہ تحریر کیا۔ ؎

تا آن گل شگفتہ شہید شراب شد دیر و چمن چو خانۂ عاشق خراب شد

تا او خراب بادہ شد، ارباب ذوق را	می در پیالہ خون شد و خون زہر ناب شد
باد خزان ز ترتیب او بوی جان گرفت	خاک لحد ز نکہت او مشک ناب شد
پس کز غمش بریشم طنبور خون گریست	چون برگ لالہ ناخن مطرب خضاب شد
دشمن گداز و دوست نواز از جہان برفت	احباب تلخکام و اجل کامیاب شد

شہزادہ دانیال کی وفات کے بعد نوعی عبد الرحیم خان خانان سے وابستہ ہوگیا اور تمام عمر اسی کی ملازمت میں بسر کی یہاں تک کہ ۱۰۱۹ھ میں قضا کی آغوش میں ہوگیا۔

شاہ نواز خان نے تحریر کیا ہے:

''در زمان اکبر بادشاہ در خدمت شاہزادہ دانیال وعبد الرحیم خان خانان بسر می برد۔''[۱۵]

نتائج الافکار میں بھی اس طرح تحریر ہے:

''در بدایت حال بشاہزادہ دانیال بن اکبر بادشاہ توسل بہم رسانیدہ۔ و مادام حیاتش بجمعیت خاطر و اعتبار تمامتر گذرانیدہ۔ پس از اں بظل رافت

خانخانان درآمد۔'' ١٦

اور شمع انجمن میں ہے۔

''بعد انتقال شاہزادہ دانیال بعروۂ دولت خان خانان نسبت نمود۔''

اور روز روشن نے اس واقعہ کو درج کیا ہے۔ ١٧

''وبعد وفات شاہزادہ دامن دولت خانخانان مستحکم گرفت۔ تا آنکہ در سنہ تسیع عشر والف (١٠١٩ھ) در برہان پور از ین بیان رفت''

لیکن میخانہ میں وفات کا سال ١٠١٨ھ لکھا ہے۔ ١٨

''بعد از حیات شاھزادۂ دانیال باقی عمر خود صرف خدمت نواب سپہ سالار خان خانان کرد۔ ودر چہل ونہ سالگی در برہان پور سنہ ثمان عشر والف (١٠١٨ھ) پیمانۂ عمرش پُر شد۔ قدم در ملک خموشان نہاد۔'' ١٩

ملا عبدالنبی کے علاوہ تمام تذکرے نگار نوعی کی وفات ١٠١٩ھ میں ہی مانتے ہیں۔

نوعی خبوشانی نے قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی غرض کہ ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن اس کی شہرت ساقی نامہ اور سوز وگداز جیسی مثنویات کی بدولت ہے۔ جیسا کہ تحریر کیا جاچکا ہے کہ اس مثنوی پر اسے کافی انعامات سے نوازا گیا تھا۔ لیکن اس کی دوسری مثنوی کی اہمیت اس کی حقیقت کو جاننے کے بعد اور بڑھ جاتی ہے وہ رسم جسے ''ستی پرتھا'' کہا جاتا تھا اور جسے راجہ رام موہن رائے نے انگریزوں کی مدد سے ختم کروادیا تھا۔ یہ ایک نہایت دلسوز اور انسانیت کے چہرے پر داغدار رسم تھی جس میں پہلی ہنود کی عورتیں اپنے خاوند کے انتقال کے بعد جوش محبت میں خود کو اس کی چتا کے ساتھ جلادیا کرتی تھیں۔ خود اکبر بادشاہ نے بھی اس رسم کو روکنے کے لئے ناکام کوشش کی تھی۔ مندرجہ بالا مثنوی کو لکھنے کی وجہ روز روشن میں اس طرح تحریر ہے۔

''سوز وگداز۔ کہ در شہر لاہور یا اکبرآباد حسب ایمای شاھزادہ دانیال در قضیہ ستی شدن۔ یعنی سوختن زن ھندوی باندش شوہر خودش، بوجہ کمال تعشق حسب رسم ورواج ملک ھندو، نہ باز ماندش ازان باوجود ممانعت اکبری،

وتمتع بانواع ناز ونعیم دینوی۔'' ۲۰؎

اور سروآزاد میں اس قصہ کو یوں بیان کیا ہے:

''در عہد اکبر بادشاہ، نوجوان ھندوی شب طوی خود اکبر آباد از بازارِ مسقف می گذشت، قضارا سقف فرود آمد، نوجوان بر خاک ھلاک افتاد۔ عروس نامراد۔ کہ درنہایت رعنائی وکمال خوش سیمائی بود۔ بہ آئین خود قصد سوختن کرد۔ اکبر بادشاہ درحضور خود طلبید ھر چند منع نمودہ وامیدوار فراوان ناز ونعمت ساخت، زن بپائمردی ھمت از جان رفت وپروانہ وار خود را بر آتش زد۔ ۲۱؎

غرض کہ اُکبر کے زمانے میں ایک شخص جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی چھت کے نیچے آجانے کی وجہ سے ہلاک ہوگیا۔ اس کی بیوی نہایت خوبصورت اور دلکش تھی۔ جو جوش محبت میں اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل جانے کو بے چین تھی، اُکبر بادشاہ نے اسے بلایا، سمجھایا اور لالچ بھی دیا اور اسے زندگی بھر کوئی پریشانی نہ ہوگی لیکن اس نے ایک نہ سنی اور پروانے کی مانند اپنے شوہر کی نعش کے ساتھ خوشی سے نذر آتش ہوگئی۔

فارسی شاعری میں خسرو نے ہندوستانی تلمیحات سے اشعار کو سنوارنے کا کام کیا ہے۔ اکثر ہندوستانی روایتیں خسرو کے اشعار میں استعمال کی گئی ہیں۔ اس ستی پرتھا کی تلمیح کو بھی تشبیہ کی بندش میں سب سے پہلے خسرو نے اپنے اشعار میں باندھا ہے اس کے بعد یہ تشبیہات تلمیحات تقی اوحدی اور صاحب تبریزی کے اشعار میں بھی ملتی ہیں۔

خسرو ؂

خسروادر عشق بازی، کم ز ھندوزن مباش   کز برائی مردہ، سوز دزندہ جانی خویش را

تقی اوحدی ؂

ازان عاشق کہ ماند زندہ درھجران بود بہتر   اُن ہندو کہ خود را در وفا مردانہ می سوزد

صائب ؂

آتش عشق ز خاکستر ھندست بلند   زن درین شعلہ ستان برسر شوہر سوزد

چون زن ہندو کسی در عاشقی مردانہ نیست　　سوختن بر شمع کشتہ کار ھر پروانہ نیست

نوعی خبوشانی کی یہ مثنوی خمسہ نظامی کی مشہور مثنوی کی بحر مفاعی لن مفاعی لن فعولن بحر ھزج مسدس محذوب میں لکھی گئی ہے یہ بحر نہایت رواں دواں اور مثنوی نظم کرنے کے لئے بڑی موزوں بحر ہے۔

سوز وگداز تو اس قصے کی ہر کڑی میں موجود ہے، لہذا یہ مثنوی اپنے خارجی عوامل کی بنا پر بھی سوز وگداز کی متقاضی تھی لہذا اس کا نام ہی ''سوز وگداز'' رکھا گیا۔ اس مثنوی کی شہرت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب نول کشور لکھنؤ سے یہ مثنوی ۱۲۸۴ھ میں شائع ہوئی تو ۱۹۱۲ء میں آنند کمار نے انگریزی میں اس مثنوی کا ترجمہ کر کے لندن سے اسے شایع کرایا ہے۔ مثنوی کا آغاز:

الٰہی خندہ ام را تا گی دہ　　سر شکم را تگر پر کا گی دہ

سے کیا گیا ہے۔ مثنوی کے چند شعر اور ملاحظہ کیجیے۔

جوانی چون نسیم نوبہار است　　ولی بر برگ گل بوئے سوار است

اگر دریافتی بر دانشت بوس　　وگر غافل شدی، افسوس افسوس

درین دنیا کہ بوی خرمی نیست　　گیاھی بیوفائی ز آدمی نیست

چنان مستانہ بر آتش نظر کرد　　کہ از بدمستیش آتش حذر کن

جمال ناز را پیرا یہ نو کرد　　عبارت را تبسم پیشرو کرد

اس مثنوی کے علاوہ نوعی کے دو دیوان بشکل منظومہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں۔ جن میں ایک دیوان مکمل اور دوسرا قصاید کا مجموعہ ہے جس میں بارہ قصاید حضرت علیؑ، امام علی رضاؑ کے علاوہ اکبر اور شاہزادہ دانیال کی مدح میں موجود ہیں۔ دیوان کا ایک مخطوطہ کتابخانہ ملی ملک تہران اور ایک برطانیہ مع تصاویر کے محفوظ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مخطوطوں کی مدد سے ایک مکمل دیوان نوعی کی اشاعت ہوتا کہ فارسی ادب کا یہ گراں مایہ سرمایہ اہل نظر کی توجہ کا طالب ہے۔

مآخذ

(۱) شعر العجم جلد ۳ ص: ۷ شبلی نعمانی

(۲) ایضاً

(۳) عرفات ص: ۱۸ تقی اوحدی لائبریری محمد تقی علی عابدی

(۴) میخانہ ۔ ملا عبد النبی

(۵) مآثر رحیمی جلد ۳ ص: ۶۵۳ عبد الباقی نہاوندی

(۶) مرآۃ آفتاب نما ص: ۱۹۹ شاہنواز خاں

(۷) میخانہ (بانکی پور) عبد النبی

(۸) تاریخ نظم ونثر در ایران ص: ۴۳۴ نفیسی

(۹) منتخب التواریخ ص: ۳۶۲ ملا عبد القادر بدایونی

(۱۰) میخانہ عبد النبی

(۱۲،۱۱) ایضاً

(۱۴،۱۳) مآثر رحیمی ص: ۶۵۳ عبد الباقی نہاوندی

(۱۵) مآثر الامرا ص: ۳۱۴ شاہنواز

(۱۶) نہارنج الاخطار ص: ۱۲ ،۷ محمد قدرت اللہ گوپاموی

(۱۷) شمع انجمن

(۱۸) روز روشن ص: ۲۲،۷ مولوی مظفر حسین صبا

(۱۹) میخانہ عبد النبی

(۲۰) روز روشن ص: ۲۳،۷ مولوی مظفر حسین صبا

(۲۱) سرو آزاد ص: ۲۲ آزاد بلگرامی۔

۱۰

”عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصّہ“

سیرت وسوانح، تاریخ اور وقائع نگاری سے متعلق علمائے گجرات کی عربی تصانیف کا تذکرہ

- ڈاکٹر مقصود احمد ٭

(ایم ایس یونیورسٹی، بروڈہ)

”عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ“ ڈاکٹر زُبَید احمد صاحب[۱] کی تصنیفِ لطیف "The Contribution of India to Arabic Literature" کا اردو ترجمہ ہے۔ اردو ترجمے کے عنوان میں ”پاک وہند“ استعمال ہوا ہے، لیکن حقیقت میں کتابِ مذکور کے مباحث کا تعلق غیر منقسم ہندوستان سے ہے۔ اس وجہ سے، میرے خیال میں، ترجمے کا عنوان ”عربی ادبیات میں غیر منقسم ہندوستان کا حصہ“ ہونا چاہیے تھا۔ بہر کیف، مذکورہ کتاب میں عہدِ قدیم سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے عربی ادبیات کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور اس درمیان میں مختلف موضوعات پر تصنیف ہونے والی عربی کتب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مقالۂ ہذا میں سیرت وسوانح، تاریخ اور وقائع نگاری سے متعلق صرف ان کتابوں پر بحث کی جائے گی جو علمائے گجرات کی تصنیف کردہ ہیں۔ لیکن اصل موضوع سے تعرض کرنے سے پہلے ڈاکٹر صاحب اور ان کی قابلِ قدر تصنیف سے متعلق، بہ طور تعارف، چند سطریں سپردِ قلم کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق جیسا کہ حاشیہ نمبر ۱ کے تحت عرض کیا گیا، الٰہ آباد یونیورسٹی

٭ ریڈر، شعبۂ عربی (فیکلٹی آف آرٹس)، بڑودہ یونیورسٹی، وڈودرا-۳۹۰۰۰۲، گجرات

کے شعبۂ عربی وفارسی سے تھا۔ موصوف دونوں زبانوں کے لائق وفائق استاد تھے۔ آپ نے ۱۹۲۹ء میں لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور آپ کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا: "The Contribution of India to Arabic Literature"

اس مقالے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے ممتحنین میں کیمبرج یونیورسٹی کے مایۂ ناز پروفیسر نکلسن (Nicholson) بھی شامل تھے، جنہیں "A Literary History of the Arabs" جیسی مشہور و معروف کتاب کے مصنف ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کر کے ڈاکٹر صاحب قبلہ ہندوستان واپس آ گئے اور یہاں آنے کے بعد ان کے دل میں مقالۂ مذکور کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا داعیہ پیدا ہوا۔ مگر اس سلسلے میں عجلت سے کام لینے کے بجائے آپ نے اپنے مقالے پر نظرِ ثانی کرنا ضروری سمجھا اور اس اہم فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے بعد ہی اس کی طباعت کی طرف متوجہ ہوئے۔ لیکن افسوس کہ گونا گوں مشکلات اور اسباب کی وجہ سے اس کی فوری طباعت واشاعت ممکن نہ ہو سکی اور اس میں غیر معمولی تاخیر ہوتی گئی۔ من جملہ دیگر اسباب کے اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کو آکسفورڈ کے پروفیسر گب (Gibb) کے پیش لفظ سے مزین کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کی وجہ سے مسودے کو انگلینڈ بھیجنا ممکن نہ تھا۔ یہ اس وقت ممکن ہو سکا جب کہ حالات قدرے بہتر ہو گئے۔ حالات کی بہتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے مسودے کو پروفیسر گب کی خدمت میں بھیج کر ان سے پیش لفظ لکھنے کی درخواست کی۔ موصوف نے ڈاکٹر صاحب کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا اور ۴؍ستمبر ۱۹۴۵ء کو پیش لفظ لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کی تمنا بر آئی اور ایک رکاوٹ دور ہو گئی۔ تاخیر کا دوسرا اہم سبب یہ تھا کہ عربی کتب و مصنفین کے ناموں کو صحیح تلفظ کے ساتھ انگریزی کے مروجہ رسم الخط میں لکھنا تقریباً ناممکن تھا، کیوں کہ اس کے لیے خاص علامات والے حروف درکار تھے، جو الہ آباد میں عنقا تھے اور جن کی فراہمی جوئے شیر لانے کے مرادف تھی۔ اس کے باوجود،

ڈاکٹر صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور حتی المقدور سعیِ پیہم فرماتے رہے۔ لیکن جب پریس والوں نے اس سلسلے میں کچھ مدد کرنے سے معذوری ظاہر کر دی اور موصوف کو صاف جواب دے دیا، تو چاروناچار انھوں نے خود ہی اس کا انتظام کیا اور کتاب کو ۱۹۴۶ء میں پروفیسر گِب کے پیش لفظ کے ساتھ چھپوا کر ہی دم لیا۔

خدا خدا کر کے کتاب تو چھپ گئی، جس کا عنوان تحقیقی مقالے کے عین مطابق تھا۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو مالی پریشانیوں نے آگھیرا، جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ تھا، اور وہ یہ کہ کتاب کی زیادہ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوں۔ لیکن ایسی علمی وادبی کتابوں کا "Hote Cake" ثابت ہونا کم از کم غیر منقسم ہندوستان میں ایک ناممکن امر تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود بھی کوئی اقدام کرنے سے قاصر تھے کہ کتب فروشی اور اس کے لوازمات سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ چناں چہ، ان کو اپنے عزیز دوست، پروفیسر عبد الباسط، کی مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ پروفیسر موصوف نے دستِ تعاون دراز کرنے سے گریز نہیں کیا اور ڈاکٹر صاحب کی ہر ممکن مدد کی۔ پھر کیا تھا، پروفیسر صاحب کی مساعیِ جمیلہ کے طفیل، مکتبۂ دین ودانش، جالندھر، کے مالک جناب منوّر علی شاہ نے پورا اسٹاک خرید کر جملہ حقوق حاصل کر لیے اور اس کے بعد اس کی فروخت شروع کر دی۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کی مشکل تو آسان ہوگئی اور ان کو کربِ مسلسل سے نجات بھی مل گئی، لیکن شاہ صاحب کو یہ سودا بہت مہنگا پڑا۔ ہوا یہ کہ ابھی کتابِ مذکور کی کوئی دو سو کاپیاں ہی نکل پائی تھیں کہ ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی اور مشرقی پنجاب میں فسادات وآتش زنی کا بازار گرم ہوگیا، جس کے نتیجے میں مکتبۂ دین ودانش کا پورا ذخیرہ جل کر خاک ہوگیا۔

اس افسوس ناک حادثے کے کوئی چار سال بعد یعنی ۱۹۵۰ء میں منوّر علی شاہ صاحب کی اجازت سے اس کا دوسرا اڈیشن لاہور سے شائع کیا گیا۔ مگر اس بار اس کے عنوان میں قدرے تبدیلی کر دی گئی اور اس میں ''انڈیا'' کے ساتھ لفظِ ''پاکستان'' کا اضافہ کر کے اس کو یوں کر دیا گیا[۲]:

"The Contribution of India and Pakistan to Arabic Literature"

بعد ازاں، شاہ صاحب موصوف ہی کی اجازت سے شاہد حسین رزاقی صاحب نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا، جو ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصّہ'' کے عنوان سے پہلی بار لاہور سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا اور اس کی طباعت واشاعت کی سعادت ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، کو نصیب ہوئی۔ ترجمۂ مذکور دوسری بار ۱۹۸۷ء میں لاہور ہی سے اشاعت پذیر ہوا اور اس کی اشاعت کا فریضہ اس بار بھی ادارۂ ثقافت اسلامیہ ہی نے انجام دیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، کتابِ ہٰذا میں عہدِ قدیم سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے عربی ادبیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان میں عربی اگرچہ عام بول چال کی زبان کبھی نہیں رہی، تاہم قرآن وحدیث کی زبان ہونے کی بنا پر عربی زبان اور عربی علوم کو یہاں ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل رہا اور ان کے درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یہی نہیں، بلکہ مختلف موضوعات پر عربی میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی گئیں۔ لیکن، جیسا کہ شاہد حسین رزاقی تحریر فرماتے ہیں، کئی اسباب کی وجہ سے ان کے متعلق نہ صرف عوام، بلکہ علما و محققین کی معلومات بھی محدود رہیں اور عربی ادبیات کی تاریخوں میں ان کا مناسب طور پر ذکر نہیں کیا جا سکا۔ اور اس طرح عربی ادبیات کے ایک اہم گوشے پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہا۔ نامور جرمن مستشرق، بروکلمن، پہلا شخص ہے جس نے اپنی گراں قدر تصنیف ''تاریخِ عربی ادبیات'' (Geshichte der Arabishen Literature) میں مختلف زبانوں میں برِ عظیم پاک وہند (بل کہ غیر منقسم ہندوستان) کے عربی ادب سے متعلق ایک الگ باب قلم بند کر کے علمی دنیا کو یہاں کی عربی تصانیف سے روشناس کرایا۔ لیکن یہ باب بہت مختصر اور نامکمل تھا اور بروکلمن کے بعد کسی مصنف نے جغرافی ترتیب کو ملحوظ رکھ کر عربی ادبیات کی تاریخ نہیں لکھی اور اس برِ عظیم (کذا) کے عربی ادب سے متعلق معلومات بروکلمن کے فراہم کردہ مواد تک ہی محدود رہیں۔ اس طرح عربی ادبیات کی تاریخ میں ایک خلا باقی رہا۔ یہ بہت بڑی کمی تھی جو ڈاکٹر زبید احمد نے پوری کر دی اور بہ قولِ پروفیسر گب (Gibb)، انھوں نے یہ کتاب لکھ کر ایک بیش بہا علمی خدمت انجام دی ہے، جس سے عربی ادبیات کا ایک گوشہ جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھا، بہ خوبی روشن

ہو گیا ہے۔''۳؎

زیرِ بحث کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے ادبیات سے اس کا عام مفہوم مراد لیا ہے، جس میں تمام اقسام کی علمی وادبی تصانیف شامل ہیں۔ جہاں تک ہندی تصانیف کا تعلق ہے، اس کے زمرے میں ایسی تمام عربی کتب کو شامل کر لیا گیا ہے جو ہندستانیوں کے ذریعے اندرونِ ہند یا بیرونِ ہند تصنیف کی گئیں۔ علاوہ ازیں، اس میں ان تصانیف کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جنھیں غیر ہندیوں نے اپنے زمانۂ قیامِ ہند میں ہندی علما کی تصنیفات سے استفادہ کر کے لکھا تھا، اور اس کارِ خیر کی انجام دہی میں ان کو یہاں کے وسیع القلب حکمرانوں کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس کی ایک نمایاں مثال البیرونی کی ہے۔ اپنے اس حقیقت پسندانہ موقف کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ:

> ''البیرونی کی کتاب الھند اور اس نوعیت کی دوسری کتابوں کو بھی عربی ادب میں ہند کا حصہ شمار کرنا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ چند مشہور عربی مصنّفوں نے اس کتاب کے مصنف کو سندھ کا باشندہ مان لیا ہے، بل کہ اس لیے کہ ان کتابوں کا سارا مواد ہند سے حاصل کیا گیا ہے۔ البیرونی کا ہند سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ یہاں عربی میں لکھی جانے والی کتابوں کے بیان میں اس کو نظرانداز کر دینے کا خیال تک ہی نہیں کیا جا سکتا۔ علم الھیئت اور علم الحساب کے ایک زبردست عالم و محقق کی حیثیت سے بیرونی (کذا) نے بڑی شہرت پائی ہے اور اس میں ہندی علما کی ان تصانیف کا بھی دخل ہے جن سے البیرونی نے استفادہ کیا تھا۔ اسلامی ہند کے پہلے سلطان اور ان کے بیٹے نے البیرونی کی جو سرپرستی کی اور غزنوی سلاطین نے ان کو جو سہولتیں بہم پہنچائیں ان کی اہمیت یقیناً مسلّمہ ہے، تاہم ہندی علوم کی حد تک ہندی عالموں اور معلّموں کا جو احسان ہے اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا''۔۴؎

لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بیرونِ ہند پیدا ہونے والے اور وہیں بود و باش اختیار کر لینے والے ہندی الاصل علما کے تصنیفی کارناموں کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلے میں قطب الدین محمد بن علاء الدین احمد النہروالی کی دو کتابوں ''الاعلام باعلام بیت الحرام'' اور ''البرق الیمانی فی الفتح العثمانی'' کو بہ طورِ مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔ کتابِ اوّل مکۂ معظمہ کی مفصّل تاریخ ہے، جو ایک مقدمہ، دس ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ ثانی الذکر دسویں صدی ہجری کے آغاز سے ۹۷۸ھ تک یمن میں ہونے والے واقعات کی تاریخ ہے، جو تین ابواب اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ ۵

ان دونوں کتابوں کے مصنف، قطب الدین، کی پیدائش ۱۵۱۱ء میں مکۂ مکرمہ میں ہوئی، جہاں ان کے والد نے وطن سے ہجرت کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ موصوف نے ابتدائی تعلیم مکۂ معظمہ میں حاصل کی اور اس کے بعد ۱۵۳۶ء میں مصر تشریف لے گئے، جہاں انھوں نے نامور اور مقتدر علما سے اکتسابِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد، آپ مکہ شریف واپس آ گئے اور یہاں کے ایک دینی مدرسے سے منسلک ہو گئے۔ آپ کو مفتی ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ بالآخر آپ نے مکہ ہی میں ۱۵۸۲ء میں وفات پائی۔ ۶

ڈاکٹر صاحب نے اپنی گراں مایہ تصنیف کو، جو علامہ شبلی کے نام معنون ہے، دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ حصّۂ اوّل، مقدمہ اور ۱۱۲ ابواب پر مشتمل ہے اور اسے اصل کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ اس حصّے میں ہندوستان میں عربی ادبیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور غزنوی دور سے قبل کے عربی ادب میں ہندستان کا حصّہ، تفاسیرِ قرآن، علومِ حدیث، علومِ فقہ، تصوف اور اخلاقیات، علم الکلام، فلسفہ، علم الحساب وعلم الہیئت، علمِ طب، تاریخ وسوانح اور جغرافیہ، علم اللسان، مرصّع نثر اور ادبِ لطیف نیز شاعری بہ طورِ خاص بحث کی گئی ہے۔

حصّۂ دوم میں ان تمام عربی تصنیفات کی فہرست درج ہے، جو ہند میں تصنیف ہوئیں یا پھر دیگر ممالک میں سکونت پذیر ہونے والے ہندیوں کی تصنیف کردہ ہیں۔

کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی منسلک ہے، جس میں اسماے کتب اور اسماے مصنفین حروفِ تہجی کے لحاظ سے مندرج ہیں۔

تعارف سے عہد برآ ہونے کے بعد، اب اصل موضوع (یعنی زیرِ بحث کتاب میں سیرت وسوانح، تاریخ اور وقائع نگاری سے متعلق علمائے گجرات کی عربی تصانیف کا تذکرہ) کی جانب مراجعت کی جاتی ہے۔ مذکورہ کتاب میں ہمارے اختیار کردہ موضوع کے تحت آنے والی صرف ۱۱ تصانیف اور ایک ضمیمے کا ذکر آیا ہے۔ ان میں ۸ (۴+۴) کا تعلق سیرت وسوانح سے ہے، ایک تاریخ سے متعلق ہے اور دو (مکمل کتاب+ضمیمہ) وقائع نگاری کے زمرے میں آتی ہیں۔ سیرت کے تحت جن کتابوں کا تذکرہ آیا ہے، ان میں سے ۳ کے بارے میں کوئی تفصیل فراہم نہیں کی گئی، بل کہ فقط ان کے عنوانات کے اندراج پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ہاں، باقی ماندہ ایک کتاب کی بابت چند سطریں ضرور قلم بند کی گئی ہیں، مگر ان کی حیثیت محض تعارفی نوٹ کی ہے۔ جن کتابوں کے صرف نام درج کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: ''المنتخب المصطفیٰ من اخبار مولد المصطفیٰ'' (برلن ۹۶۳۵)، ''مولد النبی'' (بنگال ۱۰۲۵) اور ''کتاب المنہاج الی معرفۃ المعراج'' (برلن ۲۶۰۹)۔ حاشیے میں ڈاکٹر صاحب نے اوّل الذکر دونوں کتابوں کو ایک ہی تصنیف ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے، اور یہ صحیح بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن موصوف کے اندازِ تحریر سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ان کو ان کتابوں کے دیکھنے کا براہِ راست موقع نہیں ملا، اور ان کی یہ رائے محض قیاس پر مبنی ہے۔[۷]

جہاں تک سیرت سے وابستہ اس تصنیف کا تعلق ہے جس کی نسبت چند سطریں تحریر کی گئی ہیں، اس کا عنوان ''اتحاف الحضرۃ العزیزۃ لعیون السیرۃ الوجیزۃ'' (برلن ۹۶۶۰) ہے۔ مذکورۂ بالا سبھی کتابوں کے مصنف کا نام نامی ابوبکر محی الدین عبد القادر العیدروس احمد آبادی ہے۔ موصوفِ محترم کا تعلق یمن کے اعلیٰ خاندان عیدروس سے تھا۔ آپ کے والد ماجد ۹۵۸ھ میں یمن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور عروس البلاد، احمد آباد، میں اقامت گزیں ہوگئے۔ آپ کی پیدائش اسی شہر میں ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں ہوئی۔ آپ کی والدہ ایک ہندوستانی کنیز تھیں جنھیں ان کے والد کو ان کے کسی مرید نے پیش کیا تھا۔ آپ کو ہند و یمن کے لائق اور نامی گرامی علمائے کرام سے اکتسابِ علم کا سنہرا موقع ملا، جس کے نتیجے میں آپ کے اندر عالمانہ شان پیدا ہوگئی۔ اس کے علاوہ آپ کو اپنے وقت

کے صوفیۂ عظام سے فیض یاب ہونے کی سعادت بھی نصیب ہوئی، جس کی وجہ سے آپ ایک ممتاز اور باوقار صوفی بن گئے۔ اس طرح آپ علم اور تصوف دونوں کے جامع قرار پائے۔۸؎ مجاہدۂ وریاضت اور تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ آپ تصنیف وتالیف میں بھی مصروف رہے اور مختلف موضوعات پر آپ نے قریب بیس (بل کہ اس سے بھی زیادہ) کتابیں تصنیف کیں، جوسب کی سب عربی میں ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں ہوا۔۱۰؎

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، ''اتحاف الحضرۃ العزیزۃ لعیون السیرۃ الوجیزۃ'' کا تعلق سیرتِ پاک سے ہے۔ ڈاکٹر زبید صاحب کی صراحت کے مطابق، اس میں سرورِ کونین صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ مبارکہ کے علاوہ، آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اصحابِ کرام کے مختصر حالات بھی مندرج ہیں۔ یہ دو حصّوں اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ پہلے حصّے میں چار ابواب ہیں، جن میں آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ سے متعلق تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔ دوسرا حصہ دس ابواب پر محتوی ہے، جن میں عشرۂ مبشرہ (دنیا ہی میں جنت کی بشارت سے سرفراز ہونے والے دس بلند مرتبہ اصحابِ رسولؐ) کے مختصر سوانح مرقوم ہیں۔ رہا خاتمہ، تو اس میں نبیِ آخرالزّماں صلّی اللہ علیہ وسلّم کے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے فضائل ومناقب قلم بند کیے گئے ہیں۔۱۱؎

ڈاکٹر صاحب کے بہ قول، کتابِ ہٰذا کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اندازِ بیان سادہ اور واضح ہے اور اس میں وہ غیر تاریخی چیزیں موجود نہیں ہیں جو صوفیہ کی تحریروں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں۔۱۲؎

سوانح کے ذیل میں صرف ایک کتاب کی بابت چند سطری تعارف رقم کیا گیا ہے، جس کا عنوان ''الروض الناضر فی من اسمہ عبد القادر'' (برلن ۹۸۹۰) ہے۔ یہ بھی محی الدین عبدالقادر العیدروس کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر زبید صاحب کے بیان کے بہ موجب، اس میں ایسے چالیس مشہور اشخاص کے مختصر حالات قلم بند کیے گئے ہیں جن کا نام عبد القادر ہے۔ موصوف نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ان کی معلومات کی حد تک، یہ اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

ہے۔[۱۳]

زیرِ بحث کتاب کے حصۂ دوم میں محی الدین عبدالقادر صاحب کی ایک تصنیف کا عنوان ''الرسالۃ فی مناقب البخاری'' (بوہار، ۴۵۴) مرقوم ہے۔ یہ بھی سوانح سے متعلق معلوم ہوتی ہے (دیکھیے ص ۳۹۱)۔ اسی طرح دو تصانیف کو خود نوشت سوانح عمری بتایا گیا ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ الفتوحات القدوسیۃ فی الخرقۃ العیدروسیۃ

۲۔ الروض العریض والفیض المستفیض۔ (دیکھیے صفحہ ۳۲۶)

تاریخ کے موضوع پر صرف ایک کتاب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس کا عنوان ''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' ہے۔ اس کے مصنف کا نام عبداللہ محمد بن عمر النہروالی الآصفی الغ خانی معروف بہ حاجی دبیر ہے۔ کتابِ ہٰذا اور اس کے مصنف کے بارے میں ڈاکٹر زبید صاحب نے حسبِ ذیل تفصیل فراہم کی ہے:

''اس (ظفر الوالہ بمظفر وآلہ) کے مصنف عبداللہ بن عمر النہروالی الآصفی الغ خانی ہیں، جو حاجی دبیر کے نام سے زیادہ معروف ہیں۔ ان کا زمانۂ حیات دسویں صدی ہجری کا آخری اور گیارہویں کا ابتدائی حصہ تھا۔ مصنف ۹۴۶ھ (۱۵۴۰ء) کے قریب مکۂ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) میں جب ان کی عمر سولہ سال تھی وہ پہلی مرتبہ ہندستان آئے۔ اس کے تین سال بعد وہ اپنے پہلے آقا محمد الغ خاں حبشی کی ملازمت میں داخل ہو گئے، جو گجرات کا ایک ممتاز امیر تھا اور عماد الملک سے منسلک تھا۔ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں جب اکبر احمد آباد میں داخل ہوا، تو الغ خاں کے قید ہو جانے کی وجہ سے مصنف بے روزگار ہو گئے۔ لیکن ایک سال بعد گجرات سے وقف کا روپیہ مکہ معظمہ اور مدینۂ منورہ لے جانے کا کام ان کو تفویض کر دیا گیا۔ ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں وہ ہندستان واپس آئے اور گجرات کے ایک اور امیر سیف الملک کی ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد، وہ خاندیش کے ایک ممتاز امیر، فولاد خاں، کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ان کی صحیح تاریخ وفات کا علم نہیں، تاہم یہ معلوم ہے کہ ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) میں وہ بہ قیدِ حیات تھے۔''[۱۴]

ذرا آگے ڈاکٹر صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں کہ:

''سر ڈینی سن راس (Sir Denison Ross) نے ایک جگہ مصنف کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر چہ وہ اصلاً ہندی-ایرانی تھے اور ان کے اجداد تیرہویں صدی میں تاتاری حملے کے زمانے میں ایران سے بھاگ کر ہندوستان آئے تھے، مگر ان کی مادری زبان عربی تھی اور ہندستان آنے کے کچھ عرصے بعد انھوں نے فارسی سیکھی تھی۔'' ۱۵؎

''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' کا تعارف کراتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں کہ:

''یہ کتاب دو دفتروں میں منقسم ہے۔ دفترِ اوّل کا تعلق گجرات کے مظفری سلاطین سے ہے، جنھوں نے ۷۹۹ھ سے ۹۸۰ھ (۱۳۹۶ء تا ۱۵۷۲ء) تک حکومت کی۔ اس دفتر میں خاندیش اور دکن کے حکمرانوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ دفترِ دوم میں ان مختلف حکمران خاندانوں کی مختصر تاریخ قلم بند کی گئی ہے، جنھوں نے بارہوی صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک شمالی ہند پر حکومت کی تھی۔ مشہور مستشرق، پروفیسر ڈینی سن راس، نے اس کتاب کی اہمیت کو سب سے پہلے محسوس کیا اور اس کو مرتب کر دیا۔ یہ اڈیشن تین جلدوں پر مشتمل ہے اور ہر جلد میں ایک عالمانہ مقدمہ بھی شامل ہے۔'' ۱۶؎

ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں کہ:

''فاضل مرتّب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب صرف بادشاہوں کے حالات تک محدود نہیں، اور اس کی اہمیت اس سے بڑھ کر ہے۔ پہلی جلد کا بڑا حصّہ تاریخی، سوانحی اور کتابیاتی اضافوں پر مشتمل ہے، جو پڑھنے والوں کو ایک طرف تو اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ کی طرف پیچھے اور دوسری طرف سترہویں صدی کے آغاز کی تاریخ تک آگے لے جاتے ہیں۔'' ۱۷؎

آخر میں زیرِ بحث کتاب کی دو نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سر ڈینی سن راس ہی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''اس..... میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ ایک تو اس کی زبان کا اسلوب جس سے بعض جگہ تحریر میں بے احتیاطی کے باوجود، یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مکہ میں پیدا ہونے

اور پرورش پانے والے شخص کی عربی ہے۔ اور دوسرے ہندی اور فارسی ناموں کا صحیح تلفظ، کیوں کہ بدیسی ہونے کی وجہ سے مصنف نے اس بات کا بہت خیال رکھا ہے کہ سب نام بالکل صحیح اور واضح طور پر لکھے جائیں۔'' ۱۸

ڈاکٹر صاحب نے معارف، اعظم گڑھ، (جلد ۱۸، ص ۳۳۵) کے حوالے سے اس کے دو مخطوطوں کی نشان دہی کی ہے اور ایک کو تو کلکتے میں موجود بتایا ہے اور دوسرے کو کتب خانہ عارف بے، مدینۂ منورہ، کی زینت قرار دیا ہے۔ ۱۹

''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' اور اس کے مصنف سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی فراہم کردہ تفصیلات تشنہ معلوم ہوتی ہیں اور ان میں جگہ بہ جگہ خلا بھی پایا جاتا ہے۔ کتابِ مذکور کے انگریزی ترجمہ ۲۰، جلدِ اول کے آغاز میں "Life of Haji Dabir" کے تحت ہر دو کی بابت خاصی معلومات بہم پہنچائی گئی ہے، جس کی مدد سے ڈاکٹر صاحب کی فراہم کردہ تفصیلات میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان میں پائے جانے والے خلا کو بھی بڑی حد تک پُر کیا جاسکتا ہے۔ خلاصۂ معلومات کچھ یوں ہے:

مورخ کا نام عبداللہ محمد المکی الآصفی الالغ خانی حاجی دبیر تھا۔ ان کے والد ماجد کا نامِ نامی سراج الدین عمر النہروالی تھا اور ان کا شجرۂ نسب یہ تھا: عبداللہ محمد بن سراج الدین عمر بن کمال الدین محمد بن فرید الدین محمد بن حسین بن قاسم۔ سراج الدین عمر النہروالی کے آبا واجداد کا تعلق ایران سے تھا۔ انھوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں اور منگولوں کی یلغار سے مامون ومصون رہنے کے لیے ایران سے ہجرت کر کے ملتان اور سندھ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۳۹۸ء میں تیمور کے دہلی میں داخلے کے بعد، سراج الدین کے جدِّ اعلیٰ، مولانا قاسم، اپنے اعزہ واقارب کے ساتھ گجرات چلے آئے اور پٹن (حالیہ پاٹن) میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے۔ گجرات اس وقت مظفری سلطنت کے بانی، ظفر خاں، کے زیرِ نگیں تھا اور یہاں امن اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ مولانا قاسم صاحب کو پٹن کی پرامن اور سکوں بخش فضا اس درجہ پسند آئی کہ وہ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ چودہوی صدی عیسوی کے آخری دو سال اور پوری پندرہویں صدی عیسوی دیکھتے دیکھتے گزر گئی اور سولہویں صدی

عیسوی کا سورج طلوع ہوگیا۔ اسی صدی کے اوائل میں سراج الدین کی ولادت عمل میں آئی۔

سراج الدین ابھی کم سن ہی تھے کہ سلطان مظفر دوم (۱۵۱۱ء-۱۵۲۵ء) کے عہدِ حکومت میں شمس الدین محمد ملقب بہ حامد الملک واردِ پٹن ہوئے اور انھوں نے یہیں بودوباش اختیار کرلی۔ یہاں ان کے اور سراج الدین کے والد بزرگوار کے مابین خوشگوار تعلقات استوار ہوگئے۔ دوسری طرف، خود سراج الدین اور حامد الملک کے صاحب زادے، ابوالقاسم عبدالعزیز معروف بہ آصف خاں (۱۵۰۳ء-۱۵۵۵ء) کے درمیان بھی پر خلوص دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔ آصف خاں بہت ہونہار تھا۔ اس نے ۱۹۳۰ء میں Wagher یا Bakher کے خلاف ایک مہم کی قیادت کی اور بہادر شاہ کے عہد میں وزیر کے عہدے پر فائز ہوگیا۔ ۱۵۳۵ء میں جب ہمایوں اور بہادر شاہ کے تعلقات کشیدہ ہوگئے اور جنگ کے بادل منڈلانے لگے، تو ثانی الذکر نے احتیاطی تدبیر کے تحت اپنے حرم اور خزانے کو اپنے باوفا وزیر کی زیرِ نگرانی مکہ روانہ کردیا۔ آصف خاں اپنے ہمراہ اپنے ذاتی اثاثے کے ساتھ ساتھ اپنے وکیل (Major Domo)، سراج الدین کو بھی لے گیا۔

الغرض، توقع کے عین مطابق، ہمایوں اور بادشاہ کے درمیان جنگ ہوئی، جس میں موخر الذکر کو شرم ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے ساتھ ہی اس کو اقتدار سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ لیکن ایک سال کے اندر اندر وہ دوبارہ سریر آرائے سلطنت ہوگیا۔ افسوس کہ اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد، پرتگالیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بہادر دیو (Div) میں غرقاب ہوگیا۔ یہ حادثہ ۱۵۳۶ء میں پیش آیا۔

جس وقت بہادر کا انتقال ہوا اس وقت آصف خاں مصر میں تھا اور بہادر کے حرم اور اس کے متعلقات سراج الدین کی زیرِ نگرانی مکے میں تھے۔ جب یہ اندوہ ناک خبر مصر پہنچی، تو خسرو پاشا نے، جو سلطان عثمان کی جانب سے مصر، حجاز اور یمن کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، امینِ جدّہ کی خدمت میں اس حکم کے ساتھ ایک قاصد کو روانہ کیا کہ بہادر کے حرم اور خزانے کو فوراً ضبط کرلیا جائے۔ یہ جان کر آصف خان کو تشویش لاحق ہوئی اور اس نے اپنے

اثر ورسوخ کو بہ روے کار لاکر اس حکم کو منسوخ کرایا۔ ادھر سراج الدین کو بھی اس نے ایک خط کے ذریعے تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ سراج الدین نے اس خط کو امینِ جدّہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امینِ مذکور نے اس کو قاضی القضاۃ اور امین البیت کے حوالے کر دیا۔ اس پر کافی غور وخوض اور ہر طرح سے اطمینان حاصل کرنے کے بعد، قاضی نے منبر پر چڑھ کر حاضرین کے رُو بہ رُو اس کو پڑھ دیا اور مجلس برخاست ہوگئی۔

مکے میں ایک عرصے تک قیام کرنے کے بعد، ۱۵۴۸ء میں آصف خاں تنِ تنہا ہندستان واپس آ گیا اور اس کے افرادِ خانہ سراج الدین کی زیرِ نگرانی مکے ہی میں سکونت پذیر رہے۔ آصف خاں پہلے منگلور پہنچا پھر اس کے بعد وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہوا، جہاں سلطان محمودِ ثالث اس کا منتظر تھا۔ چوں کہ آصف خاں کی واپسی سلطانِ مذکور ہی کے اصرار پر ہوئی تھی، اس لیے اس کو اس سے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اس کی خوشی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آصف خاں احمد آباد پہنچ کر دربار میں حاضر ہوا، تو سلطان نے اپنے تخت سے اتر کر اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ بعد ازاں، اس نے گجرات میں نظم ونسق کی بحالی کی ذمے داری آصف خاں کے سپرد کر دی۔ آصف خاں نے اس سلسلے میں جو اقدامات کیے، ان میں اس کو کامیابی نصیب ہوئی، جس کے نتیجے میں گجرات میں دوبارہ امن وامان قائم ہو گیا اور سلطان کے اقتدار کو بھی استحکام حاصل ہو گیا۔ لیکن ابھی مشکل سے سات سال ہی گزرے تھے کہ ۱۵۵۵ء میں سلطان محمود ثالث اور آصف خاں دونوں قتل کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا، یعنی گجرات کا نظام ایک بار پھر درہم برہم ہو گیا اور یہ سلسلہ ۱۵۷۲ء میں احمد آباد میں اکبر کے فاتحانہ دخول تک قائم رہا۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ ۱۵۳۵ء میں آصف خاں کے ہمراہ سراج الدین بھی عازمِ مکہ ہوئے اور اول الذکر کی ہندستان واپسی کے بعد بھی وہ وہیں مقیم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہاں ۹۴۶ھ (۱۵۳۹ء) ۲۱ میں اولادِ نرینہ سے نوازا، جس کا اصل نام عبد اللہ محمد المکی تھا۔ صاحبزادے کی تعلیم وتربیت مکے ہی میں ہوئی۔ موصوف ۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) میں تقریباً سولہ سال کی عمر میں اپنے والدِ ماجد، سراج الدین عمر النہروالی کے ساتھ ہندستان آئے اور گجرات

کے مشہور شہر، احمد آباد، میں آباد ہو گئے۔ تین سال بعد، محمد الغ خاں حبشی کی ملازمت میں دبیر (Scribe) کی حیثیت سے داخل ہو گئے اور حاجی دبیر کہلائے۔ محمد الغ خاں یوں تو عماد الملک کے تابع تھا، لیکن ۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) میں جب عماد الملک اور اعتماد خاں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئے، تو اس نے عماد الملک کا ساتھ چھوڑ کر اعتماد خاں سے وابستگی اختیار کر لی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ حاجی دبیر، الغ خاں سے کنارہ کش ہو گئے۔ انھوں نے کنارہ کشی تو اختیار کر لی، مگر اس پر بہت دنوں تک قائم نہیں رہ سکے اور اپنے آقائے اوّل سے دوبارہ منسلک ہو گئے۔ ۹۶۷ھ (۱۵۵۹ء) میں انھوں نے معرکۂ بڑودہ میں حصّہ لیا اور اس میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے سرخ روئی حاصل کی۔ اس کے صلے میں ان کے آقا نے انھیں بڑودہ کے قریب واقع بسکر اور عالم پور نام کے دو گانو بہ طورِ عطیہ عنایت کر دیے۔ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں جب اکبر احمد آباد میں فاتحانہ داخل ہوا، تو اس نے الغ خاں کو قید کر لیا، جس کی وجہ سے حاجی دبیر بے روزگار ہو گئے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد جب وقف کی بحالی عمل میں آئی تو موصوف کے والدِ محترم اس کے مہتمم مقرر ہوئے اور گجرات سے وقف کا روپیہ مکہ اور مدینہ لے جانے نیز اس کو وہاں کے فقرا اور حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کی ذمے داری خود ان کے سپرد ہوئی۔

ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا تھا کہ ان کے والد بزرگوار کا انتقال ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ان کا ستارہ ایک بار پھر گردش میں آ گیا۔ ان کو ملازمت سے برطرفی سے لے کر بے معاشی اور تہی دستی کا سامنا کرنا پڑا، جس کی وجہ سے وہ ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے مخلص دوستوں سے ان کی حالتِ زار دیکھی نہ گئی۔ چناں چہ، ان میں سے بعض نے وقف کے نئے انتظام کار، عبد النبی، سے سفارش کر کے ان کی ملازمت بحال کرادی۔ کچھ دنوں کے بعد، وہ وقف کا روپیہ اور دیگر ساز و سامان لے کر جہاز پر سوار ہو گئے اور ہُرمُز (Hurmuz) سے ہوتے ہوئے کوئی ایک سال بعد مکہ پہنچے۔ وہاں سے ۹۸۳ھ (۷۶/۱۵۷۵ء) میں ہندستان واپس آئے اور یہاں آ کر خاندیش کے امیر سیف الملک کی ملازمت اختیار کر لی۔ امیرِ مذکور کی رحلت کے بعد، وہ دکن کے امیر فولاد

خاں سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۰۱۴ھ (۶/ ۱۶۰۵ء) میں جب فولاد خاں کی وفات ہو گئی، تو انھوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی اور اس کے بعد وہ مکہ واپس چلے گئے۔ وہاں پہنچ کر خالی نہیں بیٹھے، بل کہ ۱۰۱۵ھ میں ''ظفر الوالہ بمظفر وآلہٖ'' کی تصنیف وتالیف میں مصروف ہو گئے۔ کتابِ ہٰذا غالباً ۱۶۱۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ۲۲۔ تلاشِ بسیار کے باوجود، حاجی دبیر کی صحیح تاریخِ وفات نہیں معلوم ہو سکی، لیکن ظاہر ہے کہ موصوف نے ۱۶۱۱ء کے بعد ہی داعیِ اجل کو لبیک کہا ہوگا۔

اب کچھ ''ظفر الوالہ بمظفر الوالہ'' کے بارے میں۔ اس کتاب کو دو دفتروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دفترِ اوّل جو ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے، سلاطینِ گجرات سے متعلق ہے، جنھوں نے گجرات پر ۱۳۹۶ء سے لے کر ۱۵۷۲ء تک حکومت کی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کتابِ مذکور کے دستیاب نسخے میں مظفری سلطنت کے بانی، سلطان مظفر، اور احمد آباد کے مؤسس، سلطان احمد، کا ذکر مفقود ہے۔ سلاطینِ گجرات کے حالات و واقعات کے علاوہ، اس میں خاندیش اور دکن کے حکمرانوں کے کوائف بھی مرقوم ہیں۔ Sir Denison Ross کی صراحت کے مطابق، واقعات کے سلسلۂ بیان میں کئی جگہ خلا پایا جاتا ہے، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

۷۹۹ھ سے لے کر ۸۴۶ھ تک	ابتدا میں
۹۴۷ھ سے لے کر ۹۵۳ھ تک	متن کے اوراق نمبر ۲۷۳، ۲۷۴ پر
۹۵۷ھ سے لے کر ۹۶۱ھ تک	متن کے ورق نمبر ۳۰۰ پر
۹۷۱ھ سے لے کر ۹۷۸ھ تک	متن کے اوراق نمبر ۵۳۰ اور ۵۳۱ کے درمیان ۲۳

جہاں تک دفترِ دوم کا تعلق ہے، یہ ۱۳ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں شمالی ہندستان کی عام تاریخ کو بہ طورِ خاص موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں بنگال کے مقامی حکمرانوں کے ۹۶۵ھ تک کے حالات بھی بیان ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں، اس میں دیگر مسلم ملکوں کی تاریخ بھی قلم بند کی گئی ہے۔ دفترِ ہٰذا اکبری عہد کے ابتدائی حصے کے احوال پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

حاجی دبیر نے کتابِ مذکور کی تصنیف میں درجِ ذیل مآخذ سے مدد لی ہے:

۱۔ طبقاتِ ناصری از جرجانی ۲۔ تاریخِ فیروز شاہی از برنی

۳۔ تاریخِ بہادر شاہی از حسام خاں ۴۔ مرآتِ سکندری از منجھو سکندر

۵۔ تحفۃ السادات از آرام کشمیری ۶۔ اکبرنامہ از ابوالفضل ۲۴

زیرِ بحث کتاب تقریباً تین سو سال تک لاپتہ رہی۔ حسنِ اتفاق کہ بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں یہ Sir Edward Denison Ross کو کلکتے کے مدرسہ لائبریری میں موجود کتابوں کے ذخیرے میں مل گئی۔ اس کو پاکر Sir Ross خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ انھوں نے خود کو اس کے مطالعے کے لیے وقف کردیا۔ کوئی ۲۴ سال تک یکسوئی اور انتہائی باریک بینی سے اس کا صبر آزما مطالعہ کرتے رہے اور اس کے حسن وقبح کا جائزہ بھی لیتے رہے۔ پھر اسے باقاعدہ ایڈٹ کر کے اور اس پر تعلیقات اور ایک مفصّل اشاریے کا اضافہ کر کے اس کو تین جلدوں میں لندن سے شائع کردیا۔ موصوف نے تینوں جلدوں کو اپنے فاضلانہ مقدمے سے بھی مزیّن کیا۔ ۲۵

اس کی اہمیت کے پیشِ نظر، اورینٹل انسٹیٹیوٹ، بڑودہ، نے ایم۔ ایف۔ لوکھنڈ والا، سابق صدرِ شعبۂ فارسی، بڑودہ یونیورسٹی، سے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے اس کو دو جلدوں میں چھاپ دیا۔ پہلی جلد ۱۹۷۰ء میں منظرِ عام پر آئی اور دوسری ۱۹۷۴ء میں۔ ان دونوں جلدوں کی اشاعت یو۔ جی۔ سی، دہلی اور صوبۂ گجرات کے مالی تعاون کی وجہ سے ممکن ہوسکی ہے۔

''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصّہ'' میں وقائع نگاری کے ضمن میں صرف ایک کتاب اور ایک ضمیمے کا ذکر آیا ہے۔ اس کتاب کا عنوان ''النور السافر عن اخبار القرن العاشر'' ہے۔ اس کے مصنف کا نام محی الدین عبدالقادر العیدروس احمد آبادی ہے، جن کا مختصر تعارف ابتدا میں کرایا جاچکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی صراحت کے مطابق، کتابِ ہذا، جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے، دسویں صدی ہجری میں پیش آنے والے واقعات کا تاریخ وار تذکرہ ہے۔ اس

سے پہلے بھی اس قسم کی کتابیں لکھی گئی ہیں، جن میں ابنِ حجر کی "الدُررُ الکامِنۃُ فِی القَرنِ الثامِنِ" اور السخاوی کی "الضوءُ اللامِعُ فی القَرنِ التاسِعِ" کو خاصی شہرت حاصل ہے۔ اس موضوع پر زیرِ بحث کتاب کے بعد بھی کچھ کتابیں لکھی گئیں، جن میں "خُلاصۃُ الآثارِ"، سِلکُ الدُررِ" اور "عجائِبُ الآثارِ" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔[۲۶]

ڈاکٹر صاحب کے بیان کے بہ موجب، "الدرر الکامنۃ" اور "الضوء اللامع" میں اشخاص کے نام حروفی ترتیب سے لکھے گئے ہیں اور پھر اس کے تحت ان کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ لیکن، اس کے برعکس، "النور السافر" میں تاریخی ترتیب اختیار کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ، اس میں صرف سربرآوردہ علما و امرا کے مختصر حالات کے اندراج پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا، بل کہ اہم سیاسی و معاشرتی حالات کو بھی قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کی تاریخِ تکمیل ۱۲؍ ربیع الثانی ۱۰۱۲ھ (مطابق ۱۶۰۳ء) ہے۔ اس کتاب کا عربی متن شائع ہو چکا ہے، نیز ڈاکٹر محمد عارف الدین فاروقی کا کیا ہوا اردو ترجمہ بھی اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر، گجرات، کی جانب سے ۲۰۰۱ء میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے مخطوطات درجِ ذیل لائبریریوں میں موجود ہیں: برٹش میوزیم، ۹۳۷؛ بانکی پور، ۶۵۹؛ بوہار، ۲۷۳؛ رام پور، ۶۵۰ اور آصفیہ ۱/۳۴۴-۲/۱۸۰۔[۲۷]

یوں تو کتابِ مذکور ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) سے لے کر ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) تک کے واقعات پر مشتمل ہے، لیکن اس کی ابتدا، حصولِ برکت کی غرض سے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ حیات کے مختصر حالات سے کی گئی ہے۔ دیباچے میں مصنف نے اپنی کتاب کا مختصر تعارف پیش کیا ہے اور یہ ارقام فرمایا ہے کہ: "اس نے اپنی تصنیف میں مصر، شام، حجاز، یمن اور ہندستان وغیرہ کے نامور عالموں، ولیوں، قاضیوں، بادشاہوں اور امیروں کی تاریخیں لکھی ہیں اور کچھ دوسرے حالات، عجیب و غریب قصے اور لطائف بھی قلم بند کیے ہیں۔"[۲۸]

اس کے ساتھ ہی موصوف نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ دسویں صدی ہجری میں

وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات وحادثات کو ضبطِ تحریر میں لانا، لاعلمی اور عدمِ رسائی کی وجہ سے، ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ اس کے بعد، مذکورہ موضوع پر ایک نامکمل کتاب تصنیف کرنے کا عذر ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ: ''جو چیز مکمل طور پر بیان نہ ہو سکے، اس کو بالکل چھوڑ دینا درست نہیں'' ۲۹ (مالایُدرَکُ کُلّهُ لایُترَکُ کُلّهُ)۔

اب زیرِ بحث کتاب کا باقاعدہ اور مفصل تعارف ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

لکھتے ہیں کہ:

''اصل کتاب کے شروع میں حصولِ برکت کے لیے مصنف نے آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مختصر حالات قلم بند کیے ہیں، اور پھر ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) سے لے کر ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) تک کے واقعات تاریخ وار لکھے ہیں۔ مصنف نے علما کی ایک بڑی تعداد کے مختصر حالات لکھے ہیں جن میں سے مندرجۂ ذیل اشخاص خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں:

(۱) السخاوی، بہت مشہور اور نادر تصنیف ''الضوء اللامع'' کے مصنف جن کا انتقال ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں ہوا۔

(۲) جلال الدین سیوطی، مشہور ومعروف عالم جن کا انتقال ۹۱۱ھ (۱۵۰۶ء) میں ہوا۔

(۳) شیخ بن عبداللہ، مصنف کے جدِّ امجد، سنہ وفات ۹۱۹ھ (۱۵۱۲ء)۔

(۴) ابنِ سوید، اپنے زمانے کے مشہور محدث جو سلطان محمود شاہ، والیِ گجرات، کے دربار سے متعلق تھے اور سلطان نے ان کو ''ملک المحدثین'' کا خطاب دیا تھا۔ ان کا انتقال ۹۱۹ھ (۱۵۱۳ء) میں ہوا۔

(۵) احمد بن محمد القسطلانی، مشہور ومعروف سیرتِ رسول ''المواهب اللدنیۃ'' کے مصنف جن کا انتقال ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں ہوا۔

ان کے ذکر میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ سیوطی اور قسطلانی میں تعلقات خوش گوار نہ تھے۔ سیوطی کو یہ شکایت تھی کہ قسطلانی نے کوئی حوالہ دیے بغیر، ان کی کتاب سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ جب سیوطی بسترِ مرگ پر تھے، تو قسطلانی ان کے گھر گئے

اور دروازے پر دستک دی۔ سیوطی نے پوچھا کہ کون ہے۔ قسطلانی نے اپنا نام بتلایا اور کہا کہ میں صلح کرنے کے لیے برہنہ سر اور برہنہ پا آیا ہوں۔ قریب مرگ سیوطی نے جواب دیا کہ مجھے تم سے شکایت نہیں رہی۔ لیکن دروازہ نہیں کھولا۔''

(۶) جلال الدین الدّوانی، اپنے زمانے کے نامور عالم۔ مصنف نے ان کا سنہ وفات غلطی سے ۹۲۸ھ (۱۵۲۱ء) لکھا ہے، حالاں کہ ان کا انتقال اس سے بیس سال پہلے (۹۰۸ھ میں) ہوا تھا۔

(۷) مزجّد، شافعی فقہ کی مشہور کتاب ''العباب'' کے مصنف۔ (ان کی تاریخِ وفات مذکور نہیں۔ راقم)۔

(۸) بحرق الحضرمی (؟)، عالم اور شاعر جو ہندستان آ کے سلطان مظفر، والیِ گجرات، کے درباریوں میں شامل ہوئے اور سلطان کے لیے سیرتِ رسول پر ایک کتاب لکھی، جس کا عنوان ہے: "تبصير الحضرة الشاهية الاحمدية بسيرة الحضرة النبوية الاحمدية"۔ (تاریخ وفات غیر مذکور۔ راقم)۔

(۹) ابن الحجر الہیثمی، شرح المشکاۃ وغیرہ کے مصنف۔ ۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں وفات پائی۔

(۱۰) علی متقی، مشہور و معروف ہندی عالم۔ ان کا انتقال ۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں ہوا۔

(۱۱) ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء)، مصنف کا سنہ پیدائش ہے اور اس سنہ کے تحت اپنی پیدائش، تعلیم اور تصانیف کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ مصنف نے صاف طور پر اعتراف کیا ہے کہ اس کی ماں ایک ہندستانی کنیز تھی، جس سے کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔

(۱۲) محمد بن طاہر، نامور عالم جن کو بجا طور پر ملک المحدثین ہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی وفات ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں ہوئی۔

(۱۳) عبد النبی، دربارِ اکبری کے ایک مشہور عالم تھے۔ ان پر اکبر کا عتاب نازل ہوا۔ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں وفات پائی۔

(۱۴) قطب الدین النہروالی، مشہور مورخ اور خوش گو شاعر۔ ان کی پانچ طویل نظمیں بھی

اس کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ (ان کی تاریخِ وفات درج ہونے سے رہ گئی ہے، جو ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصّہ'' ہی کے ایک اندراج کے مطابق ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) ہے۔ دیکھیے ص ۱۷۷)۔

(۱۵) حکیم شہاب الدین محمود بن شمس الدین سندھی (تاریخِ وفات مذکور نہیں)، گجرات کے شاہی دربار سے متعلق تھے۔ ان کے ذکر میں مصنف نے ایک عجیب قصہ بیان کیا ہے کہ کسی بادشاہ نے سلطان محمود کو قیمتی تحائف بھیجے، جن میں ایک خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ سلطان نے یہ لڑکی اپنے ایک وزیر کو عنایت فرمائی۔ قبل اس کے کہ وزیر اس سے مباشرت کرتا، ایک خاندانی حکیم نے اتفاقی طور پر اس لڑکی کی نبض دیکھی اور یہ اعلان کر دیا کہ اس لڑکی کی غذا اور پرورش ایسے مسموم طریقے پر ہوئی ہے کہ جو شخص اس سے مباشرت کرے گا وہ یقیناً مر جائے گا۔ حکیم کے اس بیان کی تصدیق کرنے کے لیے فوراً ایک تجربہ کیا گیا اور لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حکیم کا کہنا درست ثابت ہوا۔ جب اس عجیب وغریب خاصیت کا سبب دریافت کیا گیا، تو حکیم نے کہا کہ لڑکی کی ماں جب حاملہ تھی، تو اس کو زہریلی جڑی بوٹیاں کھلائی جاتی تھیں۔'' ۳۰

یہ ان علما و مصنفین میں سے زیادہ اہم لوگوں کے نام ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔

جہاں تک بادشاہوں اور امیروں کا تعلق ہے، ڈاکٹر صاحب کے بہ قول، ان کے تذکروں میں مندرجۂ ذیل نام شامل ہیں:

(۱) قائت بے، سلطانِ مصر، جس کا انتقال ۹۰۱ھ (۱۴۹۵ء) میں ہوا۔

(۲) محمود بن محمد، بادشاہِ گجرات، جس نے ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں وفات پائی۔

(۳) مظفر شاہ ثانی، بادشاہِ گجرات، سنہ وفات ۹۳۲ھ (۱۵۲۶ء)۔

(۴) بہادر شاہ، بادشاہِ گجرات، سنہ وفات ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء)۔

(۵) محمود شاہ ثانی، بادشاہِ گجرات، سنہ وفات ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء)۔

(۶) احمد شاہ ثانی، بادشاہِ گجرات، سنہ وفات ۹۶۷ھ (۱۵۵۹ء)۔

(۷) خداوند خاں، بادشاہِ گجرات، سنہ وفات ۹۶۸ھ (۱۵۶۰ء)

(۸) قطب شاہ، سلطانِ گولکنڈہ، سنہ وفات ۹۹۰ھ (۱۵۵۲ء)۔ ۳۱؎

ڈاکٹر صاحب کی فراہم کردہ معلومات کی رُو سے، اس کتاب میں جو سیاسی واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں سے چند قابلِ ذکر یہ ہیں:

(۱) گجرات پر ہمایوں کی فوج کشی۔ بہادر شاہ کو مصطفیٰ بہرام کی غداری سے کس طرح شکست ہوئی۔

(۲) آصف خاں کا مکۂ معظمہ سے واپس آنا اور منصبِ وزارت پر فائز ہونا، یہاں تک کہ ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء) میں وہ اور اس کے آقا دونوں مارے گئے۔ (Life of Haji Dabir، مشمولۂ ''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' (انگریزی ترجمہ، جلد اوّل) میں ان دونوں کے مارے جانے کا سنہ ۱۵۵۵ء بتایا گیا ہے، دیکھیے ص XXII)۔

(۳) دیو (Div) پر پرتگالیوں کا قبضہ ۹۶۱ھ (۱۵۵۳ء)۔ (مندرجۂ بالا اندراج کی رُو سے، دیو پر پرتگالیوں کے قبضے کا سنہ بھی ۱۵۵۵ء قرار پائے گا)۔

(۴) اکبر کی فتحِ گجرات (۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء)۔ اکبر کے متعلق مصنف کی یہ رائے ہے کہ وہ انصاف پسند بادشاہ تھا، مگر ملحدوں کی طرف مائل تھا۔ اور آخر میں یہ معنی خیز جملہ لکھا ہے: ''وفی الاشارۃ ما یغنی عن الکلام''۔

(۵) احمد آباد اور اس کے بانی کے حالات۔

(۶) مظفر بن محمود کا مغلوں کو شکست دے کر ۹۹۱ھ (۱۵۸۳ء) میں احمد آباد، بڑوچ (بھروچ) اور بڑودہ پر دوبارہ قبضہ کرنا اور اگلے سال ان مقامات کا پھر سے اس کے ہاتھ سے نکل جانا۔ ۳۲؎

ڈاکٹر صاحب کی وضاحت کے بہ موجب، سوانحی خاکوں اور سیاسی واقعات کے مختصر بیان کے ساتھ ہی کچھ چیزیں موضوع سے ہٹ کر بھی قلم بند کی گئی ہیں۔ ان میں مندرجۂ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

(۱) حضر موت، احقاف، سبا، ارم، ذات العماد، مزارِ صالح، مزارِ ہود وغیرہ۔

(۲) معجزات کے امکان پر بحث۔

(۳) عدن میں ۹۱۴ھ (۱۵۰۸ء) میں زلزلہ آنے اور آگ لگنے کا بیان۔

(۴) قہوہ کا بیان۔ ۳۳

علاوہ ازیں، اس میں متعدد علما اور شعرا کے اشعار بھی منقول ہیں۔ چوں کہ محی الدین عبدالقادر العیدروس شاعر بھی تھے، اس لیے ان کو شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ ۳۴

اسی طرح چوں کہ موصوف کا اصل تعلق جنوبی عرب سے تھا اور گجرات میں قیام پذیر ہو جانے کے بعد بھی اس سے ان کا تعلق ہمیشہ برقرار رہا، اس وجہ سے ان کو وہاں کے حالات سے بھی دلچسپی تھی۔ جنوبی عرب کے ضمن میں انھوں نے عدن، حضر موت اور یمن کے سیاسی امور پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ ۳۵

اس کتاب کی زبان اور اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سادہ، واضح اور رواں ہے۔ ۳۶

تاریخوں کے سلسلے میں مصنف سے ایک صریح غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ انھوں نے جلال الدین الدوانی کا سنہ وفات ۹۲۸ھ لکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی نشان دہی کر کے اس کی تصحیح فرما دی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق، جلال الدین الدوانی کی صحیح تاریخِ وفات ۹۰۸ھ ہے۔ ۳۷

اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں کہ: ''راقم الحروف نے دیکھا ہے کہ اس (مصنف) کی دی ہوئی تاریخیں ان تاریخوں سے کچھ مختلف ہیں جو لین پول نے مسلمانِ حکمرانوں کی تاریخ میں لکھی ہیں۔ مثلاً مصنف نے یہ لکھا ہے کہ محمود بن محمد، فرماں روائے گجرات، کا انتقال ۹۱۶ھ میں ہوا، مگر لین پول ۹۱۷ھ بتلاتا ہے۔ اسی طرح ''النور السافر'' کے مطابق، احمد شاہ کا سالِ وفات ۹۶۷ھ ہے اور لین پول کے مطابق ۹۶۹ھ ہے۔'' ۳۸

ڈاکٹر صاحب کی صراحت کے بہ موجب، سترہویں صدی عیسوی میں اس کتاب

کا ایک ضمیمہ بھی لکھا گیا۔ ضمیمہ نگار کا نام السید محمد بن ابوبکر الشلّی (متوفّی ۱۰۹۳ھ-۱۶۸۲ء) ہے اور ضمیمے کا عنوان ہے: "السَنَـآءُ البَـاهِـرُ بتَكمِيلِ النُورِ السَّافِر" ۔اس ضمیمے کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں الشلّی نے "النور السافر" کی صحت پر شبہہ نہیں کیا ہے، بل کہ اس کو بہت مفید اور قیمتی تصنیف قرار دیا ہے اور ضمیمہ لکھنے کا سبب خود اس نے یہ بتلایا ہے کہ "النور السافر" میں بہت سے قابلِ ذکر لوگوں کے نام چھوٹ گئے تھے۔ مطلب یہ کہ "النور السافر" میں جن متعدد شخصیتوں کا احوال درج ہونے سے رہ گیا تھا،[۳۹] مذکورہ ضمیمے میں انھی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور اس طرح اوّل الذکر کی تکمیل کی سعیِ مشکور کی گئی ہے۔

"النور السافر عن اخبار القرن العاشر" سے متعلق ڈاکٹر صاحب کا یہ مفصّل اور گراں قدر تعارف درجِ ذیل عبارت پر اختتام پذیر ہوتا ہے:

"مختصر یہ کہ "النور السافر" ایک مفید تاریخی تصنیف ہے، جس میں واقعات تاریخی ترتیب سے قلم بند کیے گئے ہیں، اور یہ اس کی مستحق ہے کہ مغرب کے جدید علمی انداز میں مرتب کی جائے۔ "الدُّرَرالکامنہ" اس سوانحی سلسلۂ تصانیف کی پہلی کڑی ہے اور اس کو مسٹر کرنکوف مرتّب کر رہے ہیں۔ "ضوء اللامع" (کذا) کے مخطوطے بہت کمیاب اور ناقص ہیں۔ ان کے بعد کی کڑی "النور السافر" اور اس کا ضمیمہ "السناء الباھر" ہیں، اور اس کے بعد اس سلسلے کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ شائع ہو چکی ہیں"۔[۴۰]

ڈاکٹر زبید صاحب نے "النور السافر" اور اس کے ضمیمہ "السناء الباھر" کی ترتیب واشاعت پر جو زور دیا ہے، وہ بجا ہے۔ آج کے دور میں یہ کام خود ہمارے ہی ملک میں بڑی آسانی اور خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا ہے، کیوں کہ خدا کے فضل سے یہاں عربی کے ماہر اور باصلاحیت علما وفضلا کی کمی نہیں ہے۔ دیگر مقامات کا ذکر ہی کیا، صرف دہلی میں ایسے ماہر اور تجربہ کار حضرات موجود ہیں، جو ان کی ترتیب وتہذیب کے فریضے سے بخیر وخوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور پھر وہاں کے متعدد مشہور اداروں میں سے کوئی بھی ادارہ ان کو شائع کر کے تشنگانِ علم کی ضیافت کا سامان فراہم کر سکتا ہے۔

ان دونوں کے علاوہ، سطورِ بالا میں زیرِ بحث آنے والی سیرت، سوانح اور تاریخ سے متعلق دوسری کتابوں کی ترتیب واشاعت کی جانب بھی توجہِ مبذول کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک ''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' کا تعلق ہے، Sir Denison Ross نے اس کو مرتب کر کے شائع کر ہی دیا ہے۔ لیکن افسوس کہ اب یہ تقریباً نایاب ہے۔ البتہ، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اس کا انگریزی ترجمہ ضرور دو جلدوں میں دستیاب ہے اور اسے بڑودہ یونیورسٹی کے Publications Sales Unit سے بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک اس کا اردو میں ترجمہ نہیں ہو سکا ہے۔ اس کی طرف بھی دھیان دینے کی اشد ضرورت ہے کہ اس سے اردو داں حضرات کے لیے بھی استفادے کی راہ ہموار ہو جائے گی۔

آخر میں خود ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصّہ'' کی بابت بھی چند سطریں سپردِ قلم کرنا کچھ نامناسب نہ ہوگا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، یہ کتاب اصلاً انگریزی میں ہے اور اس زبان میں یہ کم از کم دوبار شائع ہو چکی ہے، ایک بار ۱۹۴۶ء میں غیر منقسم ہندستان سے اور دوسری بار ۱۹۵۰ء میں نوزائیدہ پاکستان سے۔ اس کے علاوہ، ۱۹۷۳ء میں اس کا اردو ترجمہ بھی لاہور، پاکستان، سے چھپ چکا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۷۳ء کے بعد بھی وہاں انگریزی اور اردو اڈیشنوں کی اشاعت عمل میں آئی ہو اور اس طرح یہ دونوں وہاں اب بھی آسانی سے مل جاتے ہوں۔ لیکن جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، یہاں ان کی دستیابی فی الحال ممکن نہیں ہے۔ اس لیے یہاں بھی ان کی اشاعت کا باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ کاش! کوئی ادارہ اس سلسلے میں سبقت کر کے علم نوازی وعلم دوستی کی تازہ ترین اور قابلِ تحسین مثال قائم کرے۔

ایک بات اور۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر، اس کو عربی میں منتقل کرانے کا بیڑا بھی کسی تنظیم، مرکز یا ادارے کو اٹھانا چاہیے۔ اس کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، کے کسی عالم کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عربی اڈیشن کی اشاعت سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ کتابِ ہٰذا کی رسائی براہِ راست علمائے عرب تک ہو جائے گی، اور اس طرح ان کو اپنے عجمی بھائیوں کی عربی زبان وادب سے متعلق گراں مایہ خدمات کی قدر و قیمت کا

صحیح طور پر اندازہ کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آ جائے گا۔

تعلیقات وحوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر صاحب کی تاریخِ پیدائش ووفات اور مفصل سوانحی حالات کا علم نہیں ہوسکا۔ ان کے بارے میں سرِ دست صرف اتنا ہی معلوم ہوسکا ہے کہ عربی میں ایم۔اے کرنے کے بعد، وہ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے۔ موصوف ۱۹۲۳ء میں بریلی کالج میں فارسی کے استاد تھے۔ دورانِ ملازمت ان کو گورنمنٹ صوبۂ متحدہ (حالیہ اتر پردیش) کی جانب سے عربی ریسرچ اسکالرشپ ملا، تو وہ رخصت لے کر علی گڑھ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے داخل ہوگئے اور وہاں چند ماہ تک عربی کے پروفیسر، ڈاکٹر ٹریٹن (Triton)، کی نگرانی میں کچھ علمی کام کیا۔ علی گڑھ کے مختصر قیام کے دوران ہی زبید صاحب نے عربی اور انگریزی کتابوں کی مدد سے اردو میں عربی زبان وادب کی مفصل تاریخ قلم بند کرنے کا ارادہ فرمایا۔ جب ڈاکٹر ٹریٹن کو ان کے ارادے سے آگاہی ہوئی، تو انھوں نے ان کی کافی ہمت افزائی کی۔ چناں چہ، زبید صاحب نے قلیل مدت میں عہدِ اموی تک مواد جمع کرلیا۔ بعد ازاں، موصوف بریلی کالج واپس چلے گئے۔ دو تین ماہ کے بعد وہاں سے الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ عربی وفارسی میں لیکچرر مقرر ہوکر آگئے، جہاں وہ عربی وفارسی دونوں زبانیں پڑھاتے تھے۔ مصروفیت اور عدیم الفرصتی کے باوجود، انھوں نے عربی زبان وادب کی تاریخ سے متعلق جمع کردہ مواد کو ''ادب العرب (حصۂ اول)'' کے زیرِ عنوان ترتیب دے کر پریس کے حوالے کردیا، جو کوئی چار ماہ کے بعد اپریل ۱۹۲۶ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ کتاب مذکور جو تین سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے، منشی حامد حسین صاحب کے زیرِ اہتمام مطبع یونانی دواخانہ، الٰہ آباد، میں طبع ہوئی اور اس کی اشاعت کا فریضہ نور بک ڈپو، ٹاؤن ہال، بریلی، نے انجام دیا۔ (دیکھیے ادب العرب (حصہ اول) صص ۱،۲)۔

ڈاکٹر زبید صاحب ''ادب العرب (حصۂ دوم)'' کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھے اور اس کو جلد از جلد ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے تھے۔ خدا معلوم اس میں، ان کو کامیابی ہوئی یا

نہیں۔ حصۂ دوم یا جلدِ دوم میں ڈاکٹر صاحب بنو عباس سے لے کر اپنے عہد تک کی تاریخِ ادبِ عربی کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہتے تھے۔ (دیکھیے ادب العرب، حصۂ اول، ص ۳)۔

ادب العرب (حصۂ اول) سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے ''منتخباتِ نظم ونثرِ فارسی جدید'' کے عنوان سے ایک اور کتاب بھی تالیف فرمائی تھی۔

۱۹۲۸ء میں زبید صاحب اپنی عربی تحقیقات کی تکمیل کی غرض سے لندن تشریف لے گئے اور وہاں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخل ہوئے۔ انھوں نے ہندستان کی عربی تصانیف کو موضوعِ بحث بنایا اور The Contribution of India to Arabic Literature کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا، جس پر ان کو ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔

لندن سے واپس آکر ڈاکٹر صاحب حسبِ دستور درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔ نظرِ ثانی کے بعد، مقالۂ مذکورۂ بالا کو ۱۹۴۶ء میں شائع کرایا۔ اس کے چند سالوں بعد، ملازمت سے سبک دوش ہوگئے۔ سبک دوشی کے بعد، ڈاکٹر صاحب پاکستان ہجرت کر گئے۔ وہاں سے کم ازکم ایک بار مرحومہ ڈاکٹر شبیر فاطمہ صاحبہ کے Ph.D.Viva کے سلسلے میں ہندستان تشریف لائے۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال کراچی، پاکستان، میں کسی نامعلوم سنہ میں ہوا۔

آخر میں یہ بھی عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایم۔اے اور ڈاکٹریٹ کے علاوہ، مولوی فاضل اور منشی فاضل کی ڈگریاں بھی حاصل کی تھیں۔

پروفیسر مختار الدین احمد صاحب (علی گڑھ) کے پاس ان کا ایک گرامی نامہ مورخہ ۲۷/اپریل ۱۹۵۷ء محفوظ ہے۔ یہ گرامی نامہ پروفیسر صاحب کے نام ہے۔ موصوفِ محترم نے اس کی زیراکس از راہِ کرم مجھے بھی عنایت کی ہے۔ مذکورہ مکتوب سے یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم ہوگئی کہ ڈاکٹر صاحب اپریل ۱۹۵۷ء تک بہ قیدِ حیات تھے۔ ان کا انتقال اس کے بعد ہی کبھی ہوا ہوگا۔

۲ یہ ساری تفصیلات ''تعارف'' از شاہد حسین رزاقی مشمولہ ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا

حصہ''، مطبوعہ ۱۹۷۳ء سے ماخوذ ہیں۔

۳۔ تعارف مشمولہ ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ''، ص: ۵۔

۴۔ عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ، حصہ اول، ص ۳۹۔

۵۔ دیکھیے مصدرِ مذکور، صص ۱۷۷، ۱۷۸۔

۶۔ دیکھیے مصدرِ مذکور، ص ۱۷۷۔

۷۔ دیکھیے مصدرِ مذکور، حصہ دوم، صص ۳۹۰، ۳۹۱ مع حاشیہ۔

۸۔ ان معلومات کے لیے دیکھیے مصدرِ مذکور، ص ۱۸۰۔

۹۔ دیگر مآخذ کا ذکر کیا، ''عربی ادبیات میں پاک و ہند کا حصہ'' ہی میں ان کی بیس سے زائد کتابوں کا ذکر ہے، جن کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:

(۱) اتحاف الحضرۃ العزیزۃ لعیون السیرۃ الوجیزۃ (برلن، ۹۶۶۰)۔

(۲) اسباب النجات والنجاح فی اذکار المسآء والصباح (برلن، ۳۷۱۸)۔

(۳) اسعاف اخوان الصفاء لشرح تحفۃ الظرفاء (بوہار، ۲۰۱)۔

(۴) الاعتقادیۃ (بوہار، ۴۵۴)۔

(۵) افیۃ المستفید بشرح تحفۃ المرید (بوہار، ۳/۴۵۷)۔

(۶) الزہ الباسم (کذا)۔ (برلن، ۳۳۳۷)۔

(۷) تعریف الاحیاء بفضائل الاحیاء (مخطوطہ، برلن، ۱۷۱۳)۔
یہ کتاب مصر میں اتحاف السادۃ المتقین للمرتضی الزبیدی کے حاشیے پر چھاپی گئی ہے۔

(۸) الدر الثمین فی بیان المھم عن علوم الدین (بوہار، ۱/۴۵۳)۔

(۹) رجز (برلن، ۱/۸۱۶۱)۔

(۱۰) الرسالۃ فی مناقب البخاری (بوہار، ۴۵۴)۔

(۱۱) روح الراح وراح الارواح (بوہار، ۱۲۶)۔

(۱۲) [illegible]

(۱۳) الروض الناضر فی من اسمہ عبدالقادر (برلن، ۹۸۹۰)۔

(۱۴) شرح القصیدہ النونیۃ لابی بکر بن عبداللہ العیدروس (بوہار، ۴۳۳: برلن نمبر نا قابل خوانہ)

(۱۵) صدق الوفا، بحق الاخآء (برلن، ۱۰۱۳۹)۔

(۱۶) صفوۃ الصفوۃ فی بیان احکام القھوۃ (برلن، ۵۴۷۹)۔

(۱۷) غایۃ القرب فی شرح نھایۃ الطلب (برلن، ۳۴۲۱)۔

(۱۸) فتح الجواد فی شرح قصیدۃ عبدالھادی (بوہار، ۴۳۲)۔

(۱۹) الفتح القدسی فی تفسیر آیت الکرسی (بوہار، ۱/۴۵۷)۔

(۲۰) الفتوحات القدوسیۃ فی الخرقۃ العیدروسیۃ۔

(۲۱) کتاب المنھاج الی معرفۃ المعراج (برلن، ۲۶۰۹)۔

(۲۲) القول الجامع فی بیان العلم النافع (بوہار، ۲/۴۵۷)۔

(۲۳) المکاتیب (دہلی ۱۲۷۲؛ برلن، ۳۶۳۳)۔

(۲۴) المقالۃ النافعۃ والرسالۃ الجامعۃ (بوہار، ۱/۴۵۷)۔

(۲۵) المنتخب المصطفیٰ من اخبار مولد المصطفیٰ (برلن، ۹۶۳۵)۔

(۲۶) الموشح فی التصوف (برلن، ۳۴۲۲)۔

(۲۷) مولد النبی) بنگال ا، ۱۰۲۵)۔

ڈاکٹر صاحب کی صراحت کے مطابق، غالباً یہ کتاب اور ''المنتخب المصطفیٰ من اخبار مولد المصطفیٰ'' ایک ہی تصنیف ہیں'' (دیکھیے ''عربی ادب میں پاک و ہند کا حصہ''، ص ۳۹۱، حاشیہ)۔ اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

(۲۸) نفائس الانفاس فی نسبۃ الخرقۃ والالباس (انڈیا آفس، ۱۳۸۸)۔

(۲۹) النور السافر عن اخبار القرن العاشر۔

اس کتاب میں مزید تین کتابیں شامل ہیں، جو یہ ہیں:

(۳۰) الانموذج اللطیف فی اھل البدر الشریف۔

(۳۱) عقد الآل بفضائل الآل۔

(۳۲) قرۃ العین فی مناقب الوالی محمد حسین۔

(دیکھیے ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ'' صص ۲۶۶، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۴۹، ۳۹۱، ۴۱۰)۔

۱۰ ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ'' میں چار جگہ یہی سنہ درج ہے۔ (دیکھیے صص ۲۶۶، ۳۲۵، ۳۴۰، ۳۹۱)۔ لیکن ص ۴۱۰ پر سنہ وفات ۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) منقول ہے، جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

۱۱ دیکھیے مصدر مذکور، ص ۱۸۶۔

۱۲ دیکھیے نفس مصدر، ص ۱۸۶۔

۱۳ دیکھیے نفس مصدر، صص ۱۸۷، ۱۸۸، ۳۹۱۔

۱۴ نفس مصدر، ص ۱۷۹۔

۱۵ ایضاً، ص ۱۸۰۔

۱۶ ایضاً، ص ۱۷۹۔

۱۷ ایضا

۱۸ ایضاً، ص ۱۸۰

۱۹ ایضاً، ص ۳۹۱۔

۲۰ اس کا انگریزی ترجمہ دو جلدوں میں اورینٹل انسٹیٹیوٹ، بڑودہ سے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے مترجم کا نام ایم۔ ایف۔ لوکھنڈ والا ہے۔ مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

۲۱ ڈاکٹر زبید صاحب نے سنہ پیدائش ۱۵۳۹ء کے بجائے ۱۵۴۰ء لکھا ہے۔ (دیکھیے ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ'' ص ۱۷۹)۔ راقم کے خیال میں ۱۵۳۹/۴۰ھ لکھنا زیادہ مناسب ہوگا، کیوں کہ مذکورہ سنہ ہجری کا دونوں عیسوی سالوں میں پڑنے کا امکان ہے۔

۲۲ ان تفصیلات کے لیے دیکھیے ''Life of Haji Dabir'' اور ''History'' مشمولہ ''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' (انگریزی ترجمہ)، جلد اول، بڑودہ، ۱۹۷۰، صص XVII، XVIII،

XXV، XXIV، XXII، XXI، XIX۔

۲۳۔ دیکھیے ''History'' مشمولہ ''ظفر الوالہ بمظفر وآلہ'' (انگریزی ترجمہ)، جلدِ اول، ص xxiv۔

۲۴۔ دیکھیے مصدرِ مذکور، صص xxiv، xxv۔

۲۵۔ دیکھیے مصدرِ مذکور میں شامل ''Forward'' از B.J.Sandesara : "Muslim Education and Learning in Gujarat (1297-1758)" از Mansooruddin A. Quraishi، بڑودہ، ۱۹۷۲ء، ص ۸۶ اور ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ''، ص ۱۷۹۔

۲۶۔ دیکھیے ''عربی ادبیات میں پاک وہند کا حصہ''، صص ۱۸۰، ۱۸۱۔

۲۷۔ دیکھیے مصدرِ مذکور، صص ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۶، ۳۹۱۔

۲۸۔ مصدرِ مذکور، ص ۱۸۱۔

۲۹۔ ایضاً۔

۳۰۔ ایضاً، صص ۱۸۱ تا ۱۸۳۔

۳۱۔ ایضاً، صص ۱۸۳، ۱۸۴۔

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۸۴۔

۳۳۔ ایضاً، صص ۱۸۴، ۱۸۵۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔

۳۵۔ ایضاً۔

۳۶۔ ایضاً، صص ۱۸۵، ۱۸۶۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۸۵۔

۳۸۔ ایضاً۔

۳۹۔ ایضاً۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔

11

اخبار الاخیار میں گجرات کے مشائخ کا تذکرہ

- ڈاکٹر وجیہ الدین
(ایم.ایس. یونیورسٹی، بڑودہ)

شیخ عبد الحق محدث دھلوی کے جد امجد آغا محمد تُرک بُخاری تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں سلطان علاؤ الدین خلجی کے دور حکومت میں بخارا سے دھلی تشریف لائے۔ آپ کے والد کا نام مولانا سیف الدین تھا جو ۹۲۰ھ کو دھلی میں متولد ہوئے۔ ان کے والد صاحب باطن اور خدا رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے شاعر بھی تھے۔ ان کا تخلص سیفی تھا۔ ان کا انتقال ستر سال کی عمر میں یعنی ۲۷ شعبان ۹۹۰ھ کو ہوا۔[۱]

شیخ عبد الحق محدث دھلوی ماہ محرم الحرام ۹۵۸ھ/۱۵۵۱ء دھلی میں پیدا ہوئے۔ اس وقت اسلام شاہ سوری دھلی کا حاکم تھا اور اس وقت سیّد محمد جونپوری کی مہدوی تحریک شباب پر تھی۔ انھوں نے اپنے والد کے زیر سایہ تربیت حاصل کی۔ شیخ سیف الدین بحیثیت والد، بحیثیت پیر و مرشد اپنے بیٹے کو وحدت الوجود کے مسائل سمجھایا کرتے تھے۔[۲]

شیخ عبد الحق محدث دھلوی کے نانا مولانا زین العابدین شیخ اَدھن دھلوی کے نام سے معروف تھے۔ اکبر کے دور حکومت میں جب شرع کی بے حرمتی اور بدعات اپنے عروج پر تھیں تو اس دور کے مذہبی حالات سے گھبرا کر یعنی دینِ الٰہی کے قیام کے بعد شیخ عبد الحق نے غیرت دینی سے مجبور ہو کر حجاز کا سفر کیا۔[۳]

۹۹۵ھ/ ۱۵۸۶ء میں مالوہ ہوتے ہوئے گجرات پہنچے تو معلوم ہوا کہ حجاز کا جہاز جانے کا موسم ختم ہو چکا ہے۔ اس لئے ایک سال ۹۹۶ھ/ ۱۵۸۷ء گجرات میں مقیم رہے۔

احمد آباد میں اس وقت مرزا نظام الدین بخشی مصنفِ طبقات اکبری صوبے کے بخشی تھے۔ انھوں نے شیخ عبدالحق دھلوی کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور التماس کر کے اگلے جہاز کی روانگی تک اپنے پاس ٹھرایا اور زادِ راہ کا انتظام کیا۔ احمد آباد میں اس وقت شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی موجود تھے۔ شیخ عبدالحق نے ان سے سلسلۂ عالیہ قادریہ کے کچھ اذکار واشغال حاصل کئے۔ شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی نے تقریباً ۶۷ سال تک احمد آباد میں درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ ان سے شیخ عبدالحق محدث دھلوی نے کسبِ فیض کیا۔ اور شیخ عبدالحق نے شیخ عبدالوہاب متقی سے علم ظاھری وعلم باطنی کی تعلیم حاصل کی۔[۴]

شیخ عبدالحق سب سے پہلے اپنے والد مولانا سیف الدین سے بیعت ہوئے اس کے بعد سیّد موسیٰ گیلانی کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور پھر مکّہ معظمہ میں اپنے استاد حضرت شیخ عبدالوہاب متّقی سے منسلک ہوئے۔ مکّہ سے واپس آ کر ہندوستان میں خواجہ باقی باللہ نقشبندی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ آپ شعر بھی کہتے تھے اور آپ کا تخلص حقّی تھا[۵]۔ شیخ عبدالحق ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو ۹۴ سال کی عمر میں شاہ جہاں کے عہد میں دھلی میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔[۶] ان کے معاصرین میں حضرت مجدّد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ابوالمعانی، شیخ عبداللہ نیازی، نواب مرتضیٰ خاں، شیخ فرید عبدالرحیم خانخانان، ابو الفیض فیضی، مرزا نظام الدین احمد بخشی، میر سیّد طبیب بلگرامی اور محمد غوثی شطّاری مانڈوی، ملا عبدالقادر بدایونی[۷] وغیرہ شامل ہیں۔

تصانیف : عموماً کہا جاتا ہے آپ کی ۱۰۰ (سو) سے زائد تصانیف تھیں۔ لیکن شیخ عبد الحق نے اپنی تصانیف کی فہرست ایک رسالے میں درج کی ہے۔ جس کا نام "تالیف قلب الالیف بذکر فِھرِس التوالیف" ہے اس میں ۴۹ کتابوں کے نام درج ہیں اور بعد میں ۱۱ کتابوں کا اور اضافہ کیا۔ اس طرح کل کتابوں کی تعداد ساٹھ (۶۰) ہو جاتی ہے، جو مختلف موضوعات پر ہیں۔ جن میں فقہ، حدیث، تفسیر، عقائد، تاریخ، علم نحو، سیر وتذکرہ، تجوید، تصوّف، اخلاق، اعمال واوراد، فلسفہ ومنطق، ذاتی حالات، خطبات، مکاتیب اور اشعار شامل ہیں۔[۸]

اخبارالاخیار کی تصنیف :۔

عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار کے مقدمے میں رقمطراز ہیں : حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ابتدائی دور سے ۱۰۰۰ھ تک تمام اولیاء کرام اور ارباب یقین کے احوال جو مشائخ چشتیہ کی کتب و رسائل میں مذکور اور معتبر راویوں سے منقول ہیں، نہایت تحقیق و تفتیش کے بعد جمع کر رہا ہوں نیز ان صلحاء و علما کے حالات بھی سپرد قلم کئے گئے ہیں جو اپنی امتیازی شان کے ساتھ مشہور تھے۔

طبقہ اسکندریہ کے ان اولیاء صلحاء کے حالات وصلاح حال، تقویٰ، دیانت و امانت میں ضرب المثل تھے اور اطرافِ عالم کے وہ علماء جو ھندوستان میں مقیم ہوگئے تھے اگرچہ بعض ایسے ھی ہیں جن کی ولایت و کرامت مشہور نہیں لیکن اہل مجلس ان کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ بھی کسی نہ کسی طرح ممتاز تھے اور اس مناسبت سے اس کا نام ''اخبار الاخیار فی اسرار الابرار'' رکھا گیا ہے۔

عبدالحق صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ہر ایک کی تعریف کسی مبالغہ آرائی کے بغیر ان کے حالات کے ساتھ لکھی گئی ہے اور ان بزرگوں کی تصنیفات و تالیفات اور مکتوبات و رسائل میں سے جو مسائل طریقت، مکاشفات حقیقت یا وعظ و نصیحت نظر سے گزرا، وہ بھی قدرے سپرد قلم کر دیا ہے۔[9]

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے :

اوّل مقدمہ مصنف اس کے بعد ابومحمد عبدالقادر الحسنی الحسینی الجیلانی رحمۃ اللہ کے حلیۂ مبارک، ریاضت و مجاہدہ، وعظ و نصیحت اور کرامات کا ذکر ہے۔ اس کے بعد طبقہ اوّل میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور ان کے ہمعصر مریدین و مشائخ کے حالات درج ہیں۔

طبقہ دوم حضرت شیخ عبدفید الحق (خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ) اور ان کے ہمعصر مشائخ و مریدین کے احوال کے بارے میں ہے۔

طبقہ سوم حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دھلوی اور آپ کے ہمعصروں کے حالات پر مبنی ہے۔ اس کے بعد اسی ترتیب کے ساتھ اپنے زمانے تک کے بزرگوں کے حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر مجذوبوں اور نیک بیبیوں کے حالات کو بلا لحاظ ترتیب لکھا گیا ہے۔ اور خاتمۂ کتاب میں اپنے اسلاف کے اجمالی اور والد ماجد کے تفصیلی حالات بیان کئے گئے ہیں۔ خاتمہ میں مصنف نے اپنے بعض ابتدائی حالات بھی بیان کئے ہیں اور کتاب کو ایک مناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات اور حضور اکرم کی ایک نعت پر ختم کردیا ہے۔ اخبار الاخیار میں طبقہ اوّل میں ۲۱، طبقہ دوّم میں ۴۳ اور طبقہ سوم میں ۱۷۸ حضرات کا ذکر ہے یعنی کل ۲۴۲ صوفیا اور مشائخ کا تذکرہ ہے۔

جیسا کہ محدث صاحب نے ذکر کیا ہے کہ اخبار الاخیار میں خواجہ معین الدین چشتی کے ابتدائی دور سے ۱۰۰۰ھ تک کے تمام اولیائے کرام اور ارباب یقین کے احوال درج ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی سال یعنی ۱۰۰۰ھ اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ ہے ورنہ اس میں بعد کے اولیاء اور مشائخ کے حالات بھی درج ہوتے۔ محدث صاحب تقریباً ۱۰۰۰ھ میں مکہ سے واپس تشریف لائے تھے۔ اس کے بعد اخبار الاخیار کی تصنیف کی ہوگی۔

اخبار الاخیار کے آخر میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے حالات، کرامات نعتیہ قصیدہ کے بعد الگ سے درج ہیں۔ عبدالحق صاحب نے کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ کتاب نعتیہ قصیدہ پر ختم ہوگئی ہے اگر وہ محدث الف ثانی کے حالات الگ سے لکھتے تو مقدمہ میں ضرور اس کی طرف اشارہ کرتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجدد الف ثانی کے حالات بعد میں اخبار الاخیار میں شامل کئے گئے اور کیونکہ ابتدا میں عبدالحق صاحب کے مجدد الف ثانیؒ سے تعلقات کسی حد تک کشیدہ تھے اس لئے ممکن ہے تقاضۂ بشری کے تحت ان کے حالات کتاب میں شامل نہ کئیہوں اور جیسا کہ محدث صاحب خود دیکھتے ہیں کہ ۱۰۰۰ھ تک کے مشائخ کے حالات درج کررہا ہوں جبکہ مجدد الف ثانی صاحب کا انتقال ۱۰۳۴ھ میں ہوا ہے اور ان کے انتقال کی تاریخ اس کتاب میں درج ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مجدد الف ثانی کے حالات بعد میں اس کتاب میں شامل کئے گئے۔ حالانکہ اس کتاب میں کچھ

بزرگوں کے حالات وواقعات ۱۰۰۰ھ کے بعد کے بھی شامل ہیں۔لیکن ۳۴ سال تک کتاب کا لکھا جانا ناممکن ہے۔[۱۰]

اخبار الاخیار کی تصنیف میں ظاہر ہے بہت سی کتابوں سے مدد لی گئی ہوگی۔لیکن محدث صاحب نے ان کی فہرست درج نہیں کی ہے۔ بیچ بیچ میں کچھ کتابوں کا ذکر ضرور کیا ہے جیسے تحفتہ المجالس، خیر المجالس، سیر الاولیا، تاریخ فیروز شاھی اور اتحاف التقی فی فضلِ شیخ علی متقی از شیخ عبد الوہاب وغیرہ۔ کہیں کہیں آپ نے کچھ صوفیا حضرات کے حالات یادداشت سے بھی لکھے ہیں۔ جیسے کہ سیّد سلطان بھروچی کے حالات لکھتے وقت ابتداء میں لکھتے ہیں کہ والد صاحب فرمایا کرتے تھے۔

اخبار الاخیار کے مصنف کی خوبی یہ ہے کہ اکثر صوفیوں کی قبروں کی نشاندھی کی ہے۔کہاں اور کس شہر میں ہے اور بہت سے صوفیا حضرات کی تالیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔

جہاں تک عبد الحق صاحب کی قابلیت اور ادبی خدمات کا تعلق ہے وہ محدث ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے عالم اور اچھے مصنف بھی تھے انہوں نے تقریباً ہر شعبہ میں اپنی نگارشات یادگار چھوڑی ہیں اور وہ بھی اتنی کثیر تعداد میں یعنی ۶۰ (ساٹھ)۔

صوفیا حضرات کے القاب اور ان کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے۔ مثال کے طور پر گیسو دراز کے نقب اور اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہیں کہ شیخ نصیر الدین محمود چراغ دھلوی کی پالکی جس طرح دوسرے مرید اٹھاتے تھے اسی طرح سید محمد بھی اٹھایا کرتے تھے۔ ایک دن آپ اپنے شیخ کی پالکی اٹھانے لگے تو اس کے ایک حصہ میں آپ کے بال الجھ گئے اگر نکالتے تو دیر لگتی اور اس سے شیخ کے کبیدہ خاطر ہونے کا احتمال تھا۔ اس لئے شیخ کے عشق ومحبت میں اس کیفیت سے چلتے رہے، بہت فاصلہ طے کرجانے کے بعد جب شیخ کو معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور آپ کی اسی سچی محبت اور پکی عقیدت پر آفرین کی۔[۱۱]

اکثر صوفیا حضرات کے آثار اور تالیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر سیّد یوسف ابن سیّد جمال الحسینی کے ذکر میں رقم طراز ہیں کہ آپ نے قاضی نصیر الدین بیضاوی

کی مشہور کتاب لُبّ اللباب فی عِلمِ الاِعراب کی ایک مفصل شرح بھی لکھی ہے، جو یوسفی کے نام سے معروف ہے۔ نیز آپ نے مشہور کتاب ۱۲منار کی بھی ایک شرح لکھی ہے جو توجیہ الافکار کے نام سے مشہور ہے۔

کبھی کبھی وہ صوفیہ کی تحریروں پر بھی تبصرہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ نورالحق والدین کے حالات کے ضمن میں ان کے خطوط پر تبصرے کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''شیخ نور الحق یعنی شیخ نور قطب عالم کے خطوط کے اندر وہ شیرینی اور الفاظ کے معنی میں وہ لطف وسرور ہے جو دل والوں کے دل کا علاج اور اہلِ دل کے لئے محبت کا پیغام ہے''۔

کہیں کہیں صوفیا کی تاریخ پیدائش یا وفات کا ذکر نہیں ہے غالبًا جہاں تاریخ میں شبہ یا تصدیق نہیں ہو سکی ہوگی وہاں تاریخ نہیں لکھی۔ کیونکہ محدث تھے اس لئے جو بات لکھی ہے تصدیق کے بعد لکھی ہے۔ جیسا کہ کتاب کے مقدمے میں انھوں نے خود تحریر فرمایا ہے۔

اخبار الاخیار کئی بار ہندوستان اور پاکستان سے چھپی ہے۔ اصل کتاب فارسی میں ہے اس کا اردو ترجمہ مکتبہ دانش، دیوبند، یوپی سے بھی شائع ہوا ہے جو اس مقالے کی تحریر کے وقت میرے پیش نظر رہا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دھلوی اور ان کی تصنیف اخبار الاخیار کے مختصر تعارف کے بعد اب اخبار الاخیار میں مذکور گجرات کے صوفیا ومشائخ کا ذکر جو طبقہ سوم میں ہے پیشِ خدمت ہے۔

شیخ حسام الدین ملتانی

پیدائش : ۶۷۱ھ وفات : ۷۵۳ھ

آپ خواجہ نظام الدین اولیاء کے خلفاء میں سے تھے، قدیم طرز کے بزرگوں کے طریقۂ کار پر گامزن تھے زہد ودرویشی پارسائی اور بزرگی میں اپنے ہمعصر بزرگوں میں ممتاز اور سربلند تھے۔ آپ متاہل تھے۔

آپ کے بارے میں شیخ نظام الدین اولیاء فرمایا کرتے تھے کہ شہر دھلی شیخ حسام

الدین کی نگرانی میں ہے۔

محدث صاحب مزید لکھتے ہیں کہ شریعت کی کتابوں میں ہدایہ اور بزوری اور تصوف میں قوت القلوب اور احیاء العلوم آپ کے اکثر زیرِ مطالعہ رہا کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے بہت سی ایسی روایتیں بھی نقل کی ہیں جو حسام الدین ملتانی سے منسوب ہیں۔ ان میں سے ایک روایت درج ذیل ہے:

منقول ہے کہ جس سال سلطان محمد تغلق نے ساکنانِ دھلی کو ایک نیا شہر بنام دیوگیر آباد کرنے کے لئے دہلی سے روانہ کرنا شروع کیا، تو مولانا حسام الدین دہلی سے گجرات چلے گئے اور گجرات ہی میں اپنی جان کو جان آفرین کے سپرد کردیا، آپ کا مزار گجرات کے قدیم شہر پٹن (پاٹن) میں واقع ہے اور مرجع خلائق ہے۔ ۱۳؎

قاضی شمس الدین شیبانی رحؒ

پیدائش : ۷۴۰ھ وفات : ۸۰۹ھ

آپ بہت بڑے دانشمند تھے۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں دہلی سے نارنول تشریف لے گئے۔ ابتدائی زمانہ میں شادی سے پہلے آپ حج کے ارادہ سے نکلے، راستہ میں جب گجرات پہنچے تو ایک مسجد میں دیکھا کہ ایک معتزلی منبر پر اپنے مذہب معتزلہ کے پیش نظر بندوں کے خالقِ افعال ہونے پر تقریر کررہا ہے اس نے اپنی تقریر کے دوران ان لوگوں سے کہا کہ دیکھو یہ میرا ہاتھ ہے اگر میں اسے کھولنا چاہتا ہوں تو یہ کُھلتا ہے اور مٹھی بند کرنا چاہتا ہوں تو بند ہوجاتی ہے۔ قاضی شمس الدین صاحب کھڑے ہوئے اور آپ نے اس معتزلی سے فرمایا کہ اگر آپ اپنے تمام افعال کے خالق ہیں اور اپنے وجود کے متعلق سب کچھ کرسکتے ہیں تو پھر اپنے ہاتھ کو اپنی پیٹھ پر لے جاکر کیوں نہیں ملا سکتے؟ قاضی شمس الدین کا یہ اعتراض حاکم گجرات کو بہت پسند آیا اور اس پسندیدگی کا اظہار اس طرح کیا کہ دارالحرب سے جو لونڈیاں آئی تھیں ان میں سے ایک لونڈی شیخ کی خدمت میں پیش کی جس کے بطن سے آپ کو اولاد ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد میں اس طرح برکت عطا فرمائی کہ سب کو

علم سے نوازا۔ آپ کی اولاد میں سے ایک بزرگ جن کا لقب تاج الافاضل تھا ان کے پانچ لڑکے تھے جو سب کے سب عالم، متقی اور بڑے عاقل تھے۔ آپ کے یعنی تاج الافاضل کے ایک صاحبزادے قاضی مجد بھی تھے جو شیخ احمد مجدد کے والد تھے۔ ان کے بھی سات لڑکے ہوئے جو سب کے سب عالم باعمل تھے۔[۱۴]

شیخ احمد کھٹو

پیدائش : ۷۳۷ھ وفات : ۸۴۹ھ

آپ علاقہ گجرات کے مشائخین میں سے بڑے شیخ ہیں، احمد آباد کے مضافات میں ایک قصبہ سرکھیج میں آپ کا مزار ہے، آپ کا مقبرہ نہایت ہی پاکیزہ منزّہ اور ہوادار ہے کہ اس کی مثال دنیا میں شاید ہی کہیں ہو۔ کھٹو ایک گاؤں کا نام ہے جو اجمیر کے قریب ہے شیخ احمد کے آباواجداد دہلی کے باشندے تھے اور آپ کا بچپن بھی دہلی ہی میں گذرا تھا۔

مشہور ہے کہ آپ ایک بار ایک گاؤں میں بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے کہ سخت طوفان و آندھی آئی جو آپ کو وہاں سے اڑا کر کسی اور جگہ لے گئی اور آپ اپنے وطن سے دور مسافروں کی طرح بے یار و مددگار ہو گئے۔ اس زمانے میں آپ کس مپرسی کی حالت میں ادھر ادھر گھوم کر وقت گزارا کرتے تھے۔ ایک دن بابا اسحاق مغربی کے ہاتھ لگ گئے جو اس وقت کے بڑے کامل درویش تھے وہ آپ کو اپنی قیام گاہ علاقہ کھٹو میں جو اجمیر کے قریب ایک گاؤں ہے اپنے ہمراہ لے آئے چنانچہ شیخ احمد نے بابا اسحاق مغربی کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی اور ان کی مہربانیوں اور عنایتوں سے اس طرح مالا مال ہوئے کہ انھوں نے آپ کو کامل ولی اللہ بنادیا۔ بعدہٗ خلافت واجازت بھی عنایت فرمادی۔ آپ کا سلسلہ شیخ ابو مدین مغربی سے جاکر ملتا ہے چونکہ آپ نے زندگی کی بڑی طویل بہاریں دیکھی تھیں اس لئے آپ کے اور نبی علیہ السلام کے درمیان مشائخ کا واسطہ بہت کم ہے۔ یعنی صرف پانچ بزرگوں کے واسطہ سے آپ کا سلسلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مل جاتا ہے۔ آپ کے تمام بزرگوں کی عمریں ڈیڑھ سو برس سے زائد تھیں آپ نے ابتداء دہلی میں تعلیم حاصل کی

اور تحصیل علم کے بعد مسجد خان جہاں میں بے انتہا ریاضت کی اس زمانے میں آپ کی کیفیت یہ تھی کہ دن بھر روزے سے رہتے اور شام کو کھلی کے ایک ٹکڑے سے روزہ افطار فرماتے۔ بس یہی آپ کی غذا تھی۔ پھر جب چلّہ کشی کرنے گئے تو چالیس روز میں صرف ایک کھجور کھایا کرتے تھے۔ آپ نے دنیا کو اس طرح ترک کیا کہ عمر بھر شادی نہیں کی، اس زمانہ میں آپ عالمِ بالا اور عالمِ فرشتگان کی سیر فرمایا کرتے تھے۔ آپ حرمین شریفین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے، آپ کو نبی علیہ السلام نے (کوئی نامعلوم) بشارت بھی دی تھی۔ اور آپ متعدد بزرگوں کی صحبت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ ظفر خاں جو فیروز شاہ کی حکومت کی طرف سے نہر والہ کا حاکم تھا اور بعد میں سلطان مظفر کے لقب سے مشہور ہوا وہ جب گجرات کا بادشاہ ہوا تو ان قدیم تعلقات کی بناء پر جب کہ شیخ احمد دہلی میں مقیم تھے اور باہمی شناسائی تھی اس سلطان مظفر نے شیخ احمد کو مجبور کیا کہ آپ گجرات تشریف لائیں اور یہیں مستقل سکونت اختیار فرمائیں۔ چنانچہ آپ تشریف لے آئے اور سرکھیج میں رہنے لگے وہاں کے لوگوں نے آپ کی ظاہری اور باطنی برکتوں سے استفادہ کیا۔ آپ لوگوں کی حتی المقدور امداد فرماتے تھے۔ آپ کے اخلاق عالیہ کی وجہ سے تمام لوگ آپ سے محبت کرنے لگے تھے۔ آپ کی زندگی میں ہر آنے والے فقیر کے لئے آپ کا دسترخوان وسیع تھا۔ اس لئے آپ کے انتقال کے بعد بھی اس طریقے کو بحالہ جاری رکھا گیا۔ جس سے فقیر، امیر، غریب اور بادشاہ سبھی سیراب ہوتے تھے۔

آپ کے ایک مرید بنام محمود بن سعید ایرجی نے آپ کے حالات واقوال کو جمع کر کے اس کا نام تحفۃ المجالس رکھا ہے۔ اس میں شیخ کے احوال وکرامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ [15]

قطب عالمؒ

پیدائش : ۸۰۱ھ   وفات : ۸۵۷ھ

آپ مخدوم جہانیان سیّد بخاری کے پوتے تھے۔ اپنے آبائی وطن سے منتقل ہو کر گجرات میں مقیم ہوئے اور پھر گجرات ہی کو اپنا جدید وطن بنالیا تھا۔ آپ کا نام سیّد برہان

الدین تھا اور قطب عالم کے لقب سے مشہور تھے، احمد آباد سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ بتوہ ہے وہاں آپ کا مزار ہے آپ نے ۸۵۷ھ میں انتقال فرمایا جس کے اعداد ''مطلع یومُ التر وِیہ'' سے نکلتے ہیں۔ آپ کے مزار پر ایک پتھر پڑا ہے جس کے اندر پتھر، لوہے اور لکڑی تینوں چیزوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں۔ کسی شخص کو صحیح طور سے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کس چیز کا ہے۔ اگر آپ اسے ابتداً دیکھیں تو آپ کو پتھر معلوم ہوگا پھر ذرا غور سے دیکھیں تو لوہا اور مزید غیر کرنے پر لکڑی معلوم ہوگا۔ غرضیکہ لوہا، لکڑی اور پتھر تینوں کے اوصاف اس کے اندر موجود ہیں اور اس کے کسی حصے کو جدا اور علیحدہ بھی نہیں کیا جاسکتا یہ ایک عجیب چیز ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس عجیب پتھر کے بارے میں روایت یوں نقل کی جاتی ہے کہ ایک دن آپ پانی میں چل رہے تھے کہ اس دوران میں آپ کے پاؤں میں کوئی چیز چبھی، لوگ اس کو نکال کر لائے تو آپ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ تو لوہا ہے یا پتھر ہے یا لکڑی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر تینوں صفتیں جمع کر دیں۔ [16]

شاہ عالمؒ

پیدائش : ۸۲۵ھ وفات : ۸۸۰ھ

آپ قطب عالم کے بیٹے تھے۔ آپ کا نام شاہ منجھن لقب شاہ عالم تھا۔ آپ کی قبر احمد آباد میں ہے آپ کا روضہ اس علاقہ کے رہنے والے لوگوں کیلئے زیارت گاہ ہے اور ایک ایسے پاکیزہ، بلند لطیف اور نظیف علاقہ میں واقع ہے جو بہت کشادہ اور وسیع خطہ ہے، جمعرات کو شہر کے اچھے اور برے سبھی لوگ آپ کے مزار پر جاتے اور رات بھر وہیں رہتے ہیں۔

مشہور ہے کہ شاہ عالم کی تصوف اور سلوک میں کچھ عجیب سی حالت تھی اکثر اوقات آپ پر مستی کا عالم چھایا رہتا تھا کبھی کبھی ریشمی لباس بھی پہن لیا کرتے تھے اور ملامتیہ فرقے کے پیروکار نظر آتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی ولایت پر کھلے اور واضح دلائل موجود تھے اور شیخ احمد کھتو آپ کی تربیت وارشاد کے ذمہ دار تھے۔ آپ کثیر الکرامات

بزرگوں میں تھے۔ ۸۸۰ھ میں آپ نے وفات پائی جس کے عدد کو لفظ ''فخر'' ظاہر کرتا ہے۔

شیخ قطب عالم اور شاہ عالم کے کچھ خلفاء بھی احمد آباد میں مدفون ہیں گجرات کے مشہور شہر پٹن (پاٹن) میں خاص طور پر شیخ نظام الدین اولیاء کے مشہور خلیفہ شیخ حسام الدین ملتانی کا مزار مشہور ہے۔ حضرت محدث مزید فرماتے ہیں کہ یہ علاقہ ایسا ہے کہ یہاں سے عشق ومحبت کی خوشبو آتی ہے اور اس کے جنگلوں اور کھنڈروں سے ولایت کی برکت کے انوار درخشاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ شہر ہمیشہ اہلِ دل کی آماجگاہ ہے اس لئے آج بھی اس میں اہلِ دل بستے ہیں غرضیکہ آپ اپنے وقت کے علماء اور مقبولانِ درگاہ رب العلیٰ لوگوں میں سے تھے۔ ۱۷

داور الملک

پیدائش : ۹۵۲ھ وفات : ۱۰۳۱ھ

آپ کا نام عبد اللطیف تھا۔ آپ سپاہیانہ مزاج کے آدمی تھے۔ اس لئے عام لوگوں کے اندر رہتے ہوئے بھی سپاہیانہ لباس پہنا کرتے تھے۔ آپ خصوصی اوصاف کے حامل تھے۔ آپ کی عظمت وقبولیت کے بیشمار آثار آپ کے اندر موجود تھے۔ گجرات میں جوناگڑھ میں آپ کی قبر ہے۔ گجرات اور دکن کے علاقہ کے اکثر لوگ ہر سال آپ کے مقبرے کی زیارت کے لئے جمع ہوا کرتے ہیں۔ اندھے اور بیمار قسم کے لوگ خصوصاً آتے رہتے ہیں۔ جس طرح دہلی میں شیخ بہلیم کی ولایت و بزرگی کا شہرہ ہے اسی طرح گجرات میں آپ مشہور ہیں۔ آپ ۱۰۳۱ھ میں ایک جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے۔

تاریخ فیروز شاہی میں تحریر ہے کہ آپ کا نام دراصل سپہ سالار مسعود غازی تھا۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے ساتھ کے غازی تھے۔ سلطان محمد تغلق جب بھروچ جاتا تو آپ کے مزار مقدس کی زیارت کیا کرتا تھا۔ اور وہاں کے مجاوروں کو بہت مال ودولت دیا کرتا تھا۔

عبدالحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں کہ: آپ سے خواجہ معین الدینؒ کے مرید ہونے کا تاریخ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا اور آپ کے ملفوظات میں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں اور یہ جو مشہور ہے کہ آپ کو جھنڈیاں بہت پسند تھیں اسی لئے لوگ آپ کے مزار پر جھنڈیاں لاتے ہیں۔ یہ سب زمانۂ حال کی پیداوار اور بدعت ہے۔ آپ گجرات کے علاقے کے بڑے کامل ولی تھے۔ ١٨

قاضی محمود

پیدائش : ٨٤٦ھ وفات : ٩٢٥ھ

آپ صاحب سکر اور صاحب ذوق بزرگ تھے۔ عشق ومحبت آپ کا مشرب تھا۔ اور حلاوت آپ کی کیفیت تھی۔ ہندی زبان میں آپ نے بہت سی کافیاں لکھی ہیں جو اس علاقے کے نعت خواں اکثر پڑھتے رہتے ہیں، یہ کافیاں لوگوں میں بے انتہا مقبول ہیں، موثر ہونے کے علاوہ بڑی بے تکلفانہ انداز اور زبان میں ہیں۔ آپ کا تمام کلام عشق سے بھرا ہوا ہے۔

منقول ہے کہ جب آپ کا انتقال ہوگیا تو دفن کرتے وقت آپ کے والد بزرگوار نے آپ کے منہ سے کپڑا ہٹا کر دیدار کیا تو آپ آنکھیں کھول کر ہنسنے لگے یہ حالت دیکھ کر آپ کے والد نے فرمایا کہ بابا محمود! یہ بچوں جیسی ادا کیسی؟ چنانچہ اتنا سننے کے بعد آپ نے آنکھیں بند کرلیں۔ آپ نے اپنے ابتدائی دور میں جیسے بڑے رئیس لوگ اور بڑے مشائخ ٹھاٹ باٹ سے رہا کرتے ہیں اسی انداز سے زندگی گزاری تھی اور یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ سلطان مظفر بن سلطان محمود کی حکومت تھی۔

آپ ٩٢٠ھ میں اپنے آبائی وطن قصبہ بیرپور علاقہ گجرات میں تشریف لے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی آپ کا مزار بھی اسی قصبہ میں ہے۔ آپ اپنے علاقہ کے متاخرین مشائخ میں سے تھے۔ ١٩

شیخ وجیہ الدینؒ

پیدائش : ۸۹۵ھ وفات ۹۹۷ھ

آپ بڑے معمر اور کامل ولی اللہ تھے، جامعِ کمالات وبرکات آپ ریاضت بہت کیا کرتے تھے۔ تصنیف وتالیف اور طالب علموں کی تربیت وہدایت آپ کے محبوب مشغلے تھے۔ آپ نے اکثر کتب کے حواشی اور شروح بھی لکھی ہیں۔ شہر کے عام لوگوں جیسا لباس پہنتے تھے۔ سلوک میں آپ کو شیخ محمد غوث سے عقیدت اور نسبت حاصل تھی۔ لیکن بیعت کسی اور بزرگ سے تھے۔ ۹۹۷ھ میں آپ کی وفات ہوئی اور اپنی خانقاہ کے صحن ہی میں دفن کئے گئے۔

عبدالحق صاحب مزید لکھتے ہیں کہ میں جب دیار حبیبﷺ کی زیارت کے لئے حجاز جا رہا تھا تو راستہ میں گجرات پڑتا تھا چنانچہ میں نے وہاں شیخ وجیہ الدین کی زیارت کا شرف حاصل کیا آپ سلسلہ قادریہ کا اکثر طور پر ذکر کیا کرتے تھے۔ اس وقت آپ کے حقیقی بیٹے شیخ عبداللہ آپ کے جانشین ہیں جو بڑے باعلم، بردبار اور ریاضت وہمت اور پاک دامنی میں یکتائے زماں اور درویشوں کے تمام اخلاق واوصاف کے حامل ہیں۔[۲۰]

شیخ جلال گجراتیؒ

پیدائش : ۸۳۹ھ وفات : ۸۹۹ھ

آپ شیخ پیارےؒ کے مرید اور اپنے وقت کے کامل ولی اللہ اور صاحب کرامات تھے اور ظاہری وباطنی کمالات کے حامل تھے۔ کہتے ہیں کہ علاقہ گجرات کے رہنے والے تھے۔ لیکن گور و بنگالہ میں بادشاہوں کی طرح رہتے اور احکام جاری کرتے تھے۔ اہل غرض لوگوں نے بادشاہ گور کے دل میں آپ کے متعلق مختلف قسم کے وہم اور شبہات پیدا کر دیئے۔ جس کی وجہ سے بادشاہ نے آپ کو شہید کرا دیا۔

منقول ہے کہ جلاد اور قاتل آپ کی خانقاہ میں داخل ہوئے اور خون ریزی شروع

کردی، وہ جب آپ کے کسی مرید کو قتل کرتے تو آپ یا قہار یا قہار پڑھتے لیکن جب ان لوگوں نے آپ پر تلوار چلائی تو آپ نے یا رحمٰن یا رحمٰن پڑھا اور یہی کہتے کہتے شہید ہو گئے۔ شہید ہو جانے کے بعد آپ کا سر زمین پر پڑا ہوا اللہ اللہ کی صدائیں بلند کر رہا تھا۔۲۱

شیخ علی پیرو گجراتی

آپ صوفی اور بڑے موحد عالم تھے علوم باطنی اور ظاہری میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ آپ نے بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں جو بہت عمدہ اور مفید ہیں۔ آپ کی تالیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) شرح فُصوص الحِکَم اس کتاب میں آپ نے ظاہر کو باطن کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) جادلتہ التوحید اس میں بہت ہی مختصر اور پاکیزہ مضامین ہیں ان کے علاوہ بھی آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

''رسالہ جادلتہ التوحید'' میں عقلی و نقلی دلائل سے شکوک وشبہات کو محققانہ انداز سے رد کیا ہے اس رسالہ کی ابتداء میں بہت سی قرآنی آیات اور احادیث نبوی لکھی ہیں جن سے نفس مضمون کی وضاحت وصراحت میں مدد ملتی ہے۔

عبدالحق محدث نے صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے اور تاریخ ولادت یا وفات درج نہیں کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کاتب کی غلطی سے سنہ رہ گیا ہو یا پھر، ایسا بھی ممکن ہے کہ حضرت کو لکھتے وقت سنہ یاد نہ ہو اور اس پر عدد لکھنے کو مزید تحقیق پر موقوف رکھا ہو۔ بعد میں لکھنا بھول گئے ہوں بہر حال کسی نامعلوم وجہ سے سنہ متروک ہے۔

آخر میں محدث موصوف نے ۹ قرآنی آیات کو بہ طورِ مثال درج کر دیا ہے جنھیں یہاں نقل کرنا باعث طوالت ہوگا۔۲۲

شیخ کبیر

پیدائش : ۷۹۹ھ   وفات : ۸۶۳ھ

آپ شیخ فرید بن عبد العزیز بن شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ کی اولاد میں سے تھے۔ بڑے بزرگ اور بلند مرتبہ ولی تھے۔ علوم ظاہری و باطنی میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ کتاب دھن جو مصباح کی شرح ہے، آپ کی ہی تصنیف ہے، ناگور سے اہلِ باطن کی فرقہ پردازیوں کی وجہ سے، ہجرت کر کے گجرات چلے گئے تھے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔۲۳

سیّد سلطان بھروچیؒ

پیدائش ۸۵۹ھ   وفات : ۹۴۹ھ

سیّد سلطان بھروچی اہلِ دل، خاکسار اور صاحب ہمت درویش تھے۔ شیخ علاؤ الدین کے مرید تھے۔ مگر تلقین وارشاد کا تعلق مشرب شطاریہ سے رکھتے تھے، لباس میں صرف ستر عورت پر اکتفا کرتے اور عام طور پر ننگے سر رہا کرتے تھے کبھی درویشوں کے ساتھ رہتے اور کبھی عالم تنہائی میں رہتے تھے، دنیوی رسوم سے آزاد رہا کرتے تھے۔ ذکر بالجبر زیادہ کرتے تھے۔ دوران ذکر میں آپ اپنے قلب پر اس زور سے ضرب لگاتے تھے کہ جس طرح صنوبر کی لکڑی چیرتے وقت کٹر کٹر کی آوازیں نکلتی ہیں۔ اسی طرح آپ کے دل سے آوازیں نکلتی تھیں۔

عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ میرے والد صاحب نے فرمایا کہ میں پہلے طلب حق کے سلسلہ میں سلطان بھروچی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ اس وقت کتابت میں مشغول تھے، میں بیٹھے بیٹھے سر نیچا کئے چپکے چپکے ذکر کرنے لگا تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کر میری طرف غصہ سے دیکھنے لگے اور بعد میں تبسم فرمایا اور مجھے اپنے سینہ سے لگایا اور مہربانی فرمائی، لیکن مجھے حقیقت دریافت کرنے کی جرأت نہ ہوئی، پھر جب میں وہاں سے چلا گیا تو آپ

نے خود مجلس میں ذکر کیا کہ آج میری خدمت میں ایک نوجوان آیا جو قلب سے ذکر رہا تھا۔ مجھے غیرت آئی چاہا کہ اس کے دل پر طمانچہ ماروں لیکن میرے پیرومرشد حاضر ہوئے فرمایا رحم کا مقام ہے، حکایت ہے کہ آپ کو ایک ہندو عورت سے محبت ہوگئی تھی جو آپ کی توجہ کی بدولت مسلمان ہوگئی تھی، اس کے قبیلہ کے لوگوں نے محمد زماں کے یہاں جو ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے رشتہ دار تھے مقدمہ داخل کر دیا۔ محمد زماں نے آپ کی طرف پیغام بھیجا کہ اس عورت کو گھر سے نکال دو ورنہ تم پر حملہ کروں گا، آپ نے تلوار ہاتھ میں لے کر فرمایا کہ یہ مسلمان ہوگئی ہے اس کا کافروں کے سپرد کرنا ناجائز ہے، اگر آپ کو لڑائی کا شوق ہے تو جلدی آجایئے، دیکھئے اللہ تعالیٰ کیا معاملہ فرماتے ہیں۔ آپ کے اس جواب سے محمد زماں مرعوب ہوگیا اور اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا۔

آپ کے مرید اور خلفاء میں سے شیخ ابن انیروھ بھی ہیں جو بوڑھے بابرکت اور مجذوب شکل تھے۔ اللہ سب پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔[۲۴]

شیخ علی بن حسام الدین

پیدائش : ۱۴۸۰ء وفات : ۱۵۶۷ء

آپ کے والد ماجد کا نام عبدالملک ابن قاضی خاں المتقی القاری الشاذلی المدینی چشتیؒ ہے۔ آپ کے آبا واجداد جونپور سے آکر برہان پور میں مقیم ہوگئے تھے۔ آپ کی ولادتِ باسعادت برہان پور ہی میں ہوئی ہے۔ آپ کے والد نے آپ کو آٹھ سال کی عمر میں شاہ باجن چشتی کے پاس لے جاکر مرید کرادیا جو اس زمانہ میں برہان پور میں مقیم تھے اور اس واقعہ کے چند دن بعد آپ کے والد نے وفات پائی، والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ بلحاظ طبیعتِ انسانی کچھ عرصہ لذاتِ حِسیہ میں مشغول رہے اور نوجوانی کے زمانے ہی میں بمقام مندو ایک بادشاہ کی ملازمت کی اور شنیاوی دولت جمع کی، اسی اثنا میں اللہ کی عنایت اور ہدایت کے جذبے نے اپنی طرف مائل کیا چنانچہ دنیاوی مال و زر اور اس کی بے ثباتی دیکھ کر شیخ عبدالحکیم ابن شاہ باجن کی خدمت میں پہنچے جن سے مشائخ چشت کی خلافت

کا خرقہ حاصل کیا اور چونکہ آپ کی فطرت میں تقویٰ و پرہیز گاری کا غلبہ تھا اس لئے ملتان پہنچ کر شیخ حسام الدین متقی کی خدمت کرنے لگے اور ان کی صحبت بابرکت کی بدولت سلوک وطریقت تقویٰ و پرہیز گاری کی نعمتوں سے مالا مال ہوئے۔ نیز انہی کی صحبت میں رہتے ہوئے دو سال کی مدت میں تفسیر بیضاوی اور العلم کا مطالعہ کیا اور تقویٰ و توکل کو اپنا سفر خرچ بنا کر حرمین شریفین کی طرف روانہ ہوئے۔ مکہ معظمہ پہنچ کر شیخ الحدیث ابو الحسن بکری جو کہ اپنے وقت کے مانے ہوئے ولی اللہ تھے، خدمت میں رہ کر حاضری کا شرف حاصل کیا اور انہی کے شاگرد ہوئے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن سے مشائخِ زماں استفادہ کرتے تھے۔ آپ نے دوسرے مشائخ کی بھی خدمات کیں چنانچہ شیخ محمد بن محمد بن محمد سخاوی کی خدمت میں رہ کر سلسلہ عالیہ قادریہ کا خرقہ حاصل کیا تھا اور قطبِ زماں شیخ نور الدین ابو الحسن علی الحسن شاذلی سے سلسلہ شاذلیہ کا اور شیخ ابو مدین شعیب مغربی سے سلسلہ مدینہ کا خرقہ حاصل کیا پھر وہیں مکہ مکرمہ میں مقیم ہوگئے اور تمام دنیا کو اپنے انوارِ اطاعت ومجاہدات اور علمی وعملی فیوضات سے مستفیض کیا۔ عبادت وریاضت میں مشغول رہنے کے باوجود آپ نے علمِ تصوف وحدیث میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی خدمات تصنیف وتالیف دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ آپ نے شیخ جلال الدین سیوطی کی کتاب جمع الجوامع کی احادیث کو حروفِ تہجی کے تحت جمع کر کے تمام اقوال وافعال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسائل فقیہ کے طریقہ پر باب وار لکھا ہے ان کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کتنا کام کیا ہے نیز آپ نے ان کتب میں سے احادیث مکرّر کو چھانٹ کر اس کا انتخاب علیٰحدہ مرتب کیا۔ شیخ علی گجرات اس زمانے میں آئے جب کہ وہاں سلطان بہادر کی حکومت تھی وہ آپ کے اوصاف وکمال سنکر آپ کا معتقد ہوگیا اس نے آپ کو گراں قدر انعامات اور کچھ جاگیر دینا چاہی لیکن آپ نے سلطان کی پیش کش قبول نہیں کی اس زمانے میں آپ کی کیفیت یہ تھی کہ آپ جدھر جاتے لوگ آپ کے پیچھے آتے اور پروانہ کی طرح اکٹھا ہو جاتے آپ اپنے کمرے کا دروازہ بند رکھتے اور کسی کو اپنے ساتھ نہ بٹھاتے، عالم متقی اور صالح قاضی عبداللہ سندھی جب کہ وہ بغرض روانگی حج اپنے اہل وعیال اور دوسرے اکثر

لوگوں کے ساتھ تھوڑے دن کے لئے گجرات میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ نیز شیخ علی سے ان کو بھی محبت والفت اور پکا اعتقاد ہو گیا انہوں نے شیخ علی سے عرض کیا کہ اگر ایک مرتبہ سلطان بہادر کی التماس قبول فرمالیں تو اچھا ہوگا اگر مرضی نہ ہو تو اس سے گفتگو نہ فرمائیے گا ہم لوگ اس وقت حاضر رہیں گے اور اس کو اپنی باتوں میں لگائے رکھیں گے اس طرح اس کی آرزو پوری ہوجائے گی۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ بادشاہ کے لباس اور وضع قطع سے غیر اسلامی چیزیں چھلکتی ہیں۔ یہ کسی طرح ہوسکتا ہے کہ میں اسے دیکھنے کے بعد امر بالمعروف اور نُہی عَنِ المنکر نہ کروں۔ جس پر ان لوگوں نے عرض کیا ہم خادم حسبِ موقع جو مناسب سمجھیں گے، کہیں گے اور کریں گے لیکن بادشاہ کی خواہش یہ ہے کہ ایک مرتبہ خدمت عالی میں حاضری دیں غرضکہ سلطان نے حاضری دی اور شیخ کے معتقدین نے اسے نصیحتیں کیں۔ اس ملاقات کے دوسرے دن سلطان نے ایک کروڑ روپیہ گجراتی بطور تحفہ شیخ کی خدمت میں روانہ کئے جو آپ نے سب کے سب قاضی عبد اللہ کو دیتے ہوئے فرمایا یہ چونکہ بادشاہ کی ملاقات کے تم ذریعہ تھے اس لئے یہ سارے رقم تمہاری ہے۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ طالبوں اور مریدوں کی تربیت وارشاد ہمارے پیر ومرشد اس طرح کیا کرتے تھے کہ اس کی ظاہری حالت کو برقرار رکھتے ہوئے خود ان کے باطن کی تربیت میں لگ جاتے اور اپنی توجہ اور ہمت کے ذریعہ ان طالب علموں اور مریدوں کو راہِ سلوک پر گامزن کیا کرتے تھے اور یہ تمام تعلیم وتربیت اس طرح کیا کرتے تھے کہ مریدوں اور طالبوں کو آپ کے عمل کے مطلق اطلاع نہ ہونے پاتی تھی۔

شیخ علی فرمایا کرتے تھے کہ طالب علموں کی تربیت میں مشائخ کرام دو طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ مرید میں جو خرابیاں ہیں پہلے ان کو انہی کے ذریعہ سے دور کراتے تھے بعد میں خود تصرف کرتے یہ طریقہ مریدوں کے لئے زیادہ مشکل تھا، مشائخ کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مرید کو اس کی حالت پر چھوڑ کر خود اس کی اصلاح میں مشغول ہوجائے اور آہستہ آہستہ اس میں نورانیت پیدا کرنے کی کوشش کرے جو اس کو مطلوب تک پہنچاتی ہے یہ طریقہ مرید پر زیادہ آسان ہے۔

اپنی وفات سے قبل شیخ علی نے فرمایا تھا کہ جب تک میری انگشت شہادت متحرک رہے اس وقت تک یقین رکھنا کہ میں زندہ ہوں اور جس وقت میری انگشت شہادت حرکت نہ کرے بلکہ بے حس وحرکت ہو جائے تو سمجھ لینا کہ میری موت واقع ہو چکی ہے۔ چنانچہ آپ کے انتقال کے بعد جب آپ کے جسم میں کسی قسم کی گرمی تک باقی نہ رہی تھی آپ کی انگشتِ شہادت برابر حرکت کر رہی تھی۔ آپ نے صبح سویرے ۲ رجمادی الثانی ۹۷۵ھ کو وصال کیا اور بوقتِ وصال آپ کے لبوں پر ذکر الٰہی جاری تھا۔ آپ کی تاریخِ وفات قضیٰ نَحبَہٗ اور بعض لوگوں نے ''شیخِ مکّہ'' اور ''متابعتِ نبی'' بھی نکالی ہے۔[۲۵]

میاں غیاثؒ

پیدائش : ۸۹۵ھ　　　وفات : ۹۹۸ھ

علاقہ گجرات کے مشہور شہر بھروچ میں رہا کرتے تھے اللہ کے خاص بندوں میں سے تھے خَیرُ النَّاسِ مَنْ یَنْفَعُ النَّاسَ (بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو نفع پہنچائے) آپ پر صادق تھا۔

کہتے ہیں کہ عوام الناس کی ضرورت کی ہر چیز مثلاً روپیہ پیسہ، کپڑے، غذائیں، دوائیں، کتابیں، اسباب وسامان اور آلات وغیرہ سب اپنے گھر میں جمع کر کے رکھتے تھے۔ آپ کا بہترین کارنامہ یہ تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی دے دیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ آپ زبردست عالم، عامل، متّقی اور شریعت کے پیرو تھے حضرت محدث مزید لکھتے ہیں کہ سیّدی شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ بحالت خواب میں نے ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ اس زمانے میں سب سے اچھا کون شخص ہے تو جواب مرحمت فرمایا، میاں غیاث، پھر تمہارے شیخ علی متّقی اور پھر محمد طاہر اس زمانے کے بہترین آدمی ہیں۔[۲۶]

میاں محمد طاہرؒ

پیدائش : ۸۹۹ھ　　　وفات : ۹۷۹ھ

آپ علاقہ گجرات کے شہر پٹن میں سکونت پذیر تھے۔ اللہ نے آپ کو علم وفضل کی نعمتوں سے نوازا تھا۔ زیارت حرمین سے مشرف ہوگئے تھے۔ اور وہاں کے علماء مشائخ سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ شیخ علی متقی کی صحبت میں رہ کران کے مرید ہوئے، صاحب کرامت وبرکت ہوکر وطن واپس آئے اور آپ کے قوم میں جو بدعتیں رائج تھیں وہ ختم کر کے اہل سنت اور بدعتوں کا فرق اپنی قوم کو سمجھایا، علم حدیث میں بہت سی مفید کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان میں سے آپ کی ایک کتاب مجمع البحار بڑی مشہور ہے جس میں احادیث کی شرح لکھی ہے آپ کی ایک اور دوسری کتاب کا نام مُغنی ہے جس میں اَسماء الرجال کی صحت کی ہے اور روایانِ حدیث کا مختصر ومفید حال لکھا ہے اپنی کتابوں کے دیباچوں میں شیخ علی مُتقی کی بے انتہا تعریف کی ہے۔ آپ کا دستور تھا کہ اپنے پیر ومرشد کی وصیت کے مطابق، اپنے ہاتھ سے روشنائی بنا کر طالب علموں کو مُفت دیا کرتے تھے۔ پڑھاتے وقت بھی زبان سے پڑھاتے اور ہاتھ سے سیاہی گھوٹا کرتے اور کہتے ہاتھوں کوبھی کام میں لگا رہنا چاہئے۔ آپ نے علاقہ گجرات کے بدعتوں کی بدعتیں چھڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی لیکن اس جماعت کے افراد نے آپ کو ۹۷۶ھ مین شہید کر دیا۔ ۲۷

شیخ حسین رحمتہ اللہ

پیدائش : ۹۱۴ھ وفات ۱۰۰۵ھ

آپ شیخ عبدالوہاب کے دوستوں میں سے تھے۔ آپ کو راہِ تصوف میں ایک خاص رفتار حاصل تھی اور بے قیدی، بے تکلفی اور ہمت فرمائی میں ایک خاص طریقہ رکھتے تھے، شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ یہ شیخ حسین ہمارے رشتہ داروں میں سے تھے اور یہ عجیب حالت اور بلند ہمت کے مالک تھے معمولی چیزیں خریدتے وقت ان کے پاس جو کچھ ہوتا وہ سب بیچنے والے کو دیدیتے تھے خواہ وہ مظفری ہوتا یا روپیہ اور کبھی نہ سودا چکاتے تھے اور نہ اس کی قیمت کا حساب کرتے تھے۔

شیخ عبدالوہاب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم دریائے نربدا کو عبور کرنا چاہتے تھے

لیکن دریائے نربدا کے کنارے پر بہت سے لوگ اس لئے جمع تھے کہ نربدا کے بیچ میں ایک شیر اپنی کچھار میں بیٹھ گیا تھا جس کے باعث لوگ دریا میں آنے جانے سے مجبور ہوگئے تھے یہ دیکھ کر شیخ حسین اپنے ایک ہاتھ میں چاقو لے کر اور دوسرے ہاتھ پر ایک چادر لپیٹ کر کچار کے اندر گھس گئے اور شیخ کو وہاں ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوٹ آئے اور لوگوں کے آنے جانے کا راستہ کھول دیا۔ حضرت محدّث نے اس کے علاوہ اور بھی کئی واقعات بیان کئے ہیں۔ مگر یہاں صرف نربدا کا واقعہ نقل کیا گیا ہے کیونکہ نربدا اور مظفری سکہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ حسین گجرات ہی کے کسی علاقہ کے رہنے والے تھے۔ مندرجۂ بالا سطور میں شیخ حسین کی بابت جو تفصیلات فراہم کی گئی ہیں ان سے تو یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ آپ کس شہر یا قصبہ کے رہنے والے تھے، مگر شیخ بہاء الدین جونپوری کے احوال کے ضمن میں حضرت محدث نے جو معلومات درج فرمائی ہیں ان سے ضرور ان کے مسکن، تعلیم و تربیت، اخلاق و کرامات وغیرہ کی وضاحت ہوجاتی ہے ان سب کی تفصیل انھی کے الفاظ میں ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

شیخ حسین ایک بزرگ تھے جو دولقہ علاقہ گجرات سے شیخ محمد عیسیٰ کی زیارت کے لئے جونپور آئے شیخ بہاؤالدین اس وقت طالب علم تھے ان کی شیخ حسین سے ملاقات ہوگئی اور شیخ حسین کیمیا بنانا بھی جانتے تھے ان کو شیخ بہاؤالدین جیسے طالب علم کی فقیری کو دیکھ کر صدمہ ہوا اور ان سے کہا کہ تم ہمارے ساتھ جنگل چلو چنانچہ دونوں جنگل میں گئے شیخ حسین نے وہاں کیمیا کی اکسیر بنا کر ان کو دی اور کہا کہ جب تم کو ضرورت محسوس ہو تو اس سے سونا بنالیا کرنا اور جب یہ ختم ہوجائے تو پھر ہم سے کہنا ہم تمہیں اور بنادیں گے ان تمام باتوں کو سننے کے بعد شیخ بہاؤالدین نے عرض کیا کہ حضرت مجھے آپ سے اس کیمیا کی اکسیر لینے کی نہ ضرورت ہے اور نہ خواہش، میں تو آپ سے ایک دوسری قسم کی اکسیر لینا چاہتا ہوں، یہ سن کر شیخ حسین بہت مسرور ہوئے اور ان کی باطنی تربیت کی طرف مزید توجہ مبذول فرمادی اس باطنی تربیت کا سلسلہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ خود شیخ عیسیٰ سے خلافت نہ لے لی اور جب شیخ حسین خرقۂ خلافت لے کر اپنے وطن دولقہ روانہ ہونے لگے تو شیخ بہاؤ

الدین نے ان سے عرض کیا کہ اب آپ مجھے مرید کر کے اجازت دے دیں مگر شیخ حسین نے فرمایا کہ آپ کے شیخ توفی الواقع اسی شہر میں ہیں ہم سے آپ کو جتنا فائدہ منظور تھا وہ ہوگیا اس کے بعد شیخ حسین اپنے وطن چلے گئے اس کے کئی روز بعد شیخ حسین کا قلب شیخ محمد عیسیٰ کی جانب متوجہ ہوا اور ان سے مرید ہو کر فیض حاصل کیا۔ ۲۸

تعلیقات وحوالہ جات

(۱) اخبار الاخیار از شیخ عبد الحق محدث دھلوی (اردو ترجمہ) مترجم، سبحان محمود ومحمد فاضل، قسط پنجم، صدصد ۷۶، ۷۸، ۸۷، ۹۱، ۹۵، دیوبند (یوپی)، سالِ اشاعت ندارد۔

(۲) حیات وعلمی خدماتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، علیم اشرف خاں، ص ۱۲، ۱۴، سالِ اشاعت ۲۰۰۱ء نئی دہلی۔

(۳) اخبار الاخیار، قسط اوّل، ص ۸

(۴) حیات وعلمی خدماتِ شیخ عبد الحق محدث دہلوی، ص: ۲۴، ۲۵۔، و بزم تیموریہ مرتبہ سیّد صباح الدین عبد الرحمٰن، جلد دوّم، ص : ۱۴۲، طبع سوّم، ۱۹۸۴ء اعظم گڑھ، یوپی۔

(۵) حیات وعلمی خدماتِ شیخ عبد الحق محدث دھلوی، ص: ۱۱۸، ۴۰-۴۲۔

(۶) ایضاً، ص: ۵۲

(۷) ملا عبد القادر بدایونی اور فیضی آپ سے بہت متأثر تھے۔ عبد القادر بدایونی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں شیخ عبد الحق کو علوم عقلی ونقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر وکمال کا مجموعہ اور اپنے زمانے کے کامل صوفی لکھا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ جب شیخ عبد الحق صاحب حج سے واپس آئے تو فیضی ان سے ملنے کا مشاق تھا مگر انہوں نے ملنے سے عذر پیش کیا۔ فیضی نے اس سلسلے میں خطوط بھی لکھے اور والہانہ عقیدت کا اظہار بھی کیا مگر وہ کامیاب نہ ہوا۔ (منتخب التواریخ، عبد القادر بدایونہ،

Translated and edited by sir Wolseley Haig. جلد سوم،

ص:۱۶۷، ۱۷۰، ۱۷۱، پٹنہ، ۱۹۲۴ء

(۸) حیات وعلمی خدماتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص: ۷۹-۸۰، و بزم تیموریہ، جلد دوم، ص: ۱۴۳۔

شیخ عبدالحق محدث دھلوی کا خاندان علماء ادبا کا خاندان تھا۔ ان کے نانا مولانا نازنین العابدین جو شیخ اَدھن دہلوی کے نام سے معروف تھے اپنے زمانے کے بڑے دانشمند تھے اور سہروردیہ سلسلے میں بیعت تھے۔ شیخ سماء الدین کو اپنا روحانی پیشوا اور میاں عبداللہ تلنبی کو علمی مرشد تسلیم کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق کے تین لڑکے تھے (i) شیخ نورالحق (ii) شیخ علی محمد (iii) شیخ محمد ہاشم۔

(i) شیخ نورالحق کو شاہجہاں نے اکبرآباد کی قضا کا عہدہ دیا تھا والد کے انتقال کے بعد وہ اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے تھے۔ شیخ نورالحق نے صحیح بخاری شریف کی شرح فارسی میں چھ جلدوں میں تیسیری القاری کے نام سے لکھی تھی یہ ۱۲۹۸ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔ نورالحق شاعر بھی تھے مشرقی تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مثنوی تحفتہ العارفین کے نام سے لکھی تھی اور ان کا ایک دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل تھا۔ یہ دونوں اب ناپید ہیں۔ شیخ نورالحق بھی اپنے والد کی طرح کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ چند تصانیف یہ ہیں: (۱) شرح شمائل ترمذی (۲) تفسیر سورۃ الفاتحۃ (۳) حاشیہ علی شرح الجامی (۴) شرح قران السعدین (۵) رسالہ در بیان رویا (۶) محیی القلوب (۷) شرح عضدی، شرح مطالع وشرح ھدایا (۸) زبدۃ التواریخ وغیرہ۔ آپ کا ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۷۳ھ کو انتقال ہوا دہلی میں سپرد خاک ہوئے۔

(ii) شیخ علی محمد اپنے عہد کے جید عالم اور بزرگ تھے ان کی تین تصانیف ہیں (۱) رسالہ احوال پنج پیران (حالات خواجہ معین الدین چشتی، شیخ قطب الدین بختار

کا کی ، بابا فرید الدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیا اور نصیر الدین محمود چراغ دھلوی) (۲) خزائن الدرد (عربی فارسی اور ترکی لغت) (۳) نجات المریدین: احوال حضرت غوث الاعظم (مذکورہ تینوں کتابیں اب ناپید ہیں)۔

(iii) محمد ہاشم حدیث شریف کے بڑے مشہور و ممتاز عالم تھے۔ شیخ عبدالحق کا دہلی میں ایک مدرسہ، ایک کتب خانہ اور ایک خانقاہ بھی تھی۔ (حیات وعلمی خدماتِ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص: ۷، ۴۷-۴۸، ۵۴-۵۸۔

(۹) اخبار الاخیار (اردو ترجمہ) قسط اوّل، ص: ۲۴-۲۵۔

(۱۰) اخبار الاخیار کی تاریخِ تصنیف ''ذکر الاولیا'' سے نکالے ہے ۹۹۹ھ/ ۹۱-۱۵۹۰ء (منتخب التواریخ (انگریزی تاریخ) جلد سوم، صفحہ ۱۶۷) جہانگیر نے عبدالحق محدث کے علم و فضل کی شہرت سنی تو اس نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جب اس کی ۱۴سنہ جلوس یعنی ۱۰۲۸ھ مطابق ۱۶۱۹ء میں ملاقات ہوئی تو پہلے ان کے علم و فضل کا معتقد ہوا اس کے بعد ان کی تصنیف کے متعلق جو اخبار الاخیار کے نام سے مشہور ہے رائے کا اظہار کیا لکھتا ہے ''شیخ عبدالحق دہلوی کہ از اہلِ فضل و ارباب سعادت است درین دولت ملازمت دریافت۔ کتابی تصنیف نمودہ بود مشتمل بر احوال مشائخِ هند بنظر در آمدہ خیلی زحمت کشیدہ، مدتہاست کہ در گوشۂ دہلی بوضع توکل و تجرید بسری بود۔ مرد گرامی است۔ صحبتش بی ذوق نیست۔ بانواع مراحم دلنوازی کردہ رخصت فرمودہ'' (تزک جہانگیری، جلد دوّم، ص: ۲۸۵، منشی نور کشور، لکھنؤ، سال اشاعت ندارد)۔

(۱۱) اخبار الاخیار (اردو ترجمہ)، قسط سوّم، ص: ۲۱

(۱۲) ایضاً، قسط سوّم، ص: ۵۶

(۱۳) ایضاً، قسط دوّم، ص: ۵۵-۵۸

(۱۴) ایضاً، قسط سوّم، ص: ۵۵

(۱۵) ایضاً، قسط سوّم، ص: ۶۸-۷۵

(۱۶) ایضاً، قسط سوم، ص:۷۵-۷۶

(۱۷) ایضاً، قسط سوم، ص:۷۶-۷۷

(۱۸) ایضاً، قسط سوم، ص:۷۷

(۱۹) ایضاً، قسط سوم، ص:۷۸

(۲۰) ایضاً، قسط سوم، ص:۷۸-۷۹

(۲۱) ایضاً، قسط سوم، ص:۹۷

(۲۲) ایضاً، قسط سوم، ص:۱۰۹-۱۱۰

(۲۳) ایضاً، قسط سوم، ص:۱۱۴-۱۱۵

(۲۴) ایضاً، قسط چہارم، ص:۸۱-۸۲

(۲۵) ایضاً، قسط پنجم، ص:۱۰-۲۸

(۲۶) ایضاً، قسط پنجم، ص:۴۴-۴۵

(۲۷) ایضاً، قسط پنجم، ص:۴۵

(۲۸) ایضاً، قسط چہارم، ص:۲۷، قسط پنجم، ص:۴۷-۴۸۔

ڈاکٹر وجیہ الدین (ریڈر)
شعبہ فارسی، اردو و عربی
مہاراجہ سیاجی راو یونیورسٹی،
بڑودہ، گجرات

۱۲

تصوف اور بھکتی: مماثلت اور مغائرت

-ڈاکٹر شمیم طارق
(انجمنِ اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ممبئی)

قرآن حکیم میں خدا کے رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہونے کی بات جن معنیٰ میں کہی گئی ہے، بھکتی، سرّیت، عجمی تصوف، چین کے نظریۂ چی این اور جاپان کے تصور 'ہنین' میں اس کا مفہوم اس سے مختلف ہے اور انہیں فلسفوں اور رجحانوں کے سبب انسانوں میں نہ صرف اپنی روح میں جھانکنے اور درونِ ذات اپنے خالق و مالک کا دیدار کرنے کا میلان، مذہبی کتابوں اور عبارت کی پابندیوں سے گریز کی صورت اختیار کرتا گیا ہے بلکہ روحانی ریاضت کے نتیجے کو ھی الہ یا الوھیت میں شرکت کا تجربہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر رادھا کرشن جیسے عالم، فاضل شخص کو بھی مغالطہ ہوا ہے اور رہبانیوں نے خدا کے انسان کی رگِ جاں سے بھی قریب ہونے کی بات کو رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے ہوئے ایسے معانی پہنا دیئے جو اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ہیں:

''جب ہندو انتر آتما کی بات کرتے ہیں اور بدھ دھرم والے خود بدھ کی بلندی تک پہنچنے کے امکان کو تسلیم کرتے ہیں اور یہودی یہ اقرار کرتے ہیں کہ انسانی روح خدا کا چراغ ہے اور جب عیسائی یہ اعلان کرتے ہیں کہ خدا کی بادشاہت تمہارے وجود کے اندر ہی ہے، کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ معبدِ خداوندی اور روحِ خداوندی تمہارے سینے میں ہے، اور جب پیغمبر اسلام یہ فرماتے ہیں کہ خدا ہماری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے تو یہ سب مختلف طریقوں سے

ایک ہی بات کہتے ہیں اور وہ یہ کہ الوھیت کوئی بیرونی جابرانہ طاقت نہیں ہے، خدا کوئی سلطان نہیں ہے بلکہ وہ روحانی اور اندرونی اصول ہے جو خودی میں پیوست ہے۔ یہ اندرونی روشنی انتر جیوتی ہے۔ یہ سب الوھیت کی چنگاریاں ہیں اور خدا کے ساتھ خدا کی طرح تخلیق کے عمل میں مصروف ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم حالات کے مقابلے میں جدوجہد کریں تا کہ بدی اور ناانصافی اور نابرابری کو ختم کر کے انسانی زندگی کے معیار کو بلند کریں''۔ [1]

قرآن حکیم میں رگِ جاں سے بھی قریب تر ہونے کا اعلان خدا کا اعلان ہے۔ اس کو رسولؐ خدا سے منسوب کرنا لاعلمی کے سبب بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس خیال کے باعث بھی کہ قرآن کلام حق ہے مگر بنی نوع انسان تک رسول عربیؐ کی ہی زبان سے پہنچا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ عقیدہ بہرحال محل نظر ہے کہ الوھیت کوئی بیرونی طاقت نہیں ہے کیونکہ اسلام کے عقیدۂ توحید میں اللہ ظاہر بھی ہے باطن بھی۔ اس کا خارجی وجود بھی ہے، قل ھو اللّٰہ احد ..... اور وہ زمین و آسمان کے ہر ذرہ سے عیاں ہونے والی ایک روشن حقیقت بھی ہے، اللہ نور السمٰوٰت والارض۔ وہ عرش پر بھی جلوہ فرما ہے ثم الستوی علی العرش اور ہر جگہ ہمارے ساتھ بھی ہے۔ وَھُوَ مَعکم این ماکنتم۔ وہ ایک ذات ہے۔ حتی قیوم لیکن اس کی ذات جسمانیت اور مخلوق کے دوسرے تعینات سے بری ہے۔ اس کی بہت سی صفات ہیں لیکن اللہ کی صفات انسانی صفات سے مشابہ نہیں ہیں۔ سب سے بڑی حقیقت ذاتِ حق ہے لیکن ذاتِ حق کی بنائی ہوئی مخلوقات بھی حق ہیں جو کسی نہ کسی فرض اور مقصد کو پورا کر رہی ہیں اور اگرچہ تمام صفات کا سرچشمہ ذاتِ حق ہی ہے مگر صفات کا اطلاق ذات پر کرنا لامحدود کو محدود کرنا ہے۔

ہندوستان کے قدیم مذہب (سناتن دھرم) کے مطابق تو وہ تصور یا عقیدہ صحیح ہوسکتا ہے جو ڈاکٹر رادھا کرشنن نے پیش کیا ہے کیونکہ ان کے مذہبی فلسفے میں بڑی گنجائشیں ہیں اور ہندو مذہب بھی اگرچہ اور توسع ہے۔ یہ حقیقت مطلقہ کو کائنات میں جاری وساری مانتا ہے اس کے لئے کثرت آرائی عالم کی حقیقت فریب ادراک (مایا) کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اشکال واسماء بھی اس کے نزدیک اعتباری ہیں، حقیق نہیں ہیں اور حقیقی وجود کا اطلاق صرف حقیقتِ حق پر ہوتا ہے جو ہر جگہ اور ہر شئے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس عقیدہ کی لسفیانہ اساس کو بہت عام فہم لفظوں میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے:

''اندیشوں نے اصل ہستی حقیقتِ مطلقہ کو قرار دیا ہے اور اسے برہمہ کہا ہے جس تک عقل وادراک اور خیال وگمان کی رسائی نہیں۔ اس کا عرفان محدود وذہنی قوت سے نہیں بلکہ مذہبی وجدانی سطح پر ہوسکتا ہے۔ برہمہ ہرقسم کی صفات اور تعینات سے وراء الورا ہے۔ وہ موضوع کلی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ موضوع اور معروض۔ ایک روح انسانی اور دوسرا روح کائنات ہے۔ پہلے کو آتما اور دوسرے کو برہما کہا گیا ہے۔ آتما نہ حواس میں ہے، نہ شعور میں بلکہ وہ وہ شعورِ کلی ہے جو ہر فرد کے شعور میں کارفرما ہے۔ ایسے ہی برہما (روحِ کائنات) کی نوعیت مادی یا وجودی نہیں۔ آتما اور برہما دونوں کا منبع وماخذ موضوع کلی یعنی برہمہ ہے۔ چنانچہ عالم صور وظواہر میں ہر طرف برہمہ یعنی حقیقت کلی جاری وساری ہے جسے اپنشد نے ان دو مقولوں کی مدد سے سمجھایا ہے۔ ''آہم برہمہ اسمی'' (میں برہمہ ہوں) اور ''تب توم اسی'' (یہ سب تم ہو) یعنی ہستیِ مطلق اور انسان اور کائنات کے درمیان ایک ہی بنیادی رشتہ ہے۔ ان تینوں کا فرق جو ہمیں عالم رنگ وبو میں نظر آتا ہے محض اعتباری ہے، حقیقی نہیں۔ حقیقت ایک ہی ہے جو ہر جگہ اور ہر کہیں موجود ہے۔ سوائے اس کے سب فریب ادراک ہے۔''[۲]

اس وضاحت میں 'برہما' اور 'برھما' دو الگ الگ الفاظ قابل توجہ ہیں۔ ہندی تلفظ کے لحاظ سے پہلے لفظ میں ب ساکن، ر متحرک ساکن اور م ساکن ہیں اور اس کے معنی وہ ذات حق ہے جو وراء الدار ہے۔ دوسرے لفظ میں ب ساکن ر متحرک ہ ساکن اور م مشدّد ہے اور اس سے مراد ہندو تثلیث کا پہلا دیوتا ہے جس کو اُپتاوک (خالق) پر جاپتی۔ ''ودھاتا'' اور ''جگدیشور'' کے ناموں سے پکارا جاتا ہے حالانکہ وہ خود سے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس تثلیث

کے دوسرے دیوتا وشنو کی ناف سے پیدا ہوا ہے۔ تیسرا دیوتا مہیش ہے اور ان تینوں (تثلیث) کے توسط سے تخلیق، تخریب اور تخلیق نو، کے فلسفے کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہائن رش زمر (HEINRICH ZIMMER) نے اس فلسفہ کی جو تشریح کی ہے۔ اس کے مطابق برھما ایک ایسا یوگی ہے جس کو نفس و آفات کی تمام طاقتوں پر پورا پورا قابو حاصل ہے اور روحانی ریاضت سے دوسرا انسان بھی اس مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ لیکن اسلام کے عقیدۂ توحید میں الہ کے کوئی اور الہٰ پیدا کرنے یا کسی انسان کے روحانی ریاضت سے الوہیت میں شرکت کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لئے ڈاکٹر رادھا کرشنن کے کئی مذاہب کی تعلیمات کے پس منظر میں نحنُ اقربُ الیه من حبل الورید کے بیان کردہ اس مفہوم کو قبول کرنا ممکن نہیں ہے جس میں خدا کو انتر جیوتی میں محدود کر دیا گیا ہے۔

جمہور مفسرین کے نزدیک خدا کے رگِ جاں سے بھی قریب ہونے کا مطلب کا احاطۂ علمی ہے یعنی مالکِ کائنات انسان کے افعا واقوال کا ہی نہیں احوال کا بھی علم رکھتا ہے۔ ابن کثیر نے ایک اور معنی مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک نحن سے مراد اللہ کی ذات نہیں بلکہ وہ دو فرشتے میں جو انسان کے ساتھ ہر وقت لگے رہتے ہیں اور انسان کی جان سے اتنا باخبر ہوتے ہیں جتنا خود انسان بھی اپنی جان سے باخبر نہیں ہوتا۔ صوفیاء کے نزدیک البتہ یہ احاطۂ علمی یا قرب علمی ایک خاص قسم کا اتصال بھی ہے جس کی حقیقت و کیفیت تو کسی کو معلوم نہیں ہے لیکن اس کا وجود ہے۔ واسجد واقترب (سجدہ کرو اور ہمارے قریب ہو جائے) اسی قریب کی دلیل ہے۔ حضرت موسیؑ کا بنی اسرائیل سے انّ معی ربّی فرمانا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یارِ غار حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اللہ معنا فرمانا بھی قرب کی دلیل ہے۔ اللہ کے مومن بندے عبادات کے ذریعہ جو قرب حاصل کرتے ہیں وہ اس قرب واتصال سے الگ ہے جو اللہ تعالیٰ کو ہر مومن و کافر کی جان کے ساتھ یکساں ہے۔ عبادت و ریاضت سے قرب الٰہی حاصل کرنے والوں کو اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ دوسرے مذاھب میں بھی عبادت و ریاضت سے قربِ الٰہی حاصل کرنے کا تصور ہے۔ مگر وہ تصور الوھیت میں شرکت کے تصور میں بدل گیا ہے۔ اسلام میں قرب الٰہی کا تصور الوھیت میں شرکت کے ادنیٰ سے ادنیٰ

احتمال وامکان سے بھی پاک ہے۔ انسان عبادت وریاضت سے اللہ کا جو قرب حاصل کرتا ہے اس سے اس کے مقام عبدیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ عبدیت، الوھیت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ اسلام نے جس کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان ایک ہی رب کے بندے اور ایک ہی باپ کی اولاد میں، ابن آدم کو قبائل کے دیوتاؤں کی پرستش سے نجات دلاکر وسیع تر انسانی وحدت کی بھی بنیاد رکھی ہے اور معبود وعبد میں ہمیشہ کے لئے ایک ایسی لکیر بھی کھینچ دی ہے جس کے بعد انسان کے روحانی ترقی کر کے الہ ہوجانے یا الہ العالمین کے کسی انسانی جسم میں ظہور یا حلول کر جانے کا ہر تصور باطل ہوجاتا ہے۔

عقیدۂ توحید کی طرح عقیدۂ رسالت میں بھی دونون مذاہب میں بنیادی اختلاف ہے۔ ہندو مذہب کے بعض دانشوروں نے اگرچہ 'اوترت' ہونے کے بھی بالکل وہی معنی لکھے ہیں جو اسلامی عقیدہ میں انبیاء ورسل کے مبعوث کئے جانے کے ہیں لیکن تمام ہندو ذہن اور عالموں کے نزدیک اوتار کا مطلب الہ العالمین کا انسانی جسم میں ظہور کرنا ہے۔

آخرت یعنی ایک متعین دن اٹھایا جانا، ہر شخص کا حساب دینا اور اچھے برے اعمال کے مطابق ابدلآباد کی اچھی یا بری زندگی پانا ہر مسلمان کا عقیدہ ہے لیکن ہندو مذہب میں موکش یا نجات کا مطلب جیوآتما یا روح انسانی کا پرماتما میں مل جانا ہے۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا ہر روح اپنے اعمال کے مطابق بار بار پیدا ہوتی رہتی ہے۔

تصوف (تزکیۂ واحسان) اور بھکتی کا پس منظر اسلام اور سناتن دھرم ہے اور چونکہ ان دونوں مذاہب میں توحید رسالت اور آخرت جیسے بنیادی عقیدوں میں بڑا تضاد ہے اس لئے تصوف اور بھکتی کو ہم معنی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ تصوف اگرچہ تزکیۂ نفس کے لئے بہت سے اشغال واوراد اور طریقوں کا حامل، مقام عبدیت کے عروج اور قرب الٰہی کے ایک خاص مفہوم وکیفیت کا ترجمان، علم وعرفان کی ایک خاص راہ کا علمبردار اور زندگی کے بارے میں ایک مثالی نقطۂ نظر کا داعی ہے اور شریعت وتصوف کے مشترک ومختلف فیہ امور پر گفتگو کرتے ہوئے اختلاف کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا جاسکتا ہے اور اشتراک کے پہلوؤں کو بھی، لیکن اس کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے مختلف اور متعارض قرار دینا بڑی جسارت

ہے۔ یہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر ہی مبنی تہذیب اخلاق کا ایک وسیع و مستحکم نظام ہے اور ہ اگر چہ تزکیۂ نفس واحسان کے تصوف کہلانے کے دور تک اس نظام میں بہت سے تغیرات بھی ہوئے ہیں لیکن ان تغیرات پر نقد و جرح بھی ہوتی رہی ہے یعنی اخذ واختراع کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں نقد وجرح تصوف کی سنت جاریہ ہے۔

ہندو مذہب میں بھکتی موکش یا نجات کی ایک مستقل راہ ہے۔ اس میں پوجا پاٹھ کی پابندی ہے نہ عبادت وریاضت کی۔ اگر عشق صادق ہے تو عاشق صادق کی نجات یقینی ہے۔ بھکتی ادراک کر سکتی ہے کیونکہ یہ محویت اور سرور انبساط کا ایک ایسا عالم ہے جو ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی کی نئی نئی تعبیروں سے منور ہوتا رہتا ہے۔

بھکتی کی ماہیت کو دماغ کی قوت سے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ عقل کے ادراک سے بالاتر قلب وروح سے سکون کا نام ہے اور عشق ومحبت کے ولولوں کو جذبات وواردات میں ڈھال لینے سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اثرات قلب وروح تک محدود نہیں رہتے۔

ہندو دانشوروں کی وضاحتوں کے مطابق کرم (عمل) اُپاسنا (عبادت وریاضت) اور گیان (علم) بھکتی کی تین اقسام ہیں اور چونکہ بھکتی کے لغوی معنی خدمت ہے اور خدمت علم سے ہو، ریاضت سے ہو یا عمل سے، ہر صورت میں دل کی اعانت کی محتاج ہے اور کرم (عمل) بھکتی میں خاص طور سے جسم اور جسمانی اعضاء، اپاسنا (عبادت وریاضت) بھکتی میں دل اور دلی کیفیات اور گیان (علم) بھکتی میں عقل اور اس کے مضمرات ملوث ہوتے ہیں، لہذا بھکتی سے عملاً انسان کے اعضاء وجوارح بھی متاثر ہوتے ہیں اور افعال واحوال بھی۔ صوفیاء بھی ذکر الہٰی کی کثرت سے معرفت کی جس منزل تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا مقصود دل کی آنکھ سے حق کا مشاہدہ کر کے مراتب توحید کو معلوم کرنا ہے۔ مشاہدہ کی منزل کئی مقامات واحوال مثلاً توبہ، ترک، زہد، توکل سے گزرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور صوفیاء نے ان تمام مقامات کی جو تفصیل بیان کی ہے ان کا حاصل یہ ہے کہ افعال جوارح پر افعال قلب کو فوقیت حاصل ہے یعنی تصوف، کیفیت اور رجحان پر مبنی نظام ہے جو اعمال

شریعت کی بجا آوری میں اخلاص وللّٰہیت پر اصرار کرتا ہے۔ بھگتی کی طرح یہ علم وعمل کا متوازی نظام نہیں ہے۔

تصوف اور بھگتی کے حقیقی مفہوم اور مذہب پس منظر میں ان کے تقابلی مطالعے سے مغایرت کے پہلوؤں کا نمایاں ہونا تو باعثِ حیرت نہیں ہے کیونکہ تصوف قرآن وسنت یا شریعت کو چھوڑ کر خدا تک پہنچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ اتباع شریعت میں اخلاص کی کیفیت ہے جبکہ بھگتی نجات کی مستقل راہ تسلیم کی گئی ہے۔ ایک سچا بھگت کرم (عمل) اور گیان (علم) کے بغیر بھی نجات حاصل کرسکتا ہے۔ سوامی وِویکانند کے لفظوں میں:

''اپنے دل سے ہر طرح کی نمائش، چھل کپٹ اور مکر وریا کو دور کر کے سچے دل سے پرمیتا پرماتما کی تلاش اور جستجو میں لگ جانے کو اصطلاحی طور پر بھگتی کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا پربھو پرماتما کے چرن کمل میں کمی یعنی نہایت ہی مختصر اور قلیل المعیاد رغبت اور محبت سے ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ نشو ونما پاتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی آخر میں لامحدود اور بے پایاں محویت اور محبت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ایشور کے پریم میں یہ محویت واز خود رفتگی ہی آخر میں دائمی نجات کا باعث، ذریعہ اور وسیلہ ثابت ہوتی ہے، جیسا کہ دیورشی نارد جی نے بھی اپنے بھگتی سوتر میں فرمایا ہے۔

(سنسکرت شلوک) ''بھگوان کے چرنوں میں بیحد پریم اور پریت کا نام ہی بھگتی ہے''۔ (پہلا نوناک، دوسرا اسوتر) ۳

لیکن حیرت کی بات ہے کہ مفہوم وپس منظر میں بنیادی اختلاف ہونے کے باوجود تصوف اور بھگتی کے نظری اور عملی پہلوؤں میں کئی مماثلتیں بھی ہیں۔ ڈاکٹر وید پرکاش اپادھیائے نے اپنی کتاب ''کلکی اوتار اور محمدؐ صاحب'' ۴ میں قرآن اور وید واُپنشد کی تعلیمات میں مماثلتوں کی کئی مثالیں پیش کی ہیں۔ ''رُکم برہمیو ادھیتم''، سنسکرت کا ایک مشہور اور قدیم مقولہ ہے جس کو بعض لوگوں نے اپنشد سے ماخوذ تسلیم کیا ہے۔ اس کے نہ صرف ٹھیک یہی معنی ہیں جو لاالــہ الا اللــہ کے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت لفظ ادویتم

کے بدلے عربی لا الٰہ اور ایکم برھمیو کے بدلے اللہ رکھ دیئے گئے ہیں۔

اپنشد کے لغوی معنی کسی کے پاس بیٹھنے اور سننے کے ہیں۔ ارادت بھی جو ایک مستقل لفظ ہے لیکن بیعت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے، اسی معنی میں مستعمل ہے۔ وکونو مع الصادقین کا بھی تقریباً وہی مفہوم ہے۔ عمومی جہت میں حدیث بھی کہہ سکتے ہیں جو افعال اقوال اور احوال کا مجموعہ ہے۔ ویدوں کو ہندو مذہب کا واحد ماخذ تسلیم کیا جائے تو یہ مشابہتیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ اختلافات وہاں سامنے آتے ہیں جہاں توجیہات وتشریحات ویدک عقیدہ میں گرہ ڈال دیتی ہیں۔

ہندو عالموں کو بھی اعتراف ہے کہ وقت کے ساتھ ہندو مذہب کے اصول تبدیل ہوتے گئے ہیں:

''ہندو مذہب کی بنیاد ویدوں پر ہے، ویدوں کو ہندو کلام الٰہی سمجھتے ہیں۔ رگ وید سب سے پرانا سمجھا جاتا ہے۔ ویدوں میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر ہے، مثلاً اندر، اگنی، یم، ورن وغیرہ۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ خیال بھی موجود ہے کہ یہ متعدد دیوتا کسی ایک ذات کے مظہر ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھا ہے کہ ایک ذات واحد کو رشی مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اس کو کبھی اگنی کہتے ہیں، کبھی یم اور کبھی ماتر شون۔ ویدوں سے آگے بڑھ کر جب ویدانت کے زمانے میں حکیمانہ خیالات کا چرچا ہوا تو ہمہ از وست سے گزر کر ہمہ اوست کے فلسفے کی طرف رجحان ہوا اور ہندو پرماتما اور جیو آتما، خالق اور مخلوق کو ایک واحد شے سمجھنے لگے''۔ ۵

اگر یہ تبدیلیاں نہ ہوئی ہوتیں تو یہ مذہب عقیدہ توحید میں اسلام سے مشابہ ہوتا۔ البیرونی نے کتاب الہند کی پہلی جلد کے دوسرے باب میں ہندو ماخذ کی بنیاد پر خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہندوؤں کے اعتقاد کو بیان کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ وہ خدا کو واحد اور ازل مانتے ہیں جس کی ابتداء ہے نہ انتہا - وہ اپنے فعل میں قادر وحکیم اور مختار کل ہے۔ زندہ ہے، زندہ کرنے والا ہے۔ صاحب تدبیر ہے۔ باقی رکھنے والا ہے۔ اس کا کوئی مقابل ومماثل نہیں ہے۔ ایشور کے اوتار لینے کا تصور شاید بعد میں پیدا ہوا۔

تصوف کے عملی پہلو میں اوراد واشغال اور ریاضت ومجاہدہ کو کلیدی حیثیت حاصل ہے جس کے نتیجہ میں سالک پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کو کسی نے وصل، کسی نے اتحاد، کسی نے توحید اور بیشتر نے جمع، جمع الجمع، عین الجمع، تجربہ فنا وبقا اور مغربی دانشوروں نے تجربۂ اتحاد Intertime Experience کہا ہے۔ انہیں یہ بھی اصرار ہے کہ ریاضت ومجاہدہ کے ایک خاص مقام یا مرحلے پر ایک مسلم صوفی کو جو روحانی تجربات ہوتے ہیں وہی تجربات غیر مسلم صوفیوں، ہندو جوگیوں حتیٰ کہ نوفلاطونی فلسفیوں اور عیسائی راہبوں کو بھی ہوتے ہیں حالانکہ سب کے طریقے، وظیفے اور عقیدے الگ الگ ہوتے ہیں اس لئے روحانی تجربات کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم کی تخصیص جائز نہیں ہے۔

اعتقادی نقطۂ نظر کے علاوہ اس سوال کا جو جواب ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم صوفیاء جمع، جمع الجمع اور عین الجمع کی کیفیت کو اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کا حاصل یا کمال سمجھتے ہیں جبکہ مسلم صوفیاء کے نزدیک یہ درمیانی منزلیں ہیں۔ اس سے آگے کی منزلوں کو کسی نے فصل بعد الوصل، کسی نے فرق وتفرقہ اور کسی نے فرق مطلق کہا ہے۔ جمع کی کیفیات میں مسلم وغیر مسلم کے بہت سے احساسات ومشاہدات ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مرحلے میں سالک کو اپنی ذات خدا سے متحد دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس کے بعد کے مرحلے میں ایک معنی میں وہ اپنی ذات کو خدا سے متحد دیکھتا ہے اور دوسرے معنی میں مختلف مسلمانوں میں جو صوفیاء انا الحق، سبحانی ما اعظم ثانی، لیس فی جبتی سوی اللہ اور انا لوح محفوظ جیسے کلمات کہنے کے مرتکب ہوئے وہ جمع کی منزل میں تھے۔ ان میں سے جو صوفیاء جمع کی کیفیات سے اوپر اٹھے انہوں نے ان کیفیات کے زیر اثر کہے گئے کلمات پر اظہار ندامت کیا۔ ابو یزید بسطامیؒ ایسے ہی صوفی تھے جن سے جمع کی کیفیت میں شطحیات کا صدور ہوا تھا لیکن بعد میں انہوں نے اُن پر اظہار افسوس کیا تھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ ان کی سکر کی حالت میں کہی ہوئی باتیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ صحو کی حالت میں کہے گئے کلمات مشہور نہیں ہوئے۔

ابن الفریدؒ (۱۲۳۵ء) منصور حلاجؒ (۹۲۶ء) مولانا جلال الدین رومیؒ (۱۲۷۳ء) اور شیخ فرید الدین عطارؒ (۱۲۳۰ء) کے حالات جمع اور جمع الجمع کی مثالیں ہیں

ان کے کلام واقوال پڑھ کر خیر وشر، کفر واسلام اور عبد ومعبود کے ایک ہونے کا گمان گزرتا ہے اور وہ ان غیر مسلم صوفیاء کے مماثل نظر آتے ہیں جن کے لئے ریاضت ومجاھدہ کا مقصد الوھیت میں شرکت ہے لیکن مسلم صوفیاء نے ان کیفیات کو نہ تو آخری مقام تسلیم کیا ہے نہ ہی حقیقی، ان کے نزدیک جس طرح کوئی خواب دیکھے کہ وہ بادشاہ ہوگیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ واقعی بادشاہ ہوگیا ہے۔ اسی طرح خدا کے ساتھ اس کی ذات کے متحد ہونے کی کیفیت خواب جیسی ہوتی ہے۔ اس کے یہ محسوس کرنے سے کہ وہ خدا ہوگیا ہے وہ واقعی خدا نہیں ہوجاتا۔

امام غزالیؒ نے ان تمام ممکنہ توجیہات کی نفی کی ہے جن سے صوفی کے خدا بن جانے کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ انہوں نے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ سالک خدا کی ماہیت میں شرکت کرسکتا ہے یا خدا کی صفات اس کی ذات میں سرایت کرجاتی ہیں یا وہ الٰہیاتی وجود بن جاتا ہے یا وہ خدا کے ساتھ کسی بھی صورت میں متحد ہوجاتا ہے۔ ان کے نزدیک توحید اور جمع کا مطلب صرف یہ ہے کہ صوفی ان تمام رذائل سے پاک ہوجائے جو انسان میں پائے جاتے ہیں اور ان تمام اوصاف سے متصف ہوجائے جو خدا کو محبوب ہیں۔ صوفی کسی بھی حالت میں انسانی حدود سے بلند نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس بھگتی کا مطلب یہ ہے کہ انسانی روح ترقی کرتے کرتے پرماتما میں مل جائے۔ اور چونکہ جمع الجمع یا وحدت کاملہ کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ اتحاد کامل ہوگیا ہے اس لئے بھگتوں کو ان کی منزل مل جاتی ہے لیکن صوفیاء نے اس سے آگے کی منزل کی بھی نشاندہی کی ہے جس میں وہ صوفیاء ہی محو میں آجاتے ہیں جن پر سکر یا جمع الجمع کی کیفیات کا غلبہ ہوتا ہے مگر یہ حالت محو صرف اتنی دیر کے لئے ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرائض منصبی اور وقت مقررہ پر فرائض مذہبی کو ادا کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے بہت سے صوفیاء کے احوال تذکروں میں محفوظ ہیں جو حالت سکر میں تھے مگر نماز کے وقت محو کی حالت میں آجاتے تھے۔

فرق مطلق اس سے بھی آگے کی منزل ہے، اس منزل پر سالک اپنی عبودیت کی بازیافت کرتا ہے اور یہی تصوف کا اصل مقصد اور احسان کی روح ہے۔ یہاں تصوف اور

بھکتی میں مماثلت کی ساری راہیں بند ہوجاتی ہیں۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے جمع، جمع الجمع یاوحدت کاملہ کی منزل کو جس کو بھکتوں نے روحانی ارتقاء کی آخری منزل کہا ہے 'کفر طریقت'' کا نام دیا ہے اور حالت تفرقہ کو جس کو بہت کم صوفیاء نے بیان کیا ہے ''اسلامی طریقت'' کا۔

حواشی

(۱) علی سردار جعفری۔ کبیر بانی۔ دوسرا ایڈیشن۔ نئی دہلی ۱۹۶۵ء۔ ص:۳-۲۴۲۔

(۲) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ اردو غزل کا نظریاتی پہلو۔ آج کل نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۲ء۔ ص:۳

(۳) سوامی وِویکانند۔ بھگتی (وہ یک مالا پہلا موتی) مترجمہ: شانتی نارائن۔ پنجاب پریس، لاہور۔ ص:۱۶۰۔

(۴) مطبوعہ سارسوت ویدانت پرکاش سنگھ۔ الہ آباد

(۵) پنڈت منوہر لال زتشی ۔ کبیر صاحب۔ ہندوستان اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۰ء۔ ص:۲۶۔

۱۳

سانحۂ گجرات کے پس منظر میں

اسلام کا پیغام امن و آشتی

-ڈاکٹر حسن مثنّیٰ ۔ دہلی

خالقِ کائنات کا ارشاد ہے :

" ان الدین عند اللّٰہِ الاسلام "

بیشک اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے۔ اس کی خالص وجہ یہ ہے کہ اسلام امن و آشتی، اخوت و مساوات اور رواداری کا خواہاں ہے اور اسی کا درس بھی دیتا ہے اور اسی مقصد کے لئے خدا نے ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی بھی بھیجے اور ان سبھی نے خدائے واحد کی عبادت کا پیغام دیا تا کہ اس کا شریک بنا کر کسی قسم کی خونریزی نہ برپا ہو۔ فتنہ وفساد نہ ہو اور سبھی خدا وحدہٗ لاشریک کے مُطیع و فرمانبردار بن جائیں۔ اسلام نے اُن تمام رشتوں کی اساس کو بھی باالحق قرار دیا جو انسانی کوتاہیوں نے بنا رکھے تھے۔ اس نے نسل، رنگ، قوم و قبیلہ، لسانیاتی رشتہ، علاقائی رشتہ یعنی تمام ایسے رشتوں کی نفی کی جس سے نفاق کے امکان تھے۔ ہاں اس نے انسانوں کو ایک اور صرف ایک رشتہ میں پروئے رکھنے پر زور دیا اور وہ رشتہ تھا انسانیت کا جس کا مقصد تھا نسل انسانی کو ایک سطح پر اور ایک صف میں کھڑا کرنا۔

بقول مولانا آزاد:

''انسانیت کا ایک دائرہ بے شمار چھوٹے چھوٹے دائروں میں بٹ گیا تھا۔ اسلام نے نہ صرف ان چاروں سے انکار کیا بلکہ ان کے خلاف اس

درجہ واضح اور قطعی اختلافات کر دئے کہ کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہی، نسل کی نسبت صاف صاف کہہ دیا کہ عرب ہو یا عجم سب ایک ہی خدا کی زمین کے باشندے ہیں ''زبان'' اور رنگت کی نسبت فیصلہ کر دیا کہ یہ خدا کی حکمت وقدرت کی نشانیاں ہیں کسی جگہ کی آب وہوا ایک رنگ پیدا کرتی ہے۔ کہیں کی آب و ہوا دوسرا رنگ کہیں ایک خاص طرح کی زبان ادائے مطلب کے لئے وجود میں آگئی کہیں دوسری زبان۔ لیکن یہ اختلافات انسان کے امتیاز اور تفرق کی بنیادیں نہیں ہیں پھر اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اعمال کا جو نظام تیار کیا اس کے ہر گوشہ کی وضع وقطع ایسی رکھی جس کے ساتھ امتیاز نسل وقوم جمع ہی نہیں ہوسکتا۔ روزانہ اعمال و عبادات میں ایسی چیزیں رکھ دی گئیں کہ ہمیشہ انسانی وحدت ومساوات کا عملی اعتراف ہوتا رہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج سب میں یہ روح کام کر رہی ہے''۔

اس میں شک نہیں کہ جب انسان اپنا سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے کو معبودِ حقیقی کے حوالے کر دے گا تو اندیشۂ فساد وشر ختم ہو جائے گا کیوں کہ جو اس کا حکم ہوگا اس کے مطابق انسان اطاعت وفرمانبرداری بجالائے گا۔ درحقیقت تمام مذاہب سچائی کا درس دیتے ہیں اور نزاع ونفاق سے اجتناب کی ترغیب بھی۔ اسلام تو مسلّم صداقت ہی پر مبنی مذہب ہے۔ اب جہاں جہاں صداقت ہوگی وہاں وہاں امن ہوگا تو کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ہم کسی ایسے مذہب کی پیروی کریں جہاں صداقت ہو امن ہو۔ اگر اسلام کی بات کی جائے تو یہ لفظ ہی صلح کے معنی میں مستعمل ہے۔

''اس لفظ کا مادہ ''سلم'' ہے جس کے معنی صلح کے ہیں ''صلح کا آخری نتیجہ اطاعت وفرمانبرداری ہے اس لئے اگر یہ صحیح ہے کہ اسلام کے معنی ''گردن انداختن'' کے ہیں تو دنیا کے تمام مذاہب میں صرف وہی ایک ایسا مذہب ہے جو صلح وآشتی کا آخری نتیجہ ہے''۔

معلوم ہو کہ اسلام جملہ نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہے اس سلسلے میں وہ کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا جس طرح سورج اپنی روشنی وحرارت بنی نوع انسان تک پہنچانے میں کوئی امتیاز نہیں برتتا۔ اس کے نزدیک سیاہ وسفید، اعلیٰ وادنیٰ، باغ ودشت سب برابر ہیں۔ اس کی روشنی وحرارت سے سبھی مستفیض ہوتے ہیں۔ یعنی اسلام تمام قوموں، نسلوں کو امن وآشتی، صلح وسلامتی کا پیغام دیتا ہے حتیٰ کہ اس نے اپنی عبادات میں بھی اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کہیں سے کسی انسان کے ذہن میں نابرابری کا تصور نہ آنے پائے اسی لئے محمود وایاز سبھی کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔ بقول شاعر ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اس کی خالص وجہ یہ ہے کہ نابرابری بھی ان عوامل میں سے ایک ہے جو امن وامان کو گزند پہنچانے کا کام کرتی ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام عالمگیر صلح وامن کا پیامبر ہے۔ اسے آپس میں فتنہ وفساد، نفاق وتعصب ہرگز گوارا نہیں۔ فی الواقع لفظ اسلام کے ابتدا ہی سے سلامتی ظاہر ہوتی ہے اس لئے حکم اسلامی بھی یہ ہے کہ جب ایک مسلمان دوسرے انسان سے ملے تو السلامُ علیکم کہے یعنی پہلے سلامتی کی دعا کرے۔ قران کریم کے پارہ ۱۸ میں سورۂ نور کی آیت نمبر ۶ کی تفسیر کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے :۔

''مسلمان جس کسی کے گھر جائے گا اور جس کسی سے ملے گا کہے 'السلام علیکم، تم پر سلامتی ہو کیونکہ مسلمان ہر انسان کے لئے امن وسلامتی چاہتا ہے۔ وہ کسی کے لئے بھی تباہی اور ہلاکت کا خواہش مند نہیں ہوسکتا۔''

معلوم ہو کہ امن وسلامتی کا تصور مزاج اسلامی سے گہری وابستگی رکھتا ہے کیونکہ اسلام کا مکمل نظام حیات اور اس کے اصول وقوانین امن وآشتی کے تصوّر سے پُر ہیں۔ اور اسی لئے تو خالق کائنات کا ارشاد ہے: ''لو كان فيهما الهة الا الله لفسدتا البناء '' اگر کائنات میں اللہ کے علاوہ کئی خدا ہوتے تو زمین وآسمان میں فساد برپا ہوجاتا۔ اس کا مطلب بھی یہی ہوا کہ خدا کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ زمین پر فساد برپا ہو۔ یعنی معبود حقیقی کا ہدف

بھی یہی ہے کہ اس وسیع وعریض کائنات میں امن وآشتی کا پرچم لہرائے چنانچہ سورۂ حجرات میں خدانے تاکید بھی کی کہ:

''اے لوگو یقیناً ہم نے تمھیں ایک آدمی اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم کو پہچانا جاسکے اگر چہ ان تمام اقوام اور تمام افراد میں سب سے بہتر وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے یعنی خدا سے ڈرتا ہے''۔

اس طرح وحدت انسانی کو اس کے اِساس اور نشونما کی حقیقت سے آگاہ کرا کر اجناس وقبائل کے الگ الگ ہونے کی وجہ بتا کر نسلی وجنسی نزاع کے تمام اسباب کو یکسر ختم کر دیا اور یہ بتادیا کہ نسلیں اور قبیلے آپس میں محبت و القدر کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اختلاف وافتراق کے لئے نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی مذہب نقص امن کا سبق نہیں سکھاتا اور اسلام تو نقص امن پیدا کرنے والوں کے خلاف بہت سخت اقدامات کرنے کا حکم دیتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ قومی، نسلی، مذہبی، امتیازات کو ختم کر کے رواداری واخوت کا حکم دیتا ہے جس کی خصوصاً ہمارے ملک اور اس میں بھی بالخصوص گجرات میں اس کی سخت ضرورت ہے کیونکہ یہ صوبہ ماضی سے ہی رواداری کے گھوارے کی شکل میں جانا اور پہچانا جاتا رہا ہے۔ اور یہاں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ہمیشہ فکر وعمل کی رواداری جاری وساری رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک اور صرف ایک مقصد کارفرما رہا ہے اور وہ مقصد ہے امن کا، جبھی تو یہاں لوگوں نے باہر سے آنے والے مسلمانوں خصوصاً تاجروں کا والہانہ استقبال کیا اور ان کو اپنا شریک کار بنایا ان لوگوں نے دیکھا کہ یہ جو مسلمان ہمارے یہاں اُترے ہیں ان کے اخلاق و اعمال وافعال نہایت عمدہ ہیں اور ہم ان کے شانوں سے شانہ ملا کر نہ صرف تجارت کو بڑھاوا دے سکتے ہیں بلکہ ایک عظیم مقصد کی جانب گامزن ہو سکتے ہیں۔ یعنی مقصد امن وآشتی کی جانب۔ جس سے ملک وقوم کی ترقی کا راستہ ہموار ہوسکتا ہے۔

لیکن یہ عمل ان زردشتیوں کو راس نہ آیا جو پہلے سے یہاں موجود تھے اور ان کے کسانے پر بلکہ یوں کہا جائے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ایران میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کی

سازش کے تحت مسلمانوں کے خلاف فساد برپا کرنے کی سازش جس میں مسلمانوں کی مسجد شہید کردی گئی جو اتحاد و یگانگت کا مرکز تھی اور اس حملے میں تقریباً ۸۰ مسلمان شہید بھی کر دیئے گئے لیکن خدا کا کرنا تھا کہ مسجد کے امام اس حملہ میں بال بال بچ گئے اور جب انہوں نے اس وقت کے راجہ سے شکایت کی تو گجرات کے راجہ راجہ جنک سخت رنجیدہ ہوئے اور انہوں نے حکم صادر کیا کہ شہید کی گئی مسجد کی تعمیر کا فوراً انتظام کرایا جائے اور مرنے والوں کو تاوان ادا کیا جائے۔ یہ تھا اس زمانے کے راجہ اور پرجا کا عمل جس سے اخوت کی بو آرہی تھی۔ یہ تو بات تھی ان دنوں کی آیئے اب نظر ڈالتے چلیں آزادی کے چند برس قبل کے منظر نامہ پر جب جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی اس زمانے میں انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو Devide & Rule کی پالیسی کے تحت ۱۹۴۲ء میں یہاں فسادات کرادئے اس وقت بھی امن کے علمبردار نہایت مستحکم ارادے کے ساتھ میدان کارزار میں آئے میری مراد کانگریس سیوادل کے رجب بھائی اور وسنت بھائی جیسے عظیم جاں بازوں سے ہے جنہوں نے فساد ختم کرانے کے لئے جی توڑ کوششیں کیں اور آخر کار موت کی آغوش میں سو گئے۔
گجرات میں اتحاد و یگانگت اور امن و آشتی کا یہ سفر جاری رہا لیکن اب کے فسادات میں ماضی کے رشتوں کو پاش پاش کردیا گیا اور ہر طرف تحقیر و تذلیل کا بول بالا نظر آیا لیکن ایسے حوصلہ شکن ماحول میں بھی امن و آشتی کے پیامبروں نے اپنی سی کوششیں کیں جس کی عمدہ ترین مثال ہلول کے رام سنگھ ٹھاکر ہیں جنہوں نے اس وقت خود کو سینہ سپر کردیا جب بلوائیوں نے عین نمازِ جمعہ کے وقت مسلمانوں پر حملہ بول دیا اور 400 بچے بوڑھے، مرد عورتیں بھاگ کر ان کی پناہ میں آگئے اور جب بلوائیوں نے وہاں بھی حملہ کرنا چاہا تو انہوں نے رواداری، مہمان نوازی اور قوم پروری کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو ان کے ارادوں سے باز رکھا یہاں تک کہ ان کے لوگوں نے ان کی خبر گیری کی اور ان کی باز آبادکاری کا کام انجام دیا۔ موصوف ۱۵ دنوں تک نہایت مضبوط اور اٹل ارادے کے ساتھ اپنے مقصد اور فسادیوں کے درمیان سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ثابت قدم رہے، یہ تھی گجرات کی انسان دوستی، مہمان نوازی اور مشترکہ کلچر کو بچائے رکھنے کی عظیم کوشش۔ آج

جب کہ چند مفاد پرست عناصر نے ایسے ماحول میں زہر گھولنے کی عملی کوشش شروع کردی ہے۔ ہمیں اپنے آباء واجداد اور صوفیاء کرام کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ ہمارا ماضی مجروح نہ ہو ہمارے اقدار پامال نہ ہوں اور یہ عمل آج بھی جاری رہے۔ شکست خوردگی اور بے یقینی کے عالم میں آج بھی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آرہے ہیں اور اپنی تہذیبی وراثت، مذہب اور مشترکہ کلچر کی بقا کے لئے کام کررہے ہیں جس کی مثال زلزلہ گجرات کے بعد مسلمانوں کے ذریعے خون کا عطیہ دینے کا رکارڈ ہے جس میں انہوں نے اس انہماک سے حصہ لیا جیسے ان کے کسی اپنے کو خون کی ضرورت ہے۔ میرا تعلق چونکہ میڈیا سے ہے اس لئے میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ زلزلہ زدگان کی جتنی مدد مسلمانوں نے کی ویسی اور اتنی مدد کسی تنظیم یا فرد نے نہیں کی۔ ان کے پیش نظر پریشان حال اور سسکتی ہوئی انسانیت تھی نہ کہ ہندو مسلمان یا سکھ عیسائی۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ یہ سرزمین تو اس عظیم مجاہد کی پیدائش ہے جس نے اپنے فکر وعمل سے پوری دنیا کو بے لوث خدمت خلق، امن وآشتی اور اہنسا کا پیغام دیا جس کی مثال تادیر قائم رہے گی۔ میری مراد مہاتما گاندھی یعنی اپنے باپو سے ہے جن کا فلسفۂ حیات آج بھی موضوع بحث ہے اور جس پر چل کر ہم بہ آسانی اپنا مقصد حاصل کرسکتے ہیں۔ اور ایک ہندو مندر میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرسکتا ہے، مسلمان مسجد میں نمازیں ادا کرسکتا ہے، عیسائی چرچ میں عبادت کرسکتا ہے اور سکھ گردواروں میں گروگرنتھ کا پاٹھ کرسکتا ہے اور شبھ کیرتن گا سکتا ہے۔

گجرات کے پس منظر میں یہ تمام باتیں نہایت اہم ہیں کیونکہ گزشتہ دنوں یہاں ہوئے Genocide مَل کُشی نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ انسانیت اور انسان کی قدر و قیمت کم ہوتی جارہی ہے۔ ایسے میں ہمیں چاہئے کہ انسانی زندگی کی اہمیت کو سمجھیں اور اس کی بقا کے لئے کام کریں یہاں میں مبلغ اعظم مولانا ابوالکلام آزاد کے نقطۂ نظر کا ذکر کرنا چاہوں گا جسے انہوں نے اپنے جریدہ 'البلاغ' میں درج کیا تھا۔ انہوں نے اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی زندگی کی اہمیت پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

''اسلام کے نزدیک انسان کی زندگی سے بڑھ کر دنیا کی کوئی چیز محترم نہیں۔ وہ قتل کو انسان کی سب سے بڑی شقاوت قرار دیتا ہے۔ اس کی کتاب اپنے معجزانہ انداز بلاغت میں اعلان کرتی ہے کہ نوع انسان کے کسی ایک فرد کا قتل، فرد کا قتل نہیں، نوع انسانی کا قتل ہے''۔

ایسے میں ہمیں چاہئے کہ ہم متحدہ قومیت، Composite culture مشترکہ کلچر، مذہبی رواداری، بھائی چارے کا دامن تھام لیں دوسروں کے عقائد کا احترام کریں، سیکولرزم پر کاربند رہیں، وطن سے گہری محبت کا مظاہرہ کریں کہ یہی ایمانداری کا ثبوت ہے اور حق پرستی، حق گوئی اور حق طلبہ کو اپنا شعار بنالیں کیونکہ عہد جدید میں اس کی اتنی سخت ضرورت ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ آخر میں مولانا آزاد کے اس پیغام پر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا کہ :

''تمہاری کوئی نسل ہو، تمہارا کوئی وطن ہو، تمہاری کوئی قومیت ہو، تم کسی درجے میں اور کسی حلقے کے انسان ہو، لیکن جب ایک ہی پروردگار کے آگے سر نیاز خم کردو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام ارضی اختلافات مٹادے گا۔ تم سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں گے تم محسوس کروگے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے، تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا ہے اور تم ایک ہی رب العالمین کی عیال ہو''۔

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم وھو المستعان وبہ ثقتی

قاضی القضاۃ سیدنا

النعمان بن محمد التمیمی قدس اللہ روحہ

اور انکی تالیف شدہ کتاب

أَسَاسُ التّأوِیْلِ الْبَاطِن

- علامہ حاتم زکی الدین۔ بڑودہ

مصنف کا تعارف

فاطمی عدالتی نظام کے معمر و علمبردار اور فقہ و قضایا کے محکمے کے رُکن الارکان اور منظم اعلی سیدنا القاضی النعمان التمیمی المغربی کی ولادۃ باسعادۃ قیروان میں تیسری ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ آپ پہلے فاطمی امام المہدی صلع باللہ کی خدمت میں ہجری صدی ۳۱۳ھ میں داخل ہوئے اور چار فاطمی ائمہ کی الگ الگ عہدے پر رہکر خدمت کا شرف حاصل کیا۔ ۲۹۶ھ میں قبل از قیام دولت فاطمیۃ کے آپ کے حالاتِ زندگی مفقود ہیں لیکن آپ کی کارگذاری اور عہدہ پروری کی ابتداء میں آپ فاطمی دربار میں محض ایک کاتب اور مہتمم دار الکتب کی حیثیت سے فاطمی امام المنصور صلع باللہ کی خدمت میں حاضر تھے۔ دعوۃ کے کتابوں کے خزانۂ عامرۃ کا حوالے آپ کے ذمہ تھا اور انہیں کی دور حکومت و امامۃ میں آپ منصب قاضی پر فائز ہوئے اور عرصۂ قلیل میں رئیس القضاۃ کا درجہ حاصل کرلیا۔ حکومت فاطمیۃ کے

القاھرۃ منتقل ہوجانے کے بعد آپ قاضی القضاۃ کے رُتبہٗ اعلیٰ پر فائز ہوئے جو الامام الفاطمی المعز صلع باللہ کے دور میں فاطمی دولت کا مایۂ ناز عہدہ شمار کیا جاتا تھا اور امامِ زمانہ سے مجلسِ قضا میں قربت حاصل ہوتی تھی۔ ابتداء میں آپ کی ذمہ داری قضایا واحکامِ شرعی کا نفوذ اور فقہی ترتیب وتدریج کا مستحکم نظام اور فاطمی عقائد کو قوام ودوام بخشنا تھا۔

فاطمی عقائد کے ادوار

فاطمی عقائد کی تشکیل واجراء اور اس کے باقاعدگی سے نفوذ ورواج کے مرحلے کو تین ادوار میں تقسیم کئے جانے پر یہ پتا چلتا ہے کہ مصر اور مغربی افریقہ میں حکومت فاطمیۃ کے قیام سے کچھ پہلے فاطمی عقائد کی نشرواشاعت میں تنظیم کا دورِ اول شروع ہوتا ہے اور اس دور کا سب سے اہم نام سیدنا جعفر ابن منصور الیمن (قس) کا ہے۔ مصر میں فاطمی امامت وحکومت کی بنیاد کو قوام ملنے کے بعد دوسرا دور شروع ہوتا ہے جو چودھویں فاطمی امام المعز لدین صلع اللہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کا سب سے اہم اور معروف نام جو فاطمی ادب، ثقافت اور عقائد کے افقِ اعلیٰ تک پہنچا اور اِسے پروان چڑھایا وہ سیدنا القاضی النعمان قس کا ہے۔ آپ کا اسم گرامی النعمان بن محمد بن منصور بن احمد بن حیّون التمیمی المغربی ہے اور کنیت ابوحنیفہ ہے۔ اہل سنت کے امامِ اعظم اور شاگردِ امام جعفر الصادق ابوحنیفہ النعمان بن ثابت کے نام اور کنیت سے مشابہت ہونے کے باعث آپ کے نام کے ساتھ سیدنا الاجل۔ قاضی القضاۃ المغربی التمیمی تحریر کیا جاتا ہے۔ آپ خاندانِ تمیم کے چشم وچراغ تھے اور مُستفیدِ علمِ فقہ کے لئے مشعلِ راہ تھے۔

شَارَکَ المُؤلِفُ أبو حنیفةُ النّعمان الشّیعی. المتوَفّی سنة ٣٦٣ھـ. فِی الدّعوةِ الفاطِمیّةِ فی مَهدِها فِی المَغرِب، وَقَامَ بتَاصیلِ أصُولِها حتّی أصبحتِ الدّعوةُ تَعتمدُ علی النَّشاطِ الفِکری لِلمؤلّف بقدرِ اعتمادِها علی النّشاطِ السّیاسی للخلفاءِ الفاطِمیین.

ولِدورِه البارزِ في الدِّفاعِ عن حريم التشيُّع اِعْتبرتْهُ بعضُ المصادرِ الشّيعيةِ إماميًا اِثْنا عشريًا، بالرغم مِنْ كثرةِ مؤلّفاته الّتي تُعتبرُ مصدرَ عطاءٍ للمذهب الاسماعيلي ولا يزالُ أتباعُ المذهبِ الاسماعيلي يُعبّرون عنه بألفاظ التّجليل الّتي لايصفون غيره بها كألفاظ "سيدُنا الأوْحد" و "القاضِيُ الاجلّ" و "سيّدنا القاضي". (محقق "شرح الاخبار" محمد حسين الحسيني الجلالي مطبوعة بيروت)

سیدنا القاضی ابوحنیفۃ النعمان قس مغربی افریقیۃ میں دعوۃ فاطمیۃ کے گہوارے میں داخلِ خدمت ہوئے اور اس کے اصل واصول کو مستحکم کیا۔ آپ کی تألیفات وخدمات کے سبب خلفاء فاطمین کی دعوۃ میں جتنا فکری وثقافتی نظام تھا بالکل ویسے ہی سیاسی نظام میں اعتماد کی قدر میں اضافہ ہوا۔

اپنے شیعیت کی حُرمت کے دفاع کے لئے ایک مجاہد دور کا کام کیا جس کے باعث بعض مؤلفین آپ کو امامی اثنا عشری کہنے لگے لیکن آپ کی اکثر تألیفات وتصنیفات سے اس بات کا اعتبار ہوتا ہے کہ آپ کے مصادر اسماعیلی مذہب پر منحصر تھے یہاں تک آپ کی خدمت کی قدر وشناخت کرتے ہوئے آپ کے نام کے ساتھ القابِ جلالت جیسے کہ سیدنا الاوحد والقاضی الاجلّ وسیدنا القاضی لکھے جاتے ہیں۔

آپ کے والدِ ماجد کا نام ابوعبداللہ محمد تھا۔ مشہور ومعروف مؤرِخ رِجال علامۃ ابن خَلکان اپنی شہرۂ آفاق کتاب وَفَیاتُ الاَعیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ والدِ نعمان ایک سِن رسیدہ بزرگِ وقت تھے۔ عہدِ گذشتہ اور عصرِ رَفتہ کے نہایت حیرت انگیز اور دلچسپ اخبار اور حوادثِ زمان لوگوں کو بیان کرتے تھے اور ایک سو چار سال کی عمر میں ۳۵۱ھ میں انتقال فرماگئے۔ آپ کے ہونہار اور ذہین فرزند سیدنا القاضی النعمان قس بن محمد نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور قیروان کے بابُ السلام میں مدفون ہوئے۔

مذہب مؤلف میں اختلافات

سیدنا القاضی النعمانؒ کے مذہب کے تعین کے متعلق چند اختلافات ہیں۔ بعض محققین و مصنفین کا قول ہے کہ آپ اول مالکی مذہب سے تعلق رکھتے تھے پھر امامی اثنا عشری ہو گئے اور بالآخر آپ نے اسماعیلی مذہب اختیار کرلیا۔ بیشتر امامی محققین و مؤرخین آپ کو اثنا عشری مذہب کے معتقد مانتے ہیں جن میں قاضی نور الدین شوستری اور آغائے بزرگ طہرانی کا نام سرِ فہرست ہے۔ بنائے برین پر ان کا ہمخیال ہونا اُس حقیقت پر مبنی ہے کہ القاضی النعمانؒ نے فقہ اور تاریخ کی جتنی کتابیں تصنیف فرمائیں مثلاً دعائم الاسلام، تأویلُ الدعائم، المناقبُ والمثالبُ اور شرحُ الاخبار اور دیگر کتب سیر و استدلال میں جتنی روایتیں منقول کی ہیں اُس کے اسناد کو رد کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے لے کر الامام جعفر الصادقؑ تک ہی محدود ہیں اس کے سوا یا بعد ازاں کے دوسرے راویوں کے اقوال کو منقول نہیں کیا۔ بعض جگہ پر الامام جعفر الصادقؑ کے بعد کے اثنا عشری ائمہ کے منقول شدہ اقوال متنِ موضوع بیان کی مناسبت میں ملتے ہیں پھر بھی آپ نے ایسی روایتوں کو مُستردّ کر دیا ہے۔ ان مؤرخین کا یہ وہم و گمان ہے کہ القاضی النعمانؒ اول میں امامی مذہب کے ہونے کے سبب خلفاء فاطمیین کی ایسی روایتوں کے نقل کے باعث اعتراض سے بچنے کے لئے ایسا کیا ہے۔ دوسری جانب الامام الفاطمی ہی تمام اقوال و احادیث کے اسناد کی کڑی ہوتے ہیں اور اُن کا یہ ناقابلِ تردید وثوق و ایمان کہ امام زمانہ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ عین قرآن و حدیث کے خاکے میں ہی ہوتا ہے، امامی مذہب کے علماء کے نظریہ کو باطل کر دیتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ناقابلِ فراموش ہے کہ اسماعیلی فرقہ فاطمی حکومت کے محکمۂ علم و تعلیم اور صیغۂ نشر و اشاعتِ عقائد کے ان کو اہم ستون شمار کرتے ہیں۔ اور ان کی تصانیف کو دعوت کے ادب و فلسفہ، اخبار و فقہ، رد و استدلال کی مخصوص ترین رائج کتابوں میں تصور کرتے ہیں۔ بعض متعصب مؤرخین جیسے کہ ابن تغری بردی یوسف اور ابن العماد الحنبلی نے تو حکومت فاطمیہ کی بغض و عناد کی وجہ سے نعوذ باللہ ناقابل ذکر الفاظ کہہ

ڈالے ہیں اور یہ خیال بھی پیش کیا ہے کہ مذکور حنفے المذہب تھے اور بعد میں اسماعیلی مذہب قبول کرلیا لیکن پروفیسر اسمائیل پونا والا اپنی تحقیقات کے پُرثمر نتیجے تک پہنچے اور یہ ثابت کرنے کی کارآمد کوشش کی ہے کہ سیدنا القاضی النعمان نے خود اپنا عقیدہ ترک نہیں کیا تھا لیکن فی الحقیقت اُن کے والدِ گرامی نے مالکی مذہب کو خیر باد کہکے اسماعیلی مذہب اختیار کرلیا تھا۔

However, the early Imami bio-bibliographers, such as al-Najashi (d.450/1058) and al-Tusi (d.460/1067), do not mention al Qadi al Nu'man. Perhaps, either they were not acquanted with the works of al-Qadi al-Nu'man, or the latter had not yet acquired an Imami stamp. Ibn Shahrashub (d.588/1192) was probably the first Imami author to include al-Qadi al-Nu'man, in his bibliography. He mentions with appreciation some works of al-Qadi al-Nu'man, such as Sharh al-akhbar and al Manaqib wa 'l-mathalib, but, at the same time, asserts that the author is not an Imami. This assertion supports the assumption that some Imami circles did consider as Qadi al-Nu'man to be an Imami.

The Isma'ili movement, from its beginning, seems to have drawn a certain number of Imamis into its fold. Some of the outstanding Isma'ili da'is, for example Mansur al-Yaman, 'Ali b. al-Fadl, Abu Abdallah al-Shi'i, and Hasan-i Sabbah, were first Imamis; subsequently they were converted and recruited by the Isma'ili da'wa. With the decline of the Buyids in Baghdad and their ensuing fall, Fatimid Cairo proved to be a refuge for Shi'ted; and many Imamis were attracted to this new centre. The existence of a large number of Imamis in the Fatmid capital attested to by the proclamation of the Ismaili faith as the official creed of the Fatimid empire by Abu 'Ali Ahmad (niknamed Kutayfat) b. Afdal, the grandson of Badr al-Jamali, in the year 524/1129-30, and the appointment of an Imami qadi along with three others. It is not improbable, therefore, that such a group of Imamis might have been instrumental in introducing al-Qadi al-Nu'man's works to the Imami circles and also in giving him an Imami character.

For the period umder discussion no Imami source is known that specifically asserts that al-Qadi al-Nu'man was an Imami. However,

the situation changes dramatically in the later period. as most of the Imami divines now unequivocally vouch for al-Qadi al-Nu'man's being a strict Imami. Al-Qadi Nur Allah Shushtari (d. 1019/1610) was probably the first Imami divine to state that al-Qadi al-Nu'man was at first a Maliki and then became an Imami.

The foregoing survey clearly indicates that the assumption aht al-Qadi al-Nu'man was an Imami, held by most of the later Imami savants, was based on Ibn Khallikan's statement. Let us, then, turn to the therory of al-Qadi al-Nu'man's conversion stated by Ibn Khallikan himself. According to him, al-Qadi al-Nu'man was at first a Maliki and then became an Imami and wrote several works for the fatimids. Unfortunately, A.A.A. Fyzee erroneously takes the above statement to imply that al-Qadi al-Nu'man, after having embraced the Imami faith, was converted to the Isma'ili faith.

دولتِ فاطمیۃ اسماعیلیۃ کے ۲۹۶ھ میں قیام کے ساتھ ظہور کے پہلے فاطمی امام حضرت عبد اللہ المھدی صلع کے ساتھ تعلق وروابط پیدا ہونے سے قبل آپ کے حالات زندگی دستیاب نہ ہونے کے باعث تاریخ نویسوں سے اس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے آپ کے مذہب کی تبدیلی کے جداگانہ نظریۂ تاریخ وضع کرڈالی اور اس سلسلے میں افتراپردازی سے کام لیا اور نقلِ کفر کفر نباشد کا مِصداق بنا کر جو بات علامۃ ابن خاکان نے کہی اُسے کَمَا حقّه وأصله سمجھ کر نقل کردی مگر حقیقتِ مسلّمہ یہ ہے کہ آپ اول ہی سے اسماعیلی مذہب کے تابع ومعتقد تھے اور اپنی جان ومسلک کی حفاظت کے لئے تقیہ کئے ہوئے تھے۔ مؤسّس دولت وخلافت فاطمیۃ الامام عبد اللہ المھدی صلع باللہ جب ابوعبد اللہ الشیعیؒ کی کوشش پیہم اور تدبیرِ خاص سے کتامۃ اور بربر قبائل کی حمایت ونصرت کے بدولت شمالی افریقہ یعنی مغرب میں ۲۹۶ھ میں اپنی شخصیت علی الاعلان ظہور پذیر فرمائی اور اغالبۃ نے آپ کا ساتھ چھوڑ کر جب راہِ زار اختیار کی تو آپ نے ان کے دیار میں نزولِ اجلال فرمایا اس وقت فاطمی خلافت کے دربار میں ۳۱۳ھ میں سیدنا القاضی النعمان قس فاطمی امام المہدی باللہ صلع کے پیش خدمت واطاعت ہوئے۔

عہدۂ قضا

آپ گیارھویں فاطمی امام القائم بامر اللہ کے عصر میمون میں طرابلس شہر کے قاضی تھے اور بارھویں فاطمی امام المنصور بنصر اللہ کے عہد مبارک میں شہر منصوریہ کے پہلے قاضی مقرر کئے گئے۔ آپ نے آپ کے علم و فضل کا وہ کمال وجلال کا مظاہرہ کیا کہ چند ہی سال میں بعد میں افریقہ کے تمام شہروں کے قاضی القضاۃ اور داعی الدعاۃ کے باشان و شوکت درجے پر فائز ہوئے جو حکومت فاطمین کا بلند پایہ عہدہ تھا۔ علاّمہ ابن اثیر رقمطراز ہیں کہ سیدنا القاضی النعمانؒ مصر کے فسطاط شہر میں اقامت فرماتے تھے اور ہر روز قاہرۃ تشریف لانا آپ کا معمول تھا۔ ابن خلکان مؤرخ المکی اور ابن ذولاق سے یہ بات نقل کرتے ہیں کہ موصوف قرآن کے علوم ومعارف، تنزیل وتأویل کے اسرار اور ظاہر و باطن شریعت کے رموز واشارات سے اچھی واقفیت رکھتے تھے اور انہیں تأویل وحقائق اور فقہی احکام پر غیر معمولی عبور تھا۔

تألیفات وتصنیفات القاضیِ النعمانؒ

مذکور قاضی علم فقہ، اختلافات فقہاء، اصول دین، استدلال اور تردید عقائد، شعر ولغت، ادب وخطابت کے فن میں ماہر العلوم اور وحید الزمان تھے۔ آپ کے معاصر اور مؤرخین نے آپ کے ہر ایک فضل وکمال، وسعتِ علم، ثقافت و ذہانت اور عقل وادراک کا اعتراف کیا ہے۔ آپ نے فاطمی علوم ومعارف عقائد و تاریخ کی کئیں اہم تصنیفات نذر قارئین و مدرّسین کی ہیں جس کا شمار تقریباً ۶۵ ہوتا ہے اور جو مذہب فاطمی کی ابتدائی معلومات کو فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ بحث وتدریس کے لئے کافی ہیں اور ان کا مطالعہ مذہب فاطمی کے افہام تفہیم کے بعد بنیادی اور اساسی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان تألیفات کی کیفیت واہمیت یہ ہے کہ علم کے ہر شعبے پر کتاب کی ترتیب کے سبب طالب علم کے تمام طبقوں کے لئے کچھ نہ کچھ ارشاد و ہدایت کا لاقیمۃ سرمایہ ملتا ہے۔ قابلِ ذکر اور لائق تحسین

امر تو یہ ہے کہ ان تمام تصنیفات کو مُرتّب کرتے وقت آپ نے اس بات کا خاص اہتمام اور التزام رکھا تھا کہ ہر کتاب کو ترتیبی جامہ پہنانے کے بعد ایک ایک فصل اور باب کو تسلیم شدہ اور تحقیق شدہ معروف و مستند روایات خاصۃ اور عامۃ کو فاطمی امام المعزلدین صلع اللہ کی خدمت میں استفادے اور استفسار کے لئے پیش خدمت کرتے تھے اور آپ کی علمی قدر وشناخت اور اثر و رُسوخ کی شان پہ امام المعزلدین صلع اللہ امامی مہر لگاتے تھے اور نشر واشاعت کا فرمانِ امامی جاری کرتے تھے۔ آپ کی علمی خدمات کا وہ عالم تھا کہ امام المعزلدین صلع اللہ نے یہاں تک ارشاد فرمایا "قال صاحبُ الزمان الامامُ المعزلدین اللہِ الفاطمی الخلیفۃ الرابع عشرہ۔

مَن یُؤدِیَ جُزء مَاادَاہُ النعمانُ اَضْمَن لَہ الجنۃَ بِجوارِ رَبِّہ

کہ اگر کوئی خدماتِ نعمان کا عُشر وعُشیر ادا کرے گا تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں جو اپنے رب کے بہت ہی پاس ہوگی۔

علامۃ ابن خلکان نے اپنی کتاب وَفیاتُ الأعیان میں مذکور کی صفت وثناء کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ "آپ تحریر فرماتے ہیں کہ القاضی النعمانؒ نے اہلِ بیت رسول اللہ ﷺ کے حقوق مناقب اور فضائل کی تائید وتصدیق اور حمایت میں ہزاروں اوراق اور مخالفین ومنکرینِ مقامِ آل رسول اللہ ﷺ کی تردید ومذمت اور مثالب میں بھی بے شمار کتابیں تحریر فرمائیں"۔ آپ نے جوأر جورۃ دینِ حق کے ثبوت میں لکھا ہے وہ عربی ادب کی تاریخ میں سب سے طویل ہے اور آپ کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔

علم فقہ

(۱) کتاب الایضاح (۲) مختصر الایضاح (۳) کتاب الأخبار فی الفقۃ (دوجلدیں) (۴) القصیدۃ المنتخبۃ منظوم (۵) کتاب الاقتصار (۶) دعائم الاسلام (دوجلدیں) (۷) کتاب الینبوع (۸) مختصر الاثار (دو جلدیں) (۹) کتاب الاتفاق والافتراق (۱۰) اختلاف فی اصول المذاھب

(۱۱) کتاب المقتصر (۱۲) کتاب الطهارة (۱۳) کتاب عبادة یوم ولیلة فی الصلوات المفروضة (۱۴) رسالة الحبرة فی الفقه (۱۵) اجوبة القاضی النعمانؒ للزواوی (۱۶) اختلاف الفقهاء (۱۷) البلاغ الاکبر والناموس الاعظم فی اصول الدین (۱۸) تقویم الاحکام (۱۹) منهاج الفرائض۔

تاریخ وسیرت

(۲۰) الأرجوزة الموسومة بذات المحن (۲۱) الأرجوزة الموسومة بذات المنن (۲۲) معالم الهدی (۲۳) إفتتاح الدعوة (۲۴) شرح الاخبار ۱۲ اجزاء (۲۵) کتاب المناقب والمثالب دوجلدیں (۲۶) کتاب المغازی (۲۷) کتاب المجالس والمسائرات دوجلدیں۔

آپ کی تقریباً ۶۰ تالیفات میں سے فقط بعض ہی دستیاب ہیں اور تقریباً ۱۰ کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

تردید عقائد

(۲۸) کتاب الامامة (۲۹) الأرجوزة المختارة (۳۰) کتاب الرد علی الخوارج (۳۱) کتاب التقریع والتعنیف (۳۲) الرد علی ابن سُریج البغدادی (۳۳) الرسالة المصریة فی الرد علی الشافعی (۳۴) دامغ الموجز الرد علی العتکی (۳۵) رسالة ذات البیان فی الرد علی ابن قتیبة (۳۶) الرد علی مالك (۳۷) الرد علی ابی حنیفة النعمان بن ثابت۔

تأویل وحقائق

(۳۸) أساس التأویل (زیرطباعہ مخطوطہ) (۳۹) تأویل الشریعة (۴۰)

كتـاب التوحيد فى شرح خطب أمير المؤمنين على عليه السلام دوجلدیں (۴۱) إثبات الحقابق فى معرفة توحيد الخالق (۴۲) نهج السبيل (۴۳) حـدود المـعرفة ۷۰ اجزاء (۴۴) الـراحة والتسلّی (۴۵) كتـاب فيـما رفضتـه الـعـامةْ مـن كتـابِ الله تع وانكرته (۴۶) كيـفيةُ الـصلوة على الـنبی ﷺ (۴۷) تـأويـل دعـائـم الاسـلا م أوتربية المؤمنين ۱۲/اجزاء (۴۸) تأويل الرؤيا (۴۹) تأويل القرآن۔

المتفرقة فى العقائد والادب والموعظة

(۵۰) كتاب الهمة (۵۱) كتـاب التـعقيب والانقياد (۵۲) كتـاب الدعآء (۵۳) مـقامات الائمة (۵۴) مـفاتيح النعمة (۵۵) رسـالة الى المرشد الـداعـى بمصرفى تربيت المؤمنين (۵۶) كتـاب الحلى والثواب (۵۷) كتـاب الشروط (۵۸) كتـاب الـحروف (۵۹) الـرسـالة المذهبة (۶۰) اصول الحديث (۶۱) كتاب المعاد فى خلاص النفوس۔

وفات مؤلف

آنے والی نسلوں کی دینی، علمی، ذہنی اور عقلی ارتقاع کے لئے قابل دید و تدریس علمی سرمایہ چھوڑ جانے والی محفل و مجلس فاطمی ائمہ کی ضوفشاں اور روشن شمع ۲۹ جمادی الثانی ۳۶۳ھ میں ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی۔ القاضی النعمان علالت ومرض کے متعلق تاریخ میں کوئی تفصیل موجود نہیں ہے لیکن آپ کے انتقال سے مسندِ علم وفقہ رنج والم میں ڈوب گئی۔ آپ کا سب سے بڑا علمی شاہکار جو ہمیشہ تاریخ دعوۃ فاطمیہ میں یادگار رہے گا۔ آپ کی بے مثال تألیف کتاب دعائم الاسلام جو دو جلدوں پر مشتمل ہے فقہ مذہب اہل بیت رسول اللہ ﷺ کی یہ وہ عظیم تألیف ہے جس کو حفظ کرنے کے لئے امام علی الظاہرؑ نے لوگوں کو حکم دیا تھا اور اس کے حفظ کی حوصلہ افزائی کے لئے بطور انعام زرِ کثیر اور خلعت امامی مقرر کئے

تھے۔ آپ کی گرانقدر خدمات کی قدر کرتے ہوئے خلیفۂ وقت امام معزلدین اللہ صلع نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کو القاھرۃ المعزیہ میں قصر عالی میں دفن فرمایا۔

آپ کی اولاد اور فاطمی حکومت

آپ کے انتقال کے بعد اور اس کے پہلے آپ کی اولاد بافضیلت بھی فاطمی اماموں کی خدمت میں کوشاں اور تدبیر کُن تھی، اور آپ کی نقشِ قدم پر مصر میں عہدۂ قضاء عدل میں ممتاز مقام رکھتی تھی۔ آپ کے فرزند اکبر بنام ابوالحسین علی بن نعمان کی فاطمی خلیفۃ الامام العزیز باللہ صلع کے نزد قدر و منزلت تھی۔ آپ کو ابوطاھر ذھلی کے انتقال کے بعد عہدۂ قضا پر فائز کیا گیا اور جامع مسجد میں حاضرین کے مابین مقدمہ کے فیصلہ سنا رہے تھے کہ ایک روز آپ کو اچانک تپ کا حملہ ہوا اور جانبر نہ ہوسکے۔ چودہ روز کی گوشہ نشینی اور علالۃ کے بعد رجب ۳۷۴ھ میں وفات پا گئے رضوان اللہ علیہ۔

سیدنا نعمان کے فرزند صغیر ابوعبداللہ محمد بن نعمان بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح عہدۂ قضا کے مرتبۂ جلیلۃ پر فائز ہوئے تھے اور الامام المعز علیہ السلام نے خاندان مؤلف کی قدردانی کرتے ہوئے ابوعبداللہ محمد بن نعمان کو اپنے مکتوب گرامی میں لکھا تھا کہ تمہارے بھائی قاضی علی کے بعد عہدۂ قضا پر تمہارا ہی حق ہے لہذا ہم خاندان نعمان اس عہدہ کو خدا نہ کرے کبھی بھی مسترد نہیں کریں گے۔ قاضی محمد بن نعمان بھی اپنے پدر بزرگوار اور بڑے بھائی کی طرح روایت و درایت، شعر و ادب اور فن تاریخ نویسی میں زبردست ابلاغ رکھتے تھے۔ آپ کا مرتبہ امام العزیز باللہ علیہ السلام کے عصر میمون میں اتنا ارفع و اعلی تھا کہ امامِ زمانہ کے ساتھ منبر کی بغل میں آپ کی نشست نصب کی جاتی تھی اور ایسی قابل احترام شخصیت کے حامل تھے کہ آپ کو سیدنا کے لقب سے خطاب کیا جاتا تھا۔ آپ ذاتی فضل و کمال، علم و جلال، ہیبت و جمال اور اقامت حق کی وجہ سے ایک غیرِ معمولی شان و عظمت کے مستحق ہوگئے تھے کہ عراق کی سرزمین میں بھی مانند آپ پہلے کبھی کوئی قاضی نہیں گذرا تھا۔

دعوت علویہ اور مؤلف کے مخطوطات

شہر بڑودہ دعوت کے دعاۃ علویہ کا اندازاً ۳۷۵ سال سے مرکز رہا ہے۔ ۳۲ ویں داعی علوی سیدنا ضیاء الدین صاحب قس ۱۱۰۰ھ کے قریب احمد آباد سے بڑودہ ہجرت کر کے آئے مقیم ہوئے اور اپنی جماعت کو سنوارا سینچا۔ محلات مسجد وغیرہ تعمیر فرمائی اور ہمراہ آپ کے علم و تعلیم کا عظیم سرمایہ مخطوطات کے طور پر ساتھ لائے تھے جو آج تک دعوت ھادیہ کے خزائن عامرۃ میں موجود ہیں تواتر وحوادث الزمان اور قدرتی آسمانی آفات وعلل کے باوجود آج بھی یہ مخطوطات اپنی حالت اصلیۃ پر موجود ہیں اور بعد دعات علویہ نے اس کے اہتمام تحفظ اور انتساخ جدید مع تجلید کے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ موصوف مؤلف القاضی النعمان قس کے بھی فی الحال مندرجۂ ذیل مخطوطات کے نسخہ کما اصلھا دستیاب ہیں اور آج بھی ابناء الدعوۃ اور تلامذۃ اس کا استفادہ لے رہے ہیں۔ القاضی النعمان قس کی تصنیفات میں سے جو دعوۃ علویہ کے خزانے میں ہیں وہ حسب ذیل ہیں :

(۱) دعائم الاسلام دوجلدیں (۲) مختصر الاثار دوجلدیں (۳) القصیدة المنتخبة دوجلدیں (۴) الاقتصار دوجلدیں (۵) الارجورة المختارة (۶) كتاب الطهارة (۷) تقويم الاحكام (۸) تأويل الدعائم ۱۲/اجزاء (۹) افتتاح الدعوة (۱۰) المجالس والمسائدات ۲حصے (۱۱) اجوبة القاضی النعمان (۱۲) كتاب الحيرة فی الفقه (۱۳) المناقب والمثالب (۱۴) كتاب التوحيد (۱۵) كتاب الهمة فی آداب ابتاع الائمة (۱۷) تأويل الشريعة (۱۸) منهاج الفرائض (۱۹) مفاتيح النعمت (۲۰) شرح الاخبار تمام اجزاء

(۲۱) اساس التأويل الباطن (فی التأويل)

موصوف القاضی کی تصنیفات میں سے ۲۰ دعوۃ ھادیہ علویہ میں موجود ہیں جن

کے متعدد نسخے بھی ہیں جو مختلف کاتبوں کے لکھے ہوئے ہیں لہٰذا موصوف کی حیاتِ طیّبہ اور علمی کارناموں پر اور مع ھذا غالبًا اسماعیلی فاطمی عقائد پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کا شوق خاکسار کو پیدا ہوا ہے۔ چونکہ آپ کے تصنیفات ہی آپ کے آراء و خیالات اور حیاۃ پاک کی زندہ تصویر ہے لہٰذا موصوف کے لئے جو بھی کہا گیا ہے اور لکھا گیا ہے وہ کم ہے پھر بھی لائق تحسین اور قابل ذکر ہے۔

مخطوطۂ اساس التأویل کی ماھیہ اور تفصیلات :۔

کتاب کا نام : أساس التأويلِ الباطن / أساس التأويل فى الباطن / أساس التأويل

مصنف : سیدنا القاضی النعمانؒ بن محمد بن منصور بن احمد بن حیون التمیمی المغربی

سائز : 25.5x18.5cm طوالت سطر : 13.5cm سطور : ۱۳

خط : نسخ جلی۔ ابواب فصول /ایات کی علامت سرخ سیاہی میں

زبان : عربی مالک : الدعوۃ الھادیۃ العلویۃ ۔ وادی بڑی محلّہ۔ بڑودہ

کاتب الحروف : حاتم زکی الدین (ماذون الدعوۃ العلویۃ) ابن سیدنا طیب ضیاء الدین ط ع ش (الداعی المطلق العلوی)

اوراق : ۱۶۶ متن کتاب-۲۲ بیاض

موضع کتابت : بڑودہ۔ دعوۃ ھادیۃ کے قصر عالی میں

تاریخ کتابت : ۴ /ذوالقعدہ ۱۴۲۴ھ بمطابق ۲۷/دسمبر ۲۰۰۳ء

مہر : دو مہر تین جگہ پر لگی ہیں۔ ایک دار الکتب العلویۃ ۔ دوسری الدعوۃ الھادیۃ العلویۃ فی عصر سیدنا ومولانا طیب ضیاء الدین صاحب ط ع ش

موضوع : قصص القرآن کی تأویل اور فاطمی دعوۃ وامامۃ کے اہم عقائد کے حقائق کی تفسیر

آغاز : بسم اللـه الرحمن الرحيم الحمدُ للّٰه مفيد النعمة وصلَى

اللّٰهُ علی محمدٍ نبی الرحمة وعلی وصیّه علی ابن ابی طالب ع م ولیّ الامةِ وعلی الائمة من ذریتهِ الطاهرین من ابنائه الطیبین

اختتام : وان علیًا علیه السلام دعا همدان فاجاب منهم مأیةُ رجلٍ علیهم الدروع تم الجزء السابع عشر وکتاب اساس التأویل الباطن............ التمیمی المغربی

ترقیم الکاتب : قد وقع الفراغ عن نسخة هذا الکتاب المستطاب برحمة الملك الرهاب.......... فی وقت العصر فی بلدة بژوده فی وزارة القصر العالی الواقع فی المحلة البدریة۔

کتاب کی سبب تنسیخ اور اس کا متن

کتاب کے جدید نسخہ کا انتساخ کا یہ سبب ہے کہ الداعی العلوی تین صدی پہلے جب احمد آباد سے بڑودہ منتقل ہوئے تو ان کے ہمراہ بے شمار کتابوں کا ذخیرہ جو اسماعیلی عقائد واخبار پر خاص اور ظاہرہ علوم پر عام طور سے مشتمل تھا۔ لائے تھے چنانچہ اثناء راہ میں چند کتابیں آب زدہ ہوگئی تھی اور مدت مدیدۃ کے دوران شہر میں متعدد بار سیلاب آنے سے اور کرم ودیمک کے حملے سے ناقص اول وآخر ہوگئی تھیں۔ باوجود اس کے اُس زمانے میں اسکول ومدرسے کا علٰحیدہ نظام وجود پذیر نہیں تھا لہٰذا سردار قوم اور رہبر ملت داعی دعوۃ ہی اپنے بیت الشرف میں تمام علوم وفنون کی تعلیم کے ذاتی قومی مدرسے چلاتے تھے اور یہ کتابیں اکثر منظر عام اور استعمال تلامذہ ہونے کے باعث ہاتھوں ہاتھ ضائع ومسروق ہوگئی تھیں۔ چنانچہ بعض دعاۃ علویہ نے بتدریج ناقص وآب زدہ مخطوطات کے انتساخِ جدید کا بیڑا اٹھایا۔ زیرِ بحث مخطوطے کا قدیم نسخہ آبزدہ ہوجانے سے اتنا بوسیدہ اور فرسودۃ ہوگیا تھا اور ایک صفحہ دوسرے صفحے سے چسپان ہوگیا تھا اور عبارت مشکل سے پڑھی جاتی تھی لہٰذا نسخہ ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔ خاکسار کاتب الحروف کو پہلے سے اُمید تھی کہ بقیہ ناقص نسخوں کی

ترمیم کے بعد انتساخِ جدید کی جائے اور ذخیرہ کو ایک بار پھر نئی تشکیل دی جائے بفضل اللہ وکرمہ یہ کارِ ثواب تمیم پر پہنچا ہے اور پچھلے چار سالوں میں احقر العباد نے تقریباً ۲۰ کتابوں کے نسخوں کی تسوید کا شرف حاصل کیا ہے۔ واللہ الموفّق وھُو المستعانُ فی جمیعِ الأمورِ۔

موجودہ نسخے کا متن اور محتویات

یہ کتاب سترہ اُبواب پر مشتمل ہے۔ ولایت ومودّۃِ اُھل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وصایت امیر المؤمنین مولانا علیؑ ابن ابی طالب کے اثبات کے عقلی اور نقلی دلائل وبراھین پیش کئے گئے ہیں اور اٰیات قرآنی واحادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حسن اتفاق پیش کیا گیا ہے اور امامت کا وجوب وثبوت کا موضوع ہر باب کے اوائل واواخر میں متضمن ومنسلک کیا گیا ہے۔ حاصل کلام موصوف مصنف القاضی النعمانؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تأ لیف دَعائم الاسلام کے باب الولایت کی گویا اس میں تشریح وتوضیح کرلی ہے۔ چنانچہ جس نے کتاب مذکور کی دراست کرلی اُس کے لئے اس کتاب کے پڑھنے سے امامۃُ خلافۃ کا منصب من اللہ ہونے کا تصوّر صاف ہو جاتا ہے۔ پہلے باب میں ایمان اسلام۔ ظاھر وباطن شریعت۔ انبیاء نطقاء کے دنیا میں آنے کا مقصد اور ان کے درجات۔ لوگوں کے عقلی ذہنی معیار کے مطابق تفہیم قرآن اور تأ ویلِ اٰیاتِ شریفۃ کے بیانات وغیر بسطۃ سے درج کئے گئے ہیں پھر ہر ایک باب میں حضرت آدمؑ سے لے کر ختم المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء مرسلین گذرے ان کے حالات زندگی اور قصوں کے ظاہری اور باطنی وجوھات حتی الامکان بڑے ہی حسن اسلوب اور سلیس بیانی سے تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے پیش کئے گئے ہیں۔ آخری دو باب اس کتاب کی تأ لیف کے سبب کا نچوڑ ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عصر میمون کے حالاتِ چُنندہ خیر وخوبی سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ سیدنا ھبۃ اللہ المؤید فی الدینؒ الشیرازی نے اس کتاب کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کے عالم اسلام کے کئی دار الکتب میں نسخہ موجود ہیں۔

اس کتاب کی کتابت کے وقت خاکسار نے دوران تحریر ایاتِ قرآنی کے ابتدائی دوحرفوں پر دوسرخ خط اور احادیث نبوی پر ایک سرخ خط کھینچ دیا ہے تا کہ قاری کو ایت قرآنی کا متن اور اس کی تفسیر و تاویل کی سطور میں میزان ہو سکے، مع ھذا میں نے ایک خیال یا جملہ یا نکتہ ختم ہو جانے پر وقف کے لئے سرخ علامت کردی ہے تا کہ قاری کو تسلسل خیالات کے ربط وضبط اور ابتداء واختتام کا اندازہ ہو سکے اور نتیجتاً مطلب و معنی سمجھنے میں آسانی ہو۔ بساوقات نسخۂ اصلیہ کی عبارت کے چند الفاظ میری فہم وادراک میں نہیں آئے ہیں ایسی صورت میں حاشیہ میں پینسل سے لکھ دیا ہے ''کما فی النسخة الاصلية القديمة'' جیسا کہ پرانے اصلی نسخے میں ہے..... چنانچہ قاری کے لئے کتاب کا دوسرا مکمل نسخہ ملنے پر خطأ کی تصویب سہل ہو۔

کتاب میں بیان شدہ اسماعیلی فرقے کے بعض عقائد:

اسماعیلی فرقہ قرآن کریم فرقان حکیم میں رب تعالیٰ نے جو آیات شریفہ میں ارشاد فرمایا ہے جیسا کہ ''اِنِّی جَاعِلٌ فِی الاَرْضِ خَلِیْفَة'' معنی: میں زمین میں اپنا خلیفہ مقرر کرنے والا ہوں۔ اور وکل شیء احصیناہ فی امام مبین معنی: ہم نے ہر چیز کو ظاہری امام میں گھیر لیا ہے اور یَوْمَ نَدْعُوْ کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِم معنی: حساب کے دن ہم لوگوں کو اُن کے اپنے امام کے ساتھ بلائیں گے اور اطیعوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْامرِ مِنْكُم معنی: (اے ایمان والو) طاعت کرو تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اور تم میں سے اولوا الامر کی۔ یہ چار آیتیں امامت کے درجۂ لم یزل کے اثبات ووُجوب کے لئے پیش کرتے ہیں اور اس بات کے قائل ہیں کہ یہی آیتیں امام زمان کو مفروض الطاعت یا واجب الطاعت قرار دینے کے لئے کافی ہیں۔ امام کے لفظ کو بعض مفسرین نے کتاب اللہ یا نامۂ اعمال کا اطلاق دیا ہے لیکن اس کتاب میں مؤلفِ موصوف نے جابجا امام مبین کو ظاہری امام یا خلیفۃ اللہ یا حجۃ اللہ علی الارض لیا ہے جو زمین پر اللہ کا نمائندہ اور حجۃ ہوتا ہے اور زمین اس کے بغیر قرار نہیں پاتی۔ اہلِ بیت رسول اللہ ﷺ کو سفینۂ نوح سے تعبیر کیا ہے اور اسی لفظ پر ان کا محور

اورانحصار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد انما انت منذر ولکم قول ھاد معنی اے اللہ کے رسول تم بیشک لوگوں کو ڈر سنانے والے اور ہر زمان میں ہدایت دینے والے ہوتے ہیں۔ یعنی کہ اسماعیلی فرقہ قوم کا اطلاق زمان سے لیتا ہے کیوں کہ اگر قوم سے مراد لوگوں کی لی جائے تو خلیفۃ من اللہ اور ایک ہی حجۃ اللہ کا ایک زمان میں ہونے کے تصور کی تردید ہو جاتی ہے۔ لہٰذا خلیفہ کے تقرر وانتخاب کا کلی اختیار صرف اور صرف اللہ وحدہ لاشریک کو ہی ہے۔ اگر لوگوں کو اختیار دیا جاتا تو قبائل وخاندان والے اپنے اپنے شیرازے کے عالم وفاضل رئیس کو اپنا خلیفہ اور امام مقرر کر لیتے اور امت مسلمہ ہزاروں فرقوں میں تقسیم ہو جاتی۔

اسماعیلی فرقہ قرآن کریم کی آیت شریفۃ ومن یعبد الله علی حرفٍ یعنی کہ جو خداوند تعالیٰ کی ایک حرف پر عبادت کرتا ہے یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت میں ایک حرف سے مراد صرف عبادت کے ظاہری پہلو کا علم ہے۔ جو ظاہر کو مانتے ہیں اور باطن کو چھوڑ دیتے ہیں یا باطن کو مانتے ہیں ظاہر کو چھوڑ دیتے ہیں ویسی عبادت جائز اور قابل قبول نہیں ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر ظاہر کا باطن ہوتا ہے اور باطن اور ظاہر دونوں کو ساتھ میں ماننا چاہئے۔ یہ لوگ تأویل کو قرآن کا جُزءٌ لایَنفَکّ سمجھتے ہیں۔ ہر ظاہر چیز کے مقابلے پر باطن ہے وہ قرآن وشریعت اور احادیث رسول اللہ ﷺ اور اقوال ائمہ معصومین طاہرین میں پوشیدہ تمام رموز واشارات کو تأویل ہی کی روشنی میں حل کرتے ہیں وہاں یہ نہیں کہ جہاں خناق پیدا ہوا وہاں تأویل کی پناہ لے لی۔ تأویل تو ان کی ادب اور حقیقت کا اصل واصول ہے جسے ہر قیمت پر جُدا نہیں کیا جا سکتا۔

علم تأویل میں اساس التأویل کتاب کا درجہ نہایت بلند ہے۔ یوں تو موصوف کی دوسری تألیف مثلاً تأویل الدعائم اور تأویل الشریعت میں ارکان شریعت کی تفصیلی تأویل کی گئی ہے لیکن آپ کے معاصر سیدنا جعفر ابن منصور الیمن قس کی دو تألیفات مثلاً کتاب اسرار النطقاء اور سرائر النطقاء جس میں حقائق قصص القرآن کے ساتھ تأویلی اور تاریخی پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس کو نظر انداز کیا نہیں جا سکتا لیکن موصوف کی کتاب میں قصص القرآن کی تأویل نہایت حسین وخوش اسلوب میں کی گئی ہے کہ جس کا ایک ایک جزء اور صفحہ

اپنے اندر ایک بحرِ عمیق سمائے ہوئے ہیں اور محتاج تشریح و وضاحت ہیں۔

اسماعیلی مذہب علم باطن کی تأویل کی تعلیم سے پہلے علم ظاہر کے انبساط اور اس کی تعلیم کو لازم قرار دیتا ہے۔ تخلیقِ کائنات میں جتنی بھی اشیاء موجودہ ہیں ان کے سمجھنے کے لئے اور پہچاننے کے لئے پہلے ان کے ظاھری پہلو اور حالات و ماھیۃ کا علم دیا جاتا ہے اور پھر ان کی باطنی کیفیات کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ علی ھذا الاصول شریعتِ اسلام کے دعائم کے ظواھر کی تمام تر تعلیمات کے پھلے سے ابتداء ہوتی ہے برا[illegible] ہیں اور پھر ان کے تأویلی باطنی پہلو کی کتابیں پڑھنے کی [illegible]بارت دی جاتی ہے۔ ظواھر کے خوب اچھی طرح سمجھنے اور اس کی بنیاد مضبوط کر لینے کے بعد ہی بواطن الشریعۃ جو اُن میں مضمر و پوشیدہ ہے اس کی تعلیم کی رغبت دلائی جاتی ہے۔ اس کا مؤاخذہ یہ ہے کہ ظواھر الشریعت بواطن کے لئے بطور مقدّمات اور اوائل معلومات کے ہیں۔ شریعت کے تمام تر اسرار و خفیات عوام الناس کو بتائے نہیں جاتے لیکن اسماعیلی جو مؤمن مستجیب کا ایک خاص درجہ رکھتا ہے جہاں پہنچنے سے ایسے تمام تر یا اکثر غوامض ھضم کرنے کی عقلی صلاحیت اور ذہنیت پیدا کر لیتا وہی اُن اسرار پر مُطّلع ہوسکتا ہے۔ یہ ایک مسلّم شرہ حقیقت ہے اور عام دستورِ قومی ہے کہ ائمہ حق۔ دعاۃ ھداۃ اور مقبول علماءِ قوم اپنے راز کے اُمور کو کبھی بھی کسی نا اہل کے قریب منکشف نہیں کرتے بلکہ خاص چنندہ طبقہ ہی کو واقف کیا جاتا ہے جو اس کی اہلیت اور قابلیت رکھتا ہو اور حکمتوں کے علاوہ اس میں یہ امر بھی مدِ نظر ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے کبھی اولیاء اللہ کو جاہل و نابکار لوگوں کی جانب سے خطروں کا اندیشہ ہو اور اسرار کو علی الاعلان منکشف کردے اس لئے فرمایا گیا ہے کہ تکلموا بالناس بحسب عقولھم لوگوں سے ان کی لیاقتِ عقلیت اور امساک کے مطابق ہی گفتگو کیا کرو۔ کیا خوب فرمایا امام زین العابدینؑ سید الراکعین والساجدین نے

وَرَبَّ جوھرَ عِلمٍ لو اَبوحَ لِی – لقِیل لِی انتَ ممَّن یَعبُدُ الوثَنا

(تاریخ علویین صفحہ ۱۸۶)

یعنی کہ علم کے بعض جواہر ایسے ہیں اگر میں اُنھیں بیان کروں تو جاہل لوگ یہ کہنے لگیں گے

کہ یہ توبُت پرستوں میں سے ہے

اسماعیلی فرقہ بیشک اسرار الٰہی کی بہت ہی احسن طریقے سے حفاظت کرتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اسرار کسی کو بتائے نہیں جاتے۔ ضرور افشاء ہوتے ہیں۔ ظاہر کئے جاتے ہیں لیکن اس کا ایک مخصوص مقررۃ طریقہ ہے۔ تعلیم و تفہیم کے درجات کے ذریعے بتائے جاتے ہیں۔ ابتدائی، ثانوی، عالی اور اس سے بھی اعلی۔ ظاہر ہے کہ اسرارِ آلھیۃ اور حقائق خفیت کا تعلق عالی اور افضل درجے سے متعلق ہے۔ پس اگر کوئی شخص ابتدائی تعلیم کے مراحل سے گذر رہا ہو تو اس کو اعلی معلومات کے مسائل و حقائق ہرگز نہیں بتائے جائیں گے لیکن جب وہ بتدریج وتدریب مراتب ومقدماتِ تعلیم طے کرتا ہوا اعلی حد کی تعلیم تک پہنچ جائے گا تو خود بخود وہ اسرار باطنہ اور دقائق غامض اُس پر منکشف وظاہر ہو جائیں گے۔ اس تعلیم کے طرز عمل یا تفویض نصاب کو تعلیم کا نظام کہہ لیجئے یا عوام سے مخفی رکھنا کہہ دیجئے مگر حقیقتِ سطحی یہ ہے کہ استعداد و قابلیت کا لحاظ رکھنے کا نام ہی ان کے یہاں ستر کُمان سے تعبیر کیا گیا ہے یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر مُتعلّم جسے اسماعیلی اصطلاحات میں تلمیذ یا مستجیب کہا جاتا ہے۔ پہلے اُس کو سیدھی سادی قابل قبول عقل باتیں سمجھائیں جاتیں ہیں جو بغیر اشکال ومغز پاشی کے سمجھ سکے جسے اسماعیلی مصنفین محسوسات کہتے ہیں وہ ان محسوسات پر پورے طور سے عبور وفہم حاصل کرلیتا ہے تو اُسے بتدریج وترتیب معقولات کے حصول کی طرف منتقل کیا جاتا ہے تا کہ تلمیذ علمی اصولوں پر خاطر خواہ واقفیت حاصل کر کے ایک ماہر فن اُستاد ومعلم کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ اس عقائد اور اس کی تعلیمی وتدریجی نظام کے ضمن میں پروفیسر اسماعیل پونہ والا قرآن کی اسماعیلی تأویل وتعلیم کی خصوصیات کے سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ

Isma'ili's make a fundamental distinction between aspects of religion, the *zahir* (exterior) and the *batin* (interior). The former aspect consists of exterior aspects. such as knowing the apparent meaning of the Qur'an and performing the obligatory acts as laid down in the *shari'a*. the religious law. The latter aspect is comprised of knowing the hidden. inner. true meaning of the Qur'an and the *shari'a*. They further maintain that it is the *natiq* (lawgiver prophet) who receives revelation

(*tanzil*) and promulgates the *shari'a,* while it is his associate and deputy, the *wasi* (plenipotentiary), who expounds the *batin* through the science of *ta'wil.* The *zahir,* therefore, waries from prophet to prophet in accordance with each epoch, whereas the *batin* remains unchanged and is universally valid. Despite this twofold division of religion into exoteric and esoteric aspects, Isma'ilis stress that both are not only complementary to each other, but that they are also intertwined with each other like body and soul. One without the other, therefore, cannot exist.

The Isma'ili classification of religious sciences into two categories, the *zahiri* sciences and the *batini* sciences, also reflects the above distiction. Accordingly, all branches of knowledge from philological to physical sciences and historical to juridicial fall in the first category, while the other is comprised only of the *ta'wil* and *haqa'iq.* Conspicuously absent from Isma'ili literature is the science of *tafsir* (exegesis), classified as a branch of the *zahiri* sciences. Its absence implies that any *tafsir* could be used for the external philological exposition of the Qur'an and to explain the occassions on which the verses were revealed, but its inner, true meaning could be obtained only through the *ta'wil* derived from the legitimate Imam. For this reason, the Imam is often called *Qur'an-inatiq* (the speaking Qur'an) while the Book, since it needs an interpreter, is called *Qur'an-i-samit* (the silent Qur'an).

In keeping with their basic distinction betweent the *zahir* and the *batin,* Isma'ilis maintain the same distinction between the *tanzil* (the divine message delivered by the Prophet in its literal form) and the *ta'wil* (the hidden, spiritual meaning of the scripture explained by the Imam). In his *Kitab al-maqalid,* al-Sijistani has devoted a separate *iqlid* to elucidating the difference between the two. He states:

The *tanzil* is similar to the raw materials, while the *ta'wil* resemles the manufactured goods. For example, nature produces various types of woods, but unless a craftsman works on them and gives them a specific shape, such as a door, a chest or a chair, the wood

is not worth more than fuel (to be consumed) by the fire. The wood's worth and benefit become manifest only after it receives the craftsman's craftmanship. The craftmanship (is an art which) puts everything in its proper place. Likewise is the case of other raw materials, such as iron, gold, copper and silver. Unless a craftsman works on them, their worth and utility remain hidden... Similarly, the *tanzil* consists of putting things together in words. Beneath those words lie the treasured meanings. It is the practitioner of the *ta'wil* who extracts the intended meaning from each word and puts everything in its proper place. This is, then, the difference between the *tanzil* and the *ta'wil*.

As the craftsman cannot practise his art without the raw materials, the function of *ta'wil* comes after the *tanzil*. Similarly, the rank of the practitioner of *ta'wil* in the Isma'ili hierarchy assigned to the *wasi*, the deputy and successor of the prophet comes after that of the *natiq* who receives the *tanzil* and promulgates the *shari'a*, while it is the *wasi* who imparts the *ta'wil*. It is worth nothing that in the *da'wa* organization, which corresponds to the spiritual hierarchy of the higher world, the religious offices of the *natiq* and *wasi* correspond to the Two Roots: the Intellect and the Soul. This correspondence between the two highest ranks of both the hierarchies is very revealing for the understanding of what follows. After his prophetic revelation, the prophet makes the *wasi* privy to his illumination of the spiritual worlds so that the divine inspiration continues after his death. The *wasi*, thus, is inspired from the heaven (mu'ayyad min al-sama'), and it is this role of imparting the *ta'wil* which he passes on to his progeny.

Isma'ili *tawil* of Qur'an
I.K. Poonawala
ed. Andrew Rippin, Oxford University Press, 1988.

اگر تعلیم و تربیت کا یہ طریقہ رائج نہ ہو بلکہ برعکس اس کے متعلم کو شروع سے ہی تعلیم کے اعلیٰ مباحث و حقائق سمجھنے کی کوشش کی جائے تو نتیجہ سوائے صفر کے اور کچھ نہیں نکل سکتا یہ ایک واضح و مسلّم حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا پس انہیں اصول کو مدّ نگاہ

رکھتے ہوئے علوم ومعارفِ اسماعیلیہ کے مذکورہ بالا تدریجی منازل مقرر کئے گئے ہیں جو بالکل مطابق عقل وتسلیم اور فہم وفطرت ہیں۔

قرآن سے عقیدۂ تأویل کا ثبوت

دعوتِ فاطمیہ اسماعیلیہ کا یہ اہم دینی فلسفیانہ تصور ہے جس سے دین کے حقائق کا جوہر مکشوف ہوتا ہے۔ تأویل وباطن کا تصورِ عقائد شیعوں کے تمام فرقوں میں واجب ورائج ہیں اور اس کا استحقاق جیسے بالا انگریزی بیانات سے صاف ہوتا ہے۔ صرف امامِ زمان برحق کو ہی حاصل ہے اور اس کے ثبوت کے لئے یہ آیت شریفہ پیش کی جاتی ہے وَمَایعلم تأویلہ الا اللّٰہُ والراسخون فی العلم یقولون امنّا بہ قُل کُلٌّ مِن عند ربنا (سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی اس کی تأویل نہیں جانتا اور جو علم میں راسخ ہیں یہ (لوگ) کہتے ہیں کہ ہم وہ (تأویلی بیانات پر ایمان لائیں) کہدو کہ ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے۔) اسماعیلی الا اللہ کے بعد وقفہ کرنا نادرست سمجھتے ہیں۔ الا اللہ اور والراخون فی العلم کو ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں۔ الا اللہ پر عطف ہے۔ یعنی کہ اللہ اور راسخون فی العلم تأویل کو جانتے ہیں۔ راسخ کا مطلب ثابت متمکّن اور پختہ لوگ کے ہیں اور تأویل کا لفظ اٰل یؤلُ سے بنا ہے یعنی کسی چیز کی طرف رُجوع کرنا لوٹانا جو مخفی ہے سرّ ہے۔ اس آیت کے ضمن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت بیان کرتے ہیں۔ مطلب کہ اللہ اور راسخونِ علم تأویل کو جانتے ہیں اس حالت میں کہ وہ کہتے ہیں کہ اٰمنـا بہ کل من عند ربنا ہم علم کے ساتھ اس تأویل کو مانتے ہیں اور ہر ایک محکم ومتشابہ ہمارے رب کے نزدیک سے ہے۔ مطلب کے تأویل کے معنی ہی ہے سوائے ظاہری معنی اور مخفی معنی کے اور وہی ہے مآل انجام اور عاقبت مولانا علی امیر المومنینؑ نے فرمایا کہ قرآن کی کوئی بھی آیت نازل نہیں ہوئی مگر رسول اللہ ﷺ نے مجھے اس کی تأویل سے یا مخفی معنی سے آگاہ نہ کیا ہو جو اس کی ظاہری معنی سے دور ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ ہر آیت شریفہ کی ظہر یعنی پیٹھ ہے اور بطن یعنی شکم ہے اور اسماعیلیوں کے مطابق اللہ سبحانہ نے مدینۃ العلم رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ علیؑ کو تمام علوم جلی وخفی سے مطلع فرمایا تھا۔

لہٰذا یہ اس بات کے قائل ہیں کہ خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ صاحب التنزیل ہے اور امیر المومنین علیؑ صاحب التاویل ہیں اور تاویل بواطن کو لوگوں کے درمیان واضح کرنے کا شرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے صرف وصی رسول اللہ ﷺ کو ہی حاصل تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ اللہ کے ساتھ وہ علماء یعنی ائمہ الطاہرینؑ کو بھی یہ حق حاصل ہوا ہے۔ یعنی وصی کے بعد اُس کی اولاد میں جتنے بھی امام ہوتے ہیں وہ تاویل واسرار الھیۃ سے باخوبی واقف کار ہوتے ہیں اور یہی ائمہ ہیں جنہوں نے اپنے زمان میں تبلیغ وعقائد کی نشر واشاعت کے لئے دعاتِ بلاغ قائم کئے تھے اور ان کے ذریعہ عقائد اسماعیلیوں کو زمانے میں آشکار کیا اور تاویلی تصنیفات کی اجازت دی۔ اس فن کو مزید ترقی پذیر فرمایا اور تمام احکام عبادت اور قصص انبیاء کے متعلق تاویلیں بیان فرمائیں اور کتابیں تصنیف فرمائیں۔

یہاں جو کچھ قارئین کی نذر خدمت کیا جارہا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تاویلی پہلو پر اتنی تاکید ووجوب کے باوجود اسماعیلی ائمہ، دعاۃ بلاغ اور ہداۃ کرام نے کہیں بھی نہ ظاہر شریعت واحکام قرآن کو نظر استھانت سے دیکھا یا اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ظاہری فعل وعمل کو پابندی سے بجالانے کا جابجا اصرار کیا ہے سیدنا القاضی النعمانؒ نے پہلے دعائم الاسلام کتاب میں شریعت کے ظاہری اعمال وافعال کے گرد ونواح بیان فرمائے اور بعد میں تمام ارکان ودعائم کی تاویل پیش کردی۔ آپ کا زمانہ فاطمی حکومت وامامۃ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اگر ظاھری شریعت کی پابندی اُٹھادی ہوتی تو کم از کم ان کے سیاسی معاشی اور اجتماعی دور میں اس کا پروپیگنڈہ کیا گیا ہوتا اور اُمور سلطنت اور تنظیمی کاروبار میں اس کی عکاسی نظر آتی اور دعوت فاطمیۃ کی کتابوں میں اس کا ذکر ملتا۔ مگر اس کی غیر موجودگی اور فاطمی امام العزیز باللہ علیہ السلام کے دعائم الاسلام کتاب حفظ کرنے کا فرمان اور اس عمل خاص پر دربار فاطمی سے انعام واکرام کی نوازش کا اعلان اس بات کی گواہی اور نشان دہی ہے کہ فاطمیوں اسماعیلیوں پر لگایا گیا تعطیل شریعت کا الزام سراسر بے بنیاد ہے صریحاً کذب ہے جو افترا پردازیوں کی کاوش ہے۔

قرآن مجید میں سورۃ الکھف میں حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام اور مرد صالح

خضر کا جو قصہ بیان ہے وہ تاویل باطن کے ثبوت و وجوب کی محکم دلیل ہے جس کا چند ہٹ دھرم مولویوں اور ملاؤں کے علاوہ کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ کیونکہ خود قرآن مجید اس کے ثبوت کی گواہی دیتا ہے جیسا کہ مذکورۂ بالا دو آیتوں سے ظاہر ہے اسماعیلی دُعات اپنے تصانیف میں رقمطراز ہیں کہ انسان جسم و روح کا مجموعہ ہے۔ یعنی ایک حقیقت اس کی جسمانی مادی ظاہری ہے اور ایک روحانی باطنی غیر مادی ہے۔ اس طرح بالکل اسلام بھی ایک حقیقت ظاہری ہے یعنی احکام وضوابط اور ایک حقیقت باطنی ہے جو بمنزل روح ہے۔ ایک عبادت عملیہ ظاہرہ جو امور واحکام دین ظاہر میں فرضِ واجب کے اعمال پر مختصر ہے اور دوسری عبادت علمیہ جسکا تعلق علمِ باطن تأویلات اور حقائق ومعارف سے ہے۔ یہ دونوں عبادتیں ایک دوسرے سے مربوط وابستہ ہیں اور ایک دوسرے پر معتمد اور ہم آہنگ ہیں۔ لہذا دونوں کا ایک ساتھ عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ اگر کسی نے ظاہری عمل کو ترک کر کے محض باطن کا عقیدہ رکھا یا باطن کا علمی تصوّر چھوڑ کر فقط ظاہر کا عقیدہ رکھا تو وہ کافر ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو کچھ بھی مذکورہ آیتیں ہیں جس کے ظاہری معانی کی عام لوگ معرفت رکھتے ہیں مگر دین کے فرائض کی اسماعیلیوں کے یہاں ایک مفصل باطنی تأویل موجود ہے جس کو ائمہ الطاہرین علیہم السلام دعاۃ کرام ھداۃ عظام رض کے سوائے کوئی نہیں جانتا۔

بعض مفسّرین ومؤرخین جو قرآن وشریعت کے ظاہری معنی کے قائل ہیں اُن کا یہ خیال ہے کہ تأویلی معنی مجاز ہوتے ہیں اور اصلاً وعقلاً ونقلاً معنی وھی قبول ہوتے ہیں جو لفظ اپنے آپ ظاہری پہلو ادا کرتا ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ باطنی معنی بطور مجاز کے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بات خلاف فہم وادراک ہے۔ اصل اور حقیقی علم، علم باطن ہی ہوتا ہے ظاہری علم تو بطور تقدیم وتفہیم کے ذرائع بنتے ہیں کیونکہ مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ باطنی حقیقت مثال روح کی ہوتی ہے اور یہ مسلم الثبوت وبعید از قیاس حقیقت ہے کہ مجموعۂ اعضاء انسان میں روح لن ترانی ہے۔ وہ حقیقت ہے کہ جس کے سبب جسم متحرک ہوتا ہے۔ اگر وہ نہیں تو جسم کچھ فائدہ کا نہیں۔ روح کی بقاء دوامی ہے جسم فانی ہے اور فانی چیز مجاز ہوتی ہے پس حقیقی ہم، ہم تأویل وحقیقت ہے۔ مثال کے طور پر جو کتاب یہاں زیر مطالعہ ہے

اس میں اور دوسری اسماعیلی تأویلی کتابوں میں صریحاً اس بات کی شروع ہی میں وضاحت ملتی ہے کہ پانی علم پر مشل ہے۔ تو یہاں حقیقی پانی، علم ہی ہوگا۔ کیونکہ پانی میں جو اوصاف وکیفیت پنہاں ہے وہ گندگی وغلاظت کو پاک کرنا ہے یعنی جسمانی ظاہری پاکیزگی۔ اُسی طرح علم نفسانی اور روحانی صفائی کا کفیل ہے۔ پانی میں قدرت نے یہ اوصاف پیدا کئے ہیں کہ وہ علم پر دلالت کرے۔ پس جس طرح علم نفس کی تسکین وصفائی کا ضامن ہے اسی طرح پانی جسم کی بقاء وطہارت کا کفیل قرار پایا ہے۔

اسماعیلیوں کی تأویل وحقائق کی کتابیں آہستہ آہستہ شائع ہوکر منظر عام پر آگئی ہیں۔ بعض تنقید نگاروں کا یہ خیال ہے کہ اب اسماعیلی فرقے کی تأویل وحقیقت کا راز آشکار ہوگیا ہے اور باطنی تصور ظاہر ہوگیا ہے۔ ایسے طنز وتنقید کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں جبکہ قرآن مجید کی مثل جامع الحقائق بلکہ اصل الحقائق صحیفہ جس میں اسرار خفیہ بھرے پڑے ہیں منظر عام پر موجود ہے لیکن اس کے غوامض ودقائق تو ذی فہم اور اولوالالباب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ارشاد رب تعالی ہے کہ انا نحن نزلنا الذکر وانالہ لحفظون معنی: ہمیں نے قرآن نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے حافظ ہیں۔ اسماعیلی کتابیں چونکہ زیور طباعت سے مزیّن ہوئی ہیں تو کوئی فکر کی بات نہیں ہے کیونکہ علم حقائق کی گہرائی اسقدر ہے کہ اُسے بحرِ عمیق کہا گیا ہے اور یہ ہر کس وناکس کے فہم وادراک سے بَری ہے۔ اور بہت ہی شاذ وقلیل لوگ اس کی تہہ تک پہنچ سکتے ہیں، یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں کہ جس نے اُٹھالیا اور عالم ہوگیا چنانچہ نااہلیت کہ وجہ سے اکثر ناشروں، مباحثوں اور مؤرخوں نے اس کے مطالب ومقاصد بیان کرنے میں یا سمجھنے میں تخبط کیا ہے اور بعض متعصب عالموں نے تو ان کی توحید خالص کو اپنی عدم واقفیت کے باعث کفر سے تعبیر کردیا ہے اور اسماعیلیوں کے جانب بغض وعناد کا اظہار کیا ہے۔

کمستمرّ الماء من فرط سقم وھو الالیم لیس بالمآء الم

فرط مرض کے باعث مریض پانی کو تلخ سمجھتا ہے حالانکہ مرض، علت خودی میں ہے پانی میں نہیں۔

اساس التأویل کی روشنی میں ۔ اسماعیلیوں میں حصول علم کا مفہوم

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ظاہری علم یعنی نحو۔ منطق فلسفہ وغیرہ سیکھ لینے سے کسی مشہور ومعروف جامعہ یا کلیہ یا یونیورسیٹی یا دارُ العلوم سے بی۔اے، ایم۔اے، پی ایچ ڈی، منشی فاضل، عالم کامل، الفقیہ الجید، مولوی فاضل وغیرہ وغیرہ سندات۔ ''ڈپلومے'' ڈگریاں حاصل کرلینے سے وہ عالم بن جاتا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ سراسر بھاری مغالطہ اور خام خیالی ہے۔ ڈگریوں کے حصول سے ایک طالب علم علمِ حقیقی کبھی بھی حاصل نہیں کرتا۔ بلکہ وہ صرف علومِ ابتدائیہ یا خادمہ جیسے نحو، بلاغت، علم عروض، فقہ منطق، خطابت فلسفہ جو حقیقی علوم ومعارف کا ذریعہ اور مقدّمہ ہوتے ہیں اُسے ہی حاصل کرتا ہے۔ یہ عمل وطریقۂ نصاب بالکل ویسا ہے جیسے ایک اسکولی بچہ کو کسی قسم کا پیشہ سکھانے سے پہلے اُس فن کے ماہیات، اصول، ابتدائی قوائد، مبادیات سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ اس تعلیم واصول کو استعمال کر کے پنے تجربے سے وہ اپنے فن میں کامل ہو جائے۔ جیسا کہ ایک لوہار یا نجار۔ علوم خادمہ ستعملہ یعنی صَرف ونحو، منطق ومعانی، خطابہ وفلسفہ، عروض وقوانی وغیرہ سب مبادیات کا رجہ رکھتے ہیں اور طالب علم کو حقیقی علم سیکھنے پر آمادہ کرتے ہیں ذوق شوق پیدا کرتے ہیں اور ہی علوم دراصل علم کے دروازے کی کلید ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ایم اے، پی ایچ ی، بی ایڈ کے نوجوان اِن علومِ مبادیات کو حاصل کرلینے کے بعد خود کو بڑا عالم سمجھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ جو علم انہوں نے حاصل کیا ہے وہ بحرِ زخّار کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے۔ راصل وہ لوگ تو اِس قابل ہوتے ہیں کہ حقیقی علم حاصل کرسکیں۔ وہ علم تک پہنچتے ہی نہیں س کا مآخذ وسرچشمہ قرآن مجید کے مبادبات ہیں اور اسی کو ہی علمِ حقیقی سمجھ کر بے دینی اور لحاد وزندقت کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں۔ نتیجۂ یہ طالبِ علم توحید کی حقیقت اور دین کی صحیح معرفت کے جوہر سے محروم رہ جاتے ہیں۔

لہٰذا اس سے یہ خلاصہ نکلتا ہے کہ اگر ظاہری شریعت اور علم نہ ہو تو علم حقیقی اور باطنی اسرار تک پہنچنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور جب اس کا ثبوت قرآن کریم سے ہوتا

ہے تو اس میں انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی اور یہ بات بھی صاف صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوائے رسول اللہ ﷺ اور راسخوں فی علم سطح زمین پر موجود ہیں جو اسے جانتے ہیں اور سینہ بہ سینہ اس کو نقل کرتے رہتے ہیں۔ جب ان اغراض و اسرار کا علم اللہ تعالیٰ نے صرف اپنی ذات تک ہی محدود رکھا ہوتا اور کسی کو ان سے واقفیت ہی نہ ہوتی تو نزول قرآن کا عین مقصد ہی ادا، نہ ہوتا، حقائق ضائع ہو جاتے۔ بالآخر یہ کیسے ممین ہوسکتا ہے کہ قرآن میں تأویل کے وجود کا تو خدا ذکر کرے لیکن اس نے یہ علم سے اپنے انبیاء کرام کو ہی محروم رکھا ہو اور علم تأویل جب کسی کو بتایا ہی نہیں گیا تو قرآن میں اس کا ذکر کرنے سے کیا حاصل؟ پس معلوم ہوا کہ علم تأویل سے خداوند کریم نے راسخون فی العلم کو یقیناً واضح کیا ہے اور یہ لوگ بجز انبیاء اوصیاء اور ائمہ علیھم السلام کے اور کوئی نہیں۔ بناء برین مذکورۃ بالا آیت میں الا اللہ پر وقف کرنا کسی طرح درست نہیں ہوسکتا۔ بیشک فرقۂ اسماعیلیہ نے فن تأویل کو پروان چڑھایا، ترقی بخشی اس لئے کہ یہ شریعتِ اسلامیہ کا ایک جزء لاینفک ہے۔

موجودہ نسخے کی اہمیت

سیدنا القاضی النعمان رضوان اللہ علیہ نے اول اول ظاہری شریعت کے اعمال وارکان پر مختصر کتاب بنام دعائم الاسلام تصنیف فرمائی جس میں پہلا باب باب الولایۃ ہے۔ اس کے بعد کتاب اساس التأویل ان کی اہم تصنیف ہے جس میں ارباب الولایۃ اولیاء اللہ علیھم السلام کی ولایت کو واضح کرنے کے خاطر آدم صفی اللہؑ سے لے کر خاتم الانبیاء علیھم السلام کے قصص کی بتدریج وتفصیل تأویل کی گئی ہے اور امامت اور خلافت اللہ کے سلسلہ کو ایک اہم رکن اسلام ثابت کیا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دعائم الاسلام کے باب الولایۃ کے اسرار ومعانی اور رمز وبیانی کی مفصل توضیحات وتشریحات ہے جس میں شریعت کے اصول کے بواطن کے اشارات وعلامات بھی موجود ومرقوم ہیں۔ بجز اس کے قصۂ ادریس، صالح، لوط، داؤد، سلیمان، یونس، زکریا، یحییٰ، مریم، عیسیٰ علیھم السلام بھی شامل ہیں۔ موجودہ نسخہ کے متن کو مختصراً پیش نظر رکھتے ہوئے قارئین کرام کی پیش خدمت قصوں کی تأویل کی چند چندہ

مثالیں پیش کرتا ہوں تا کہ اسماعیلیوں کی طرز تعبیر ظاہر ہو سکیں اور علم حقیقی کے عجائبات وغرائبات آشکار ہو سکیں۔

اس کتاب میں موصوف مصنف فاطمی عقیدے کے خواص ولُبّ ومغز کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ محض قرآن کا وجود کافی نہیں ہے بلکہ قرآن کا قرین یعنی اولوا الامر یا صاحب الزمان کا ہر زمان میں وجود بے حد ضروری ہے، جو قرآن کریم، یعنی اللہ تعالیٰ کی صامت وساکت کتاب کو گویائی بخشتے ہیں اور اس کا صحیح مفہوم ومطلب سمجھا سکتے ہیں۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی حیات پاک میں قرآن کے صحیح مفاہیم ومعانی سمجھانے کے لئے خود رسول اللہ ﷺ کی ضرورت تھی اور لوگ بار غبت ایسے تمام معلومات دریافت کر لیتے تھے تو آپ کے بعد صامت یعنی بے زبان قرآن بذات خود ہمارے لئے کیسے بول سکتا ہے جو تمام سوالات کے جوابات دینے کے لئے کافی ہو؟ دوسرے لفظوں میں ہر دور میں اور ہر زمان رسول اللہ ﷺ کے مقام میں ایک مُرشِد کا وجود ہونا لازمی اور ضروری ہے۔

آگے چل کر فاضل مصنف رقمطراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی ہدایت کے لئے متعدد آیتوں میں مثالیں پیش کیں ہیں جو بظاہر عقل سلیم اُس کی عین ظاہری حقیقت کے وجود کو تسلیم نہیں کرتیں اور وہ محتاج تأویل ہیں۔ آپ کثرت اور قلت پر زور دیتے ہوئے اپنا خیال شریف قرآنی آیات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں کہ الّا الّذین امنوا وعملوا الصالحات وقلیلٌ ماھم واعرَضَ عنه اکثرھُم مگر جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بجالائیں اور تھوڑے اُن کے ساتھ تھے اور اکثر لوگوں نے منہ پھیر لیا۔ ولکن اکثر الناس لایعلمون لیکن ان میں سے بہت سے لوگ کو علم نہیں ہے۔ قلیلاً منھم المؤمنون واکثرھم الفاسقون ان میں تھوڑے ہی ایمان دار لوگ ہیں اور بہت سے بدعمل ہیں۔ وما اکثر الناس ولو حَرَصْتَ بمؤمنین اور اکثر لوگ نہیں ہے ایمان لانے والے اگرچہ تم کتنا بھی چاہو مناؤ۔ موصوف مصنف نے اس کتاب میں حُسنِ ترتیب اور نظم ونسق کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت خوبصورتی سے قرآنی آیات کی تفسیر کے ساتھ ساتھ عقلی نقلی دلیلیں اور احادیث نبوی کو بطور ثبوت پیش کیا ہے اور جابجا عربی زبان کے الفاظ کے معنی کی نزاکت اور وسعت

کو سمجھا کر قارئین کرام کے ذہن میں تسلسل عبارت و بیان کو قائم رکھا ہے تا کہ ہر چند تمام موضوعات ونکاتِ تشریحات مدّ نگاہ رہ جائے۔ کتاب کے مقدمہ میں فاضل مصنف صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے دعوتِ حق کے اعتقاد رکھنے والے اور حبل اللہ المتین کو اعتصام کرنے والے مستجیب کے لئے شریعت کے ظاہری احکام وارکان کی پابندی کے عمل پیرو ہونے کے لئے دعائم الاسلام کتاب پیش تعمیل ومطالعہ رکھی۔ طریقِ حق کے سالکین اور عروۃُ الوثقیٰ کے متمسکین کے واسطے اس میں ہم نے ایمان کے حدودِ عالیہ بیان فرمائے اور ایمان واسلام کے مابین اصول وفروع کو عیاناً وجہاراً واضح کر دیئے تا کہ قارئین اُس میں تفریق وانفرادیہ کر سکے اور ولایۃ اولی الامر کو مدلّل براہین پیش کر کے ثابت کر دیا۔ حلال وحرام قضایا اور احکام کو علیحدہ علیحدہ ابواب پر مشتمل کر دیا تا کہ اہل اسلام پر جو تکلّفاتِ شریعت واجب ہے اور جس کو ترک کرنا اور عمل میں کوتاہی برتنا منع ہے اس کی تاکید بھی کر دی تا کہ متعلّم کو حد کی شناخت ہو سکے اور پوری سمجھ بوجھ کے ساتھ ادائیگی کی تکمیل ہو سکے۔

سبب تألیف کتاب

سیدنا القاضی النعمانؒ اس کتاب کی تألیف کا مقصد خاص عیاں کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ جیسے ماں اپنے بیٹے کو دو برَس تمام رضاعت کی شرعی خدمت انجام دیتی ہے اور یہ غذا بچہ کی ابتدائی جسمانی نشو ونما کے لئے مکمل ترین ہوتی ہے ویسے ہی ہم نے اس کتاب سے متعدد ابتدائی علوم ظاہری کی کتابیں تصنیف فرمائیں اور بعد میں الرِّضاع فی الباطن۔ اساس التأویل، تأویل دعائم الاسلام، کتاب معرفت الحدود جیسی بلند پایہ اور تأویل کی حجت وبراھین سے لبریز کئیں اہم کتابیں پیش خدمت رکھیں جس میں افہام وتفہیم سے ظاھرًا اور رموز واشارات سے باطناً ہر چیز کہدی تا کہ مستفید ہمارے علوم ومعارف کے منابع ومصادلہ سے استفادہ لے سکے اور عقل وعلم کے درجات میں ترقی پذیر ہو۔ اس کے بعد مندرجۂ ذیل سطور میں موصوف مصنف تأویلی وجوہات کا سلسلہ جو ۱۷ ابواب پر مشتمل ہے اور قرآنی قصوں پر منحصر ہے ابتداء کرتے ہیں چونکہ جیسے میں آگے بتا چکا ہوں یہ

کتاب دعائم الاسلام کی تصنیف کے باب الولایۃ کی اضافی تشریح اور تتمیم وضاحت ہے لہٰذا ہر باب اپنے آپ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے اور اواخر میں آپ امام زمانہ کی معرفت و وجوب اطاعت کو خوش اسلوبی سے ثابت کرتے ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ ایمان اسلام کو شریک کرتا ہے لیکن اسلام ایمان کو شریک نہیں کرتا۔ ہر مسلمان مؤمن نہیں لیکن ہر مؤمن مسلمان ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان مؤمن ہوئے بغیر مسلمان ہوتا ہے اور کہلاتا بھی ہے لیکن مسلمان ہوئے بغیر مؤمن کوئی حالت میں نہیں ہوسکتا۔ پہلے جز میں آپ کلمۃ الشہادت کے اصل وفروع کی تأویلی وجوہات بتاتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ کلمۂ شہادت لاالٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ میں اللہ کی شہادت کا کلمۃ درجۂ عالیہ کے لئے منسوب ہے جو اصلی ہے اور رسول اللہ علیہ وسلم کی شہادت کا کلمہ درجۂ دنیا کے لئے منسوب ہے جو فرعی ہے۔ اس کے ساتھ آپ سات اور بارہ کے عدد کی حیات انسان میں اہمیت، معرفت اور مثل وممثول پیش کر کے قرآنی آیت علیھا تسعۃ عشر کے معنی واضح کرتے ہیں جو کلمۂ شہادت میں مرموز ہیں۔

آپ نہایت خوبصورت انداز بیانی میں انبیاء علیھم السلام کے قصص ومراتب کو بیان فرماتے ہوئے قاری کو ان کے ظاہری اور باطنی حالاتِ زندگی سمجھنے میں دعوتِ فکر دیتے ہیں اور ظاہری معنی قلمبند کرنے پر اگر قصۂ قاری کے فہم وادراک سے خارج ہوتا ہے تو باطنی معنی کی جانب رُجوع فرماتے ہیں۔ اگر تمام قصوں کے اقتباسات میں یہاں جمع کروں تو مجھے یہ ڈر ہے کہ مضمون کہیں کتابی شکل اختیار نہ کرلے لہٰذا مآخذ پر ہی احتیاط سے کام لے کر چند ضروری مختصر مثالیں دے کر میں نے اکتفاء کیا ہے تا کہ قاری کی دلچسپی بنی رہے۔

قصۂ آدمؑ کی تأویل کی ذکر میں آپ فرماتے ہیں کہ آدمؑ حدّ سفلی کی امامت کی اصل ہے۔ اللہ جلّ شانہ نے آدمؑ کو گیلی مٹی (طین) سے پیدا کیا باطن میں مٹی علم ظاہر ہے جو کثیف اور جسمانی ہوتا ہے اور ملٰئیکہ کو علمِ لطیف باطنی سے پیدا کیا جو روحانی ہے۔ علم لطیف اپنے اصلی مادے سے مل جاتا ہے اور علم کثیف تعلیم کے بغیر نہیں ملتا۔ جسمِ آدمؑ تخلیق کے بعد پڑا رہا اور پھر اُس میں روح پھونکی گئی یعنی علم باطنی روحانی کی تعلیم بخشی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے

تمام نام آدمؑ کو سکھائے یعنی نوع بشر کو ہر چیز کے نام سیکھنے جاننے کی حاجت ہوتی ہے وہ تمام اللہ تعالیٰ نے سکھائے، ابلیس کا نام ابلیس اس وجہ سے پڑا کیونکہ وہ آدمؑ کے علم کے سامنے مایوس ہوگیا اور اپنی جہالت پر تأسف کرنے لگا۔ ابلیس لغتِ عربی کے نحو کے مطابق افعیل کے وزن پر ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے اَبلَسَ الرَجلُ اِذا اِنقطع ولم یکُن حُجۃ ۔ مرد نا امید و مایوس ہوگیا جب کوئی دلیل برہان اُس کے پاس باقی نہیں رہی۔ ابلیس میں خشوع اور حزن وملال کے خلاف تمام صفات پائی جاتی ہیں جیسے ارشاد ربانی ہے کہ ویوم تقوم الساعة یبلس المجرمون اور جس دن قیامت برپا ہوگی ناامید رہ جائیں گے گنہگار۔ آپ فرماتے ہیں کہ آدمؑ دورِ ستر کے ناطق اول ہے۔ آپ کے پہلے وَصی حضرت ھابیلؑ اور اُن کے قتل کے بعد حضرت شیثؑ ہے۔ آپ میں روح کا پھونکا جانا یعنی آپ کی تعلیم جس سے نفس کا وجود باقی رہتا ہے۔ فرشتے دعوت کے حج وارکان تعبیر ہوتے ہیں لہٰذا جیسے بالا مذکورۃ بیان میں واضح ہے کہ ملائیکہ کا سجدۃ بجالانا اور ابلیس کا انکار کرنے کا مطلب ارکان دعوت کا حضرت آدمؑ کے علم کی معرفت کے بعد خضوع کرنا اور ابلیس کا تکبّر کرنا اور انکار کرنا ہے۔

قصۂ نوحؑ میں آپ فرماتے ہیں کہ آپ کا نام عبد الغفار ہے آپ کے مقیم ھودؑ ہے۔ آپ کے وَصی سامؑ ہیں اور آپ کا دشمن راسب بن عوج بن عناق ہے۔ آپ نے سفینہ بنایا یعنی آپ نے آپ کے اساس یعنی وصی کی دعوت قائم کی۔ اللہ تعالیٰ کے امر سے باطن میں بھی دعوت قائم کی اور حدود مقرر فرمائے۔ سفینہ پانی پر جاری ہوا یعنی آپ نے دعوت حق کی بنیاد علم پر رکھی اور مؤمنین کو جھالت اور کِذب سے بچایا۔ سفینہ دعوت حق ہے کیونکہ کسی نے بھی اسے چھوڑ کر پانی میں جانے کی کوشش کی تو وہ ڈوب گیا یعنی کہ نااہل لوگوں سے حُصولِ علم کیا تو وہ گمراہی میں ہلاک ہوگیا۔ بعد میں آپ سفینہ یعنی کشتی میں لکڑی، لوھا، رَسّی، کھمبے اور دوسری اشیاء جو کشتی کی ساخت وصناعت میں مستعمل ہوتے ہیں اس کا ذکر کرکے تأویل پیش کرتے ہیں۔ وفار التنور کی ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ تنور کا اُبلنا وہ ہے تأویل کا شائع ہونا اور اساس کا اپنے تأویلی علم کو ظاہر کرنا۔ زمین کا پانی کو جذب کرنے کا مطلب ہے اساس کا علم باطن کو غیر مستحق سے چھپانا۔ آسمان کے تھم جانے کی

تأ ویل ہے ناطق کا اساس قائم کرنے کے بعد باطن سے قطع تعلق کر لینا اور ظاہر کی طرف متوجہ ہونا ہے۔

چوتھے باب میں حضرت ابراھیمؑ خلیل اللہ کے قصے میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے مقیم صالحؑ ہیں اور پہلے وصی اسمٰعیل ذبیح اللہ ہیں اور انکے انتقال کے بعد قیداز آپ کے بیٹے امام مستقر قائم ہوئے، ابراھیمؑ کے دوسرے وصی اسحاقؑ ہیں۔ آپ کا آگ میں ڈالا جانا اور آگ کا آپ پر کوئی اثر نہ ہونے کا مطلب ہے کہ آپ کے متعلق دشمنوں کا حاکم زمانہ کے پاس چغلی کھانا اور چغل خوری کا حاکم زمانہ کے دل پر کوئی اثر نہ ہونا ہے۔ آپ کا تارے چاند اور سورج کو دیکھنے کی تأ ویل یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ کا داعی حجۃ اور امام الزمان سے متصل ہو کر علم باطن سیکھنا۔ آپ کے باپ آزر کا اِشارہ اہل ظاہر کے رئیس کا ہے جن سے آپ نے ظاہری علم کی تحصیل کی۔ بیت اللہ کی تعمیر کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کے اساس حضرت اسماعیلؑ کی طرف ہے۔ بیت اللہ کے قواعد یعنی چار رُکن کی تأ ویل پہلے دو حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ جو حضرت اسحاقؑ وصی کی نسل سے ہیں اور دوسرے دو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور قائم القیامتؑ جو اسماعیلؑ کی نسل سے ہیں۔ بیت اللہ کے دروازہ کا رمزے تأ ویل میں اسماعیلؑ ذبیح کی جانب ہے اور بیت اللہ کے بار دروازے سے بارہ نقباء کا مطلب نکالا جاتا ہے۔

قصہ ٔ موسیٰؑ کلیم اللہ کی تأ ویل کرتے ہوئے آپ رقمطراز ہیں کہ موسیٰؑ کے مقیم حضرت اُدّ تھے، ھارونؑ آپ کے وصی تھے اور آپ کا دشمن فرعون بدفعال تھا۔ فرعون نے بچوں کو قتل کیا اور عورتوں کو زندہ چھوڑا۔ اس کی تأ ویل یہ ہے کہ فرعون نے مستجیب طالب علم کو قتل کیا اور داعیوں کو باقی رکھا جو اس کی طرف دعوت کرتے اور اس کی مدد کرتے۔ اُمِّ موسیٰ سے بھی یہاں مواد داعی کی ہے جس نے آپ کو دودھ پلایا یعنی کہ مذہبی تعلیم دی۔ اُمِّ موسیٰ کے علاوہ جتنیں بھی عورتیں آئیں وہ رضاعت کے کار کو انجام نہ دے سکیں یعنی اللہ تعالیٰ جس کو نبی کی تائید کے لئے مقرر رماتا ہے وہی علم کو پہنچانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آپ کا فرعون کے گھر میں پرورش پانے کا مطلب ہے آپ کا ظاہر میں امامِ باطل کی طرف اور باطن میں

امامِ حق کی دعوت کرنا ہے۔ موسیٰ کی عصا یعنی لاٹھی کا مطلب آپ کے امامت کی حد یعنی تأویلِ حقیقی کی ہے۔ فرعون علماء اہلِ ظاہر میں سے تھا اور تأویلِ اشیاء سے بہت کم واقف تھا لیکن اسے اس بات کا دعویٰ تھا کہ وہ اُس علمِ باطن سے بھی واقف ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو فرعون کے دربار میں ساحروں کو جمع کر کے موسیٰ سے مقابلہ کا واقعہ بیان ہوا ہے اس کا باطنی مفہوم یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ علماء ظاہر تھے جو رسّیاں اور لاٹھیاں لے کر آئے تھے یعنی وہ آپ کے دشمن تھے اور کلام ظاہری اُن کی طرف منظوم تھا۔ فرعون کا یہ دعویٰ کہ انا ربکم الاعلیٰ معنی میں آپ کا بلند و بالا رب ہوں، کی تأویل یہ ہے کہ اُس نے اپنے اردگرد اپنے تابعین کو جمع کیا اور خود دعوت ظاہرۃ قائم کی اور اپنے کو حدِّ اعلیٰ شمار کرنے لگا جس کا اسے کوئی اختیار نہ تھا۔ فرعون اور اس کے اصحاب کا سمندر کے پانی میں غرق ہونے کی تأویل یہ بتائی گئی ہے کہ فرعون اور اس کی دعوت کا جواب دینے والے ظاہری علم کی موجودگی میں ڈوب گئے یعنی دلیلوں میں غرق ہو گئے۔ روحانی طور پر ہلاک ہو گئے۔ اہلِ دعوتِ حق کی حجت علی الاعلان قائم ہوئی ولن تجد لسنة الله تبديلا. ولن تجد لسنة الله تحويلا اللہ تعالیٰ کی سنت میں تم کبھی بھی تبدیل اور تحویل نہیں پاؤ گے۔

اسی طرح سیدنا القاضی النعمان قس، قصۂ عیسیٰ کی تأویل کے ضمن میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کے مقیم خزیمہ تھے۔ وصی شمعون الصفا تھے اور اُن کی پیدائش کے معنی ہیں باطنی دعوت کے ظاہری دعوت کے بغیر پیدا ہونے کے۔ عام طور پر دینی پیدائش امام اور حجت کی وساطت سے ہوتی ہے لیکن عیسیٰ مستثنیٰ تھے۔ آپ کی پیدائش بغیر امام الزمان کے صرف مولاتنا مریم سے ہوئی۔ اسی وجہ سے آپ ابن مریم کہلاتے ہیں۔ ولادت سے پہلے مریم کا کسی بشر کو نہ چھونے سے مراد ہے مریم کو امام الزمان کی اجازت نہ ملنا۔ عیسیٰ کا گہوارے میں بات کرنے کا تأویلی مفہوم ہے آپ کا تربیت کے زمانے میں حدود مفاتحہ کو پہنچنے سے پہلے بالغ مرد کی طرح گفتگو کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو اندھوں کی بینائی دینے، مبروص کو شفاء بخشنے، اور مُردوں کو زندہ کرنے کے تین معاجز سے خاص فرمائے جن کا یکے بعد دیگرے مطلبِ تأویلی ہے کہ آپ کا نورِ بصیرت بخشا جو دل کا اندھا ہو، آپ

کا اُس آدمی کے شک کو دور کرنا جو شک وشبہات میں غلطاں ہو اور آپ کا کافروں کو مؤمن بنا کر حقیقی علمی زندگی عطا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو مسیح کہا ہے۔ آپ ظاہر اور باطن دونوں معنی میں مسیح تھے اور لغت میں مسیح کی معنی ہیں کسی شئی کو محو کر دینا مٹا دینا چھو کر یا مَل کر۔ جیسے مریض کے لئے کہا جاتا ہے مَسَحَ اللّٰهُ ضُرَّكَ اللہ تعالیٰ تیرا مرض دور کرے۔ اسی طرح مسیح عیسیٰؑ نے ہر اُس شخص کا جس نے اُن کی دعوت کا جواب دیا، اُن کے دین کا مرض دور کیا جو دین میں ظاہر کے امر کو مخلوط کرنے سے پیدا ہو گیا تھا اور اسی لئے آپ کو مسیح کہا گیا۔ اور آگے القاضی النعمانؒ مذکور کتاب میں قرآن میں بیان شدہ معاجز عیسیٰؑ کی بھی تأویل فرماتے ہیں۔ آپ سے ایک معجزہ منسوب ہے کہ آپ مٹی سے پرندے کی شکل کا طیر بنا کر روح پھونک کر جان ڈالتے تھے یعنی عیسیٰؑ مؤمنین مستجیبین میں سے اپنی قوم کے لئے اپنا حد مقرر کرتے تھے۔ مٹی کے باطنی معنی مؤمن کے ہوتے ہیں اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ابوتراب نام سے نوازا تھا یعنی مؤمنین کے والد اور اِمام برحق۔ قرآن حکیم فرقان مجید انبیاء کرامؑ کے جتنے معاجز اور قصص کی تأویل سیدنا القاضی النعمانؒ نے بیان فرمائی ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نکالا نہیں جا سکتا کہ اسماعیلی فاطمی ائمہ اور ان کے دُعات بلاغ صرف قصوں کی تأویل میں ہی اعتقاد رکھتے تھے۔ دراصل اس معاملے میں ان کا عقیدہ وہی ہے جو ایک عام مسلمان کا ظاہری معجزوں کا ہے۔ موصوف مصنف نے اپنے دوسری ظاہری علوم واخبار کی کتابوں میں متعدد و بیشمار معجزات نقل کئے ہیں جس کی کوئی تأویل بیان نہیں کی گئی۔ لیکن سطور بالا میں خاکسار نے جو مثالیں پیش کیں ہیں اُس سے یہی مؤاخذہ لیا جا سکتا ہے کہ اسماعیلیوں اور فاطمیوں کے یہاں تأویلی بیان سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ خاص طور پر دو باتوں پر زور دیتے ہیں ایک حصول علم پر اور دوسرا حدود ومراتب میں تدریجاً اِرتقاع کے تصور پر۔ جہاں علم پر زور دینے سے امام اور اُن کے قائم کردہ اسماعیلی دعوت کے حدود کی اطاعت، اِتّباع اور پیروی میں مدد ملتی ہے۔ اسی ایک واحد سبب اور اَحسن وجہ ہے کہ مصر میں فاطمی حکومت وسلطنت کے زوال اور ۲۱ ویں امام فاطمی الامام الطیب کے ۵۲۸ھ میں

استتار ہونے کے بعد بھی فاطمی دعوت کی سرگرمیاں یمن میں محفوظ رہیں اور امام کی امامت کا سلسلہ باطناً ستر میں جاری رہا جو روز قیامت تک جاری رہیگا۔ ظاھراً اور عیاناً استتار کے وقت دعات مطلقین نے فاطمی اسماعیلی دعوت کا ڈھانچہ اور شیرازہ سنبھالے رکھا اور آج بھی اہل بواہر میں یہ سلسلہ موجود ہے۔ الامام الطیبؑ ۲۱ ویں امام کے استتار کے بعد اسماعیلی لوگ اپنے کو مستعلوی طیبی بھی کہنے لگے اور ۵۳۲ھ ان کے یہاں دُعات مطلقین کا سلسلہ شروع ہوا جو یمن میں ۹۴۶ھ تک جاری رہا۔ اس کے بعد مستعلوی طیبی اسماعیلی جماعت جو ہند میں اہل البواہر سے مشہور تھی تین بواہر کے فرقوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس مضمون کا کاتب خاکسار علوی بوھرۃ جماعت کا فرد ہے اور میرے والد ماجد الداعی المطلق سیدنا طیب ضیاء الدین صاحب ط ع ش اس جماعت کے سلسلۃ الدُعات کے ۴۴ داعی وہادی ہیں اور فی الحال بڑودہ گجرات میں مقیم ہیں جہاں ان کی دعوت ہادیہ کا مرکز موجود ہے۔

مراجع ومصادر

سیدنا القاضی النعمان بن محمد قس

(۱) دعائم الاسلام الجلد الاول عربی۔ طبع دار المعارف مصر۔ تحقیق۔ علی اضعر أصف فیضی

(۲) شرح الاخبار۔ تقدیمِ محقق۔ طبع بیروت عربی

(۳) المجالس والمسائرات۔ طبع بیروت عربی

(۴) تأویل الدعائم۔ تحقیق محمد حسن الاعظمی۔ دار المعارف مصر

(۵) الرضاع فی الباطن۔ سیدنا جعفر بن منصور الیمن قس۔ مخطوطہ۔ دعوت ھادیة

(۶) رسالات اثبات التأویل والحقیقت۔ الشیخ احمد علی راج۔ اودیپور۔ اُردو

(٧) فاطمی اکابر ۔ ملا یونس شکیب مبارکپوری ۔ ادبیات فاطمی ۔ سورت، اُردو

(٨) دعائم الاسلام ۔ الجلد الاول ۔ اُردو ترجمة ۔ تقدیم مترجم ملا یونس شکیب مبارکپوری۔اُردو

(٩) ہمارا اسماعیلی مذہب اُس کی حقیقت اور نظام ۔ ڈاکٹر زاھد علی ۔ حیدرآبادی ۔ عثمانیۃ جامعۃ

(١٠) اسماعیلی عقائد پر ایک نظر ۔ اصغر علی انجینئر ۔ بمبئی ۔ I.I.S. اُردو

(١١) دامع البهتان ۔ الشیخ حسن علی سارنگپور والا۔ الجامعة السیفیة۔ سورت۔ اُردو

(١٢) A Bio bibliography of Ismaili Literature. Prof. Ismail K. Poonawala, California.

(١٣) A Reconsideration of Qadi Noman's Madhhab. Prof. I.K. Poonawalla, Essay presented by Limin BSOS.

(١٤) An Ismaili Tawil of Holy Quran - Prof. I.K. Poonawalla. an Essay.

(١٥) الاختلاف فی اصول المذاهب تحقیق وتقدیم شمعون لوکهنڈوالا۔ شملا انسٹی ٹیوٹ آف اسلامك اسٹیز.

۱۵

حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی

مناقب برہانی کی روشنی میں

-جناب عبداللہ قادری صدیقی

(سجادہ نشین ۔ حضرت شیخ منتخب قادری، بیجاپور)

کہا جاتا ہے کہ گجرات میں اسلام کی اشاعت صرف بزرگانِ دین کے قدم میمنت سے ہوئی۔ اسلامی حکومت قائم ہونے سے قبل اس سرزمین پر مشائخین کے مشہور سلاسل مثلاً چشتیہ، قادریہ، نقش بندیہ، رفاعیہ اور سہروردیہ کے بزرگ تشریف لائے اور اپنے رشد وہدایت کے سلسلے قائم کرنے میں لگ گئے۔

خصوصاً گجرات کے مشہور سلسلۂ سہروردیہ (۲) کے مشائخین میں حضرت شیخ احمد نہروالی (۳) حضرت سید شرف الدین مشہدی بھروچی (۴) قطب الاقطاب حضرت سید برھان الدین عبداللہ قطب عالم بخاری احمد آبادی (۵) حضرت سید محمد سراج الدین شاہ عالم بن قطب عالم بخاری احمد آبادی (۶) حضرت تاج الدین صوی نہروالی (۷) حضرت سید محمد اساولی (۸) حضرت داؤد اساولی (۹) حضرت شیخ الہداد احمد آبادی (۱۰) حضرت سید یحییٰ بن ترمزی بڑودوی (۱۱) حضرت قاضی علم الدین شاطبی نہروالی (۱۲) حضرت محمد خدا بخش نہروالی (۱۳) حضرت سید احمد جہاں شہ نہروالی (۱۴) حضرت شیخ سید عثمان زیدی المعروف شمع برھانی احمد آبادی (۱۵) حضرت شیخ عبد الطیف نہروالی (۱۶) اور حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادی (۱۷) قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ کبار

گجرات ہیں جن کے فیض انوار سے اب تک گجرات مستفیض ہو رہا ہے۔

قطب لا قطاب حضرت سید برھان الدین قطب عالم بخاری احمد آبادی (۲۱) (المتوفی ۸۵۸ھ) کے مرید وخلیفہ حضرت شیخ شاہ علی خطیب صدیقی احمد آبادی (۱۸) جو خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ہیں (۲۰) اور سلطان احمد شاہ اول گجراتی ۸۱۳ھ تا ۸۴۵ھ (۲۳) کے عہد کے جلیل القدر صوفی بزرگ ہیں (۲۴)

مناقب برہانی میں حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادی کا ذکر اور نسب نامہ:

مناقب برہانی میں (۱۳) حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادی (۱۴) کے سلسلۂ نسب کے بارے میں مؤلف سید عبدالرحمٰن المعروف شاہ بڈہ لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ علی خطیب بہ "خطیب العرش" شیخ سیدنا (۱۵) ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۱۶) کی اولاد میں سے ہیں (۱۷)

تذکرۃ الانساب (۱۸) کے مطابق دکن کے شہر بیجاپور (۲۰) کے سلسلۂ قادریہ کے جلیل القدر بزرگ حضرت شیخ منتخب الدین قادری دھولقی (۱۹) ثم بیجاپوری کے جد امجد حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتی صدیقی ثم احمد آبادی (۲۱) کا سلسلۂ نسب درج ذیل ہے۔

حضرت شیخ علی خطیب گجراتی احمد آبادی بن (۲۳) عبدالرحمٰن بن (۲۴) شیخ علی بن (۲۵) شیخ عبداللہ صدیقی بن (۲۶) شیخ حسن محمد بن (۲۷) شیخ عبدالغفار صدیقی بن (۲۸) شیخ عثمان بن (۲۹) شیخ محمد (خلوتی) بن (۳۰) شیخ حضرت شہاب الدین سہروردی قدس اللہ اسرارھم (۳۱)۔

عوارف المعارف کے مترجم علامہ شمس بریلوی (۳۲) اپنے مقدمہ میں طبقات الشافعیہ (۳۳) کے حوالے سے حضرت شیخ علی خطیب گجراتی صدیقی احمد آبادی (۳۴) کے جد امجد حضرت شہاب الدین سہروردی صدیقی بغدادی (۳۵) کا نسب نامہ ذیل کے مطابق بیان کیا گیا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی (۳۶) بن محمد (۳۷) بن عبداللہ (۳۸) بن

محمد عمویہ(۳۹) بن عبد اللہ عمویہ(۴۰) بن سعد(۴۱) بن حسین(۴۲) بن قاسم(۴۳) بن سعد(۴۴) بن نصر(۴۵) بن عبد الرحمن(۴۶) بن قاسم(۴۷) بن محمد(۴۸) بن سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ(۴۹) خلیفہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعالیہ وسلم(۵۰)۔

صاحب نظام التواریخ(۱) کے بیان کے مطابق حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتی صدیقی احمد آبادی(۲) کے جد امجد حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ(۳) کا سلسلۂ نسب حضور اکرم حضرت محمد مصطفےٰ صلعم(۴) کے جد امجد مرہ بن کعب بن لوی بن غالب(۵) پر منتہا ہوتا ہے۔

نسب نامۂ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ(۶) بن قحافہ عثمان(۷) بن عامر(۸) بن کعب(۹) بن سعد(۱۰) بن شمیم (تمیم)(۱۱) بن مرہ(۱۲) بن کعب بن لوی بن غالب(۱۳) جد امجد حضرت محمد مصطفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعالیہ وسلم(۱۴)۔

حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی کا مجاہدہ:

مناقب برہانی(۱۵) کے بیان کے مطابق حضرت شیخ علی خطیب زاہد ومتقی تھے۔ بارہ سال کی عمر سے ہی عبادت وطاعت کا ایسا غلبہ چھایا ہوا تھا کہ لغو باتوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ اور زمین میں اگنے والے غلہ کو بطور غذا استعمال کرنا ترک کر دیا اور جنگل میں جو غذا کی طور پر دستیاب ہوتا اس پر اکتفا کرتے۔ افطار بھی اسی سے کرتے۔ اس طرح بارہ سال گذر گئے۔ اس کے بعد تصحیح باطن کا یہ حال ہوا کہ عالم ملکوت کے ملائکہ کی تسبیح وتہلیل اپنے ناسوتی جسم کے کانوں سے سنتے اور پانچوں وقت کی نماز دریای سابرمتی کے کنارے ادا فرماتے(۱۷)۔

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی کا ایک مجذوب سے استفادہ:

مناقب برہانی کے بیان کے مطابق(۱۸) حضرت شیخ شاہ علی خطیب بچپن ہی سے زاہد ومتقی تھے ایک مجذوب(۱۹) کی آپ کے یہاں آمد ورفت تھی۔ یہ مجذوب ہمیشہ کہتا

''شیخ علی مسلمان ہوجا''۔ شیخ علی خطیب اس مشورے کی تعبیر سے قاصر تھے۔ ہر مرتبہ اپنی عبادت وریاضت شاقہ میں اضافہ کردیتے۔ ایک مرتبہ مجذوب کسی بزرگ کی روح کے ایصال ثواب کے لیئے نیاز پکا کر تقسیم کررہا تھا۔ شیخ علی اپنے معمول کے مطابق اسی راستہ سے گذرے۔ جب مجذوب نے انھیں دیکھا تو شیخ علی کو پکڑ کر زمین پر پچھاڑ دیا اور سینے پر سوار ہوکر بیٹھ گیا۔ چند لقمے زبردستی ان کے منہ ڈالے۔ اس طرح مجذوب نے شیخ علی کے مصفا دل میں ارادت کا بیج بویا۔ شیخ کی پیٹھ پر زور سے دو چار گھونسے بھی مارے اور انھیں چھوڑ دیا۔ بعد میں کہا ''شیخ علی مسلمان ہوجاؤ'' شیخ اس عالم میں بے ہوش ہوگئے تھے۔ مگر جب ہوش آیا تو شیخ علی مسلمان ہوجاؤ کی تعبیر کو پاچکے تھے، مطلب یہ تھا کہ کسی سے ارادت اختیار کرو (۲۱)۔

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی کی حضرت شیخ احمد کھٹو سے ارادت کی خواہش:

مناقب برہانی کے بیان کے مطابق (۲۲) شیخ علی خطیب (۲۳) نے جب ارادت کا مصمم ارادہ کرلیا اس وقت مقتدائے زمانے (۲۴) دو ہستیاں تھیں ایک حضرت شیخ برھان الدین قطب عالم بخاری (۲۵) اور دوسرے قطب زماں شیخ احمد مغربی سرکھیجی (۲۶) شیخ علی خطیب سماع وسرور کے منکر تھے۔ اور حضرت قطب عالم بخاری کے یہاں مجلس سماع منعقد ہوا کرتی تھی۔ شیخ علی خطیب نے سوچا کہ سرکھیج جاکر حضرت شیخ احمد مغربی کی ارادت اختیار کی جائے (۲۷) کیونکہ آپ کے یہاں محفل سماع کا انعقاد نہیں ہوا کرتا تھا۔

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی پر حضرت قطب عالم بخاری کی باطنی توجہ:

حضرت شیخ علی خطیب (۲) بیل گاڑی پر سوار ہوکر قطب زماں حضرت شیخ احمد مغربی سرکھیجی (۳) سے ارادت کی خواہش میں سرکھیج (۴) کی جانب روانہ ہوئے۔ چلتے چلتے ایک دوراھے پر پہونچے جہاں سے ایک راستہ سرکھیج کی طرف تو دوسرا اساول کی جانب جاتا تھا جہاں پر حضرت قطب عالم بخاری کا قیام تھا (۷)۔ اس دوراھے پر بیل کھڑے ہوگئے۔ آپ نے بہت کوشش کی بیل آگے بڑھیں مگر بے سود (۸) اس حالت میں ایک ہاتھ غیب

سے نمودار ہوا شیخ کی گردن پر مارا اور ان کا گریباں پکڑ لیا۔ جس کی وجہ سے شیخ کے لباس پر شوربا آلود پانچ انگلیوں کے نشان پڑ گئے۔ حقیقت میں اس وقت حضرت قطب عالم بخاری کھانا تناول فرمارہے تھے۔ اور راستہ کے درمیان ہی سے شیخ علی خطیب کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ شیخ علی خطیب نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ کوئی میرا گریباں پیچھے سے کھینچ رہا ہے۔ بیلوں کو ان کی مرضی سے آگے بڑھنے دو۔ یہ بیل جہاں لیجائیں وہیں ہمارا نصیب ہے۔ قدرت الٰہی اور حضرت قطب بخاری (۹) کے فیضِ بے اِنتہا کے طفیل بیل سیدھے آنحضرت قطب عالم کی خانقاہ کی جانب روانہ ہوئے (۱۰) اس وقت آنحضرت کھانا تناول فرمارہے تھے (۱۱) اس میں تھوڑا بچا کر کپڑے میں باندھ لیا۔ اس وقت حضرت دوسن (۱۲) حضرت شیخ سراج المخاطب سراج العاشقین (۱۳) حضرت شیخ فرید (۱۴) اور شاہ شہباز (۱۵) ارادت کی غرض سے پہلے ہی سے تشریف فرما تھے۔ موخر الذکر کا مزار اقدس برھانپور میں زیارت گاہ خاص وعام ہے (۱۶)۔ حضرت شیخ علی خطیب کا حضرت قطب عالم بخاری کی خانقاہ پر حاضر ہونے سے قبل مرشد عالی نے ان حضرات سے فرمایا ''ذرا ٹھہر جاؤ آپ کے پیر و مرشد تشریف لارہے ہیں'' (۱۷)۔

حضرت شاہ علی خطیب احمد آبادی کے متعلق حضرت قطب عالم کا ارشاد گرامی:

مناقب برہانی میں ہے (۱۸) کہ حضرت شاہ علی خطیب احمد آبادی کو قطب عالم بخاری نے باطنی توجہ سے اپنی خدمت میں حاضر کیا۔ دور سے حضرت شیخ علی خطیب (۱۹) کی نظر مرشد عالی پر پڑی (۲۰) آپ نے دل میں فیصلہ کرلیا۔ پہلے خلافت بعد ارادت (۲۱)۔ شیخ علی خطیب پر حضرت قطب عالم بخاری کی عظمت مہابت آشکارا ہوتے ہی آپ نے قطب عالم بخاری کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا (۲۲)۔

قطب عالم بخاری کا ارشاد ہوا (۲۳) کہ کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا جائے۔ چراغ (۲۴) روغن (۲۵) فتیلہ (۲۶) تیار ہے۔ روشن (۲۷) کرنے پر موقوف ہے (۲۸)۔

مناقب برھانی (۱) کے بیان کے مطابق حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی (۲)

جب حضرت سیدنا برھان الدین قطب عالم (۴) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا بعد اپنی بعیت سے مشرف کیا(۵) اور کپڑے میں جو کھانا بچا کر رکھا تھا شیخ علی خطیب کو عنایت کرتے ہوئے فرمایا تناول فرمائیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیخ علی خطیب نے بارہ سال کے بعد پہلی مرتبہ گوشت اور لوگوں کے ہاتھوں اگایا ہوا اور پکایا(۶) ہوا (دھان) کھانا کھایا۔ ابھی چند ہی لقمے تناول فرمائے تھے کہ محبت(۷) وشوق(۸) وموات(۹) کا ایسا غلبہ ہوا کہ آپ بے اختیار رونے لگے اور اٹھ کر رقص کرنا شروع کردیا(۱۰) ۔ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ گوشہ میں پڑے ہوئے آلات سرور خود بخود بجنے لگے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق شیخ علی خطیب کی آمد کے وقت آستانۂ قطبیہ میں محفل سماع جاری تھی۔ شیخ پر سماع کا اثر جادو کی طرح چل گیا۔ قوالوں کو حکم ہوا کہ ''کچھ گائیں چونکہ اب شیخ علی خطیب بھی اہل سماع میں شامل ہوگیا ہے'' (۱۱) کچھ دیر تک رقص کرتے رہے اور قطب عالم (۱۲) حضرت شیخ علی خطیب کو اپنی نگاہ خاص (۱۳) سے نوازرہے تھے(۱۴)۔

حضرت سید عبد الرحمٰن المعروف شاہ بڈا مؤلف مناقب برہانی(۳۱) مرزا محمد ابراھیم زبیر بیجاپوری مؤلف روضۃ الاولیای بیجاپور(۳۲) مرزا لعل بیگ بدخشی مؤلف ثمرات القدس من شجرۃ الانس(۳۳) سکندر بن منجھو مؤلف تاریخ سکندری (۳۴)۔ حضرت شیخ محمد غوث شطاری مندوی مؤلف گلزار ابرار(۳۵) حضرت عبد الرحمٰن چشتی علوی مؤلف مراۃ الاسرار(۳۶) مرزا علی محمد خان مؤلف تاریخ مراۃ احمدی وضمیمہ(۳۷) میر شیر علی قانع تتوی مؤلف تاریخ تحفۃ الاکرام (تحفۃ اکرام)(۳۸) جیسے مستند تذکروں کے مؤلفین شیخ علی خطیب احمد آبادی(۳۹) کو قطب عالم بخاری کا مرید(۴۰) وخلیفہ(۴۱) بتاتے ہیں۔

۱۔ سلسلۂ قادریہ
۲۔ سلسلۂ سہروردیہ — یہ سلسلے الگ الگ لکھے گئے ہیں
۳۔ سلسلۂ چشتیہ — یہ چاروں سلسلے باقی ہیں۔
۴۔ سلسلۂ حسنیہ بخاری

حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی کی اپنے پیر ومرشد حضرت قطب عالم بخاری سے محبت:

حضرت شیخ علی المعروف خطیب العرش اعلی اللہ شانہٗ (۲۶) جب سے قطب عالم بخاری (۲۷) کے مرید ہوئے تب سے ان کے مرشد عالی کا حُلیہ مبارک (۲۸) ان کی نظروں سے (۲۹) ایک لمحہ کے لیئے بھی اوجھل نہیں ہوا (۳۰)۔ جس ہاتھ (۳۱) سے آپ نے ان کے ہاتھ بعیت کی تھی وہ ہاتھ تادم حیات ناف تک نہیں پہونچا (۳۲)۔ مزید یہ کہ جب حضرت شیخ علی خطیب (۳۳) کو اپنے پیر ومرشد حضرت قطب عالم بخاری (۳۴) کی طرف سے تلقین نصیب ہوئی یہ مجرد تلقین سے ایسی تجلی مشہود ہوئی کہ آپ کی نظر (۳۵) جس چیز پر پڑتی وہ منقش اور روشن ہوجاتی۔ علی حق علی حق کا آپ کی آنکھوں کے سامنے ظہور ہوتا اور آپ مقام تحیر میں غرق ہوجاتے (۳۷) اس کے بعد آپ نے گوشۂ تنہائی اختیار کی اور ''تلاوت قرآن حکیم (۳۸) میں مشغول ہونے لگے (۳۹) لیکن جس صفحہ سے تلاوت شروع کرتے اس پر علی حق علی حق منقش ہوجاتے آپ اس صفحہ کو چھوڑ کر دوسرے صفحہ پر تلاوت کرتے اس پر بھی مذکور نقش ابھرتا۔ کچھ دنوں تلاوتِ قرآن شریف کا سلسلہ جاری رہا (۴۲) مجبوراً آپ اپنے مرشد عالی (۴۳) کی بارگاہ میں پہونچے اور اپنے حال سے آگاہ کیا۔ آنحضرت نے موصوف کو اپنے سامنے بٹھادیا اور فرمایا اپنے دل (۴۴) کو میرے دل کے مقابل حاضر کرو (۴۵) باطنی تصرف فرمایا اور کچھ دکھایا۔ اس کے بعد اس حال سے ترقی ہوئی (۴۷) آپ پھر ارشاد خلائق میں مشغول ہوگئے (۴۸)۔

گلزار ابرار میں آپ کے ارشادات واقوال:

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی کے خلفا میں سے ایک ملک شرف الدین معروف بہ شاہ شہباز برہان پوری کا تذکرہ گلزار ابرار میں کیا گیا ہے۔ جس میں حضرت شاہ علی خطیب کے ارشادات واقوال کے متعلق مؤلف حضرت شیخ محمد غوثی شطاری مندوی رقم

طراز ہیں کہ حضرت شاہ شہباز برھانپوری(۲) نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی صاحبِ دل(۳) مرشد کامل شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی کے مکان کے صحن میں کھڑے ہوئے ہیں اور بآواز بلند یہ آیت کریمہ تلاوت فرمار ہے ہیں(۴) :

یاایھا الذین آمنو واتقوا اللہ وابتغو اللہ الوسیلہ

(یعنی : اے ایمان والو اللہ سے خوف کرو اور اس کی طرف پہونچنے کے لئے اپنا وسیلہ مقرر کرو)۔

پھر ایک رات کو خواب میں دیکھا کہ حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی(۶) نے اپنا دست بیعت سے سرفراز کیا اور خرقۂ خلافت پہنا کر ارشاد عالی ہوا ''خرقہ بے صحبت درخت ناپایدار است''(۷) (ترجمہ: خرقہ بے صحبت بِنا پھل کے درخت کی مانند ہے)(۸)۔

حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی پر حضرت شاہ عالم بخاری کا مکتوب:

وضاحتی فہرست(۹) میں علاوۃ العارفین شرح زاد العاشقین(۱۰) کے حوالہ سے شیخ علی خطیب احمد آبادی(۱۱) اور حضرت شیخ عبداللطیف نہروالی(۱۲) کے نام حضرت شاہ عالم بخاری(۱۳) کے ایک مکتوب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ لطیف ابن جمال نہروالی المتقی(۱۴) نے اپنے مرشد عالی قطب عالم بخارے کے حکم سے لطائف برھانیہ تصنیف کی تھی اور حضرت شاہ عالم بخاری کے حکم کی تعمیل میں زاد العاشقین(۱۵)۔حضرت شاہ عالم بخاری نے اپنے دست مبارک سے فارسی زبان میں حضرت شیخ علی(۲۵) اور حضرت شیخ عبد الطیف(۲۶) کے نام ایک ایک رقعہ ارسال کیا تھا اس میں شاہ عالم صاحب نے انبیاء علیہ سلام(۲۷) کی محبت(۲۸) سے وابستہ ان حکایات کو جمع کرنے کا حکم فرمایا تھا(۲۹) شاہ عالم بخاری نے یہ رقعہ ۸۵۷ھ رمضان المبارک میں تحریر کیا تھا۔ اس کا مفہوم ذیل میں درج ہے(۳۰)۔

''اے بھائی(۳۱) سید علی(۳۲) اور بھائی(۳۳) عبدالطیف(۳۴) معلوم ہوا

ہے کہ انبیاء اکرام اور اولیاء رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین (۳۶) کی محبت (۳۷) سے تعلق قرآن حکیم (۳۸) اور حدیثوں (۳۹) میں پایا جانے والا مواد پر مشتمل ایک مختصر رسالہ (۴۰) مرتب ہوا ہے اسے جلد روانہ کریں (۴۱) تاکہ رغبت (۴۲) اور محبت (۴۳) میں اضافہ کا باعث ہو۔ جو چیز بھی محبت میں حاصل ہو وہ قیمتی ہوتی ہے (۴۴) المرقوم رمضان المبارک ۸۵۷ھ (۴۵)۔

اس مذکورہ مکتوب سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شاہ عالم بخاری نے اپنے اس مذکورہ مکتوب میں اپنے دو ہم عصر صوفی بزرگوں کو بھائی علی اور بھائی لطیف سے مخاطب کیا ہے۔ یہ دونوں بزرگ آپ کے والد بزرگوار قطب عالم بخاری (المتوفی ۸۵۸ھ) کے اکمل خلفا میں سے ہیں۔ آپس میں پیر بھائی بھی ہیں۔ کیونکہ وہ آپ کے ہم عصر پیر بھائی ہیں اور قابل غور بات یہ ہے کہ حضرت شاہ عالم بخاری نے اپنے دونوں پیر بھائیوں کو جو خط تحریر کیا تھا۔ وہ ماہ رمضان ۸۵۷ھ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت آپ کے پیر و مرشد اور والد ماجد نیز ان دونوں حضرات کے پیر و مرشد حضرت سید عبد اللہ برھان الدین قطب عالم بخاری احمد آبادی ابھی بقید حیات تھے۔ اس مذکورہ مکتوب کے ایک سال بعد آپ نے ۸۵۸ھ کو اس دنیا سے پردہ کیا۔

الغرض حضرت شاہ عالم بخاری کے مذکورہ مکتوب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علاقہ گجرات کے صوفیاء کرام میں حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی اور حضرت شیخ عبد الطیف نہروالی اور حضرت شاہ عالم بخاری کو اللہ تبارک تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن مجید اور اس کے مقدس بندوں کی جماعت انبیاء کرام، اولیاء رضوان اللہ علیہ اجمعین سے بے انتہا رغبت اور محبت تھی۔

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی کا زمانہ:

سلطان احمد شاہ اول (۸۱۳ھ تا ۸۴۵ھ) کے عہد میں مختلف سلسلوں کے اکابر مشائخین جن میں شیخ احمد کھٹو مغربی قطب لاقطاب سید عبد اللہ برھان الدین قطب عالم

بخاری سہروردی اور آپ کے ممتاز خلفا اور فرزند ارجمند سید محمد سراج الدین ابوالبرکات شاہ عالم بخاری سہروردی اور ان کے خلفاء خلیفۂ نظام الدین اولیا محبوب النبی شیخ بارک اللہ چشتی قابلِ ذکر ہیں۔

سلطان احمد شاہ اول کے زمانہ میں مشائخین عظام کا دور دورہ تھا۔ قدوۃ المحققین حضرت شیخ احمد کھٹو مغربی، سید عبداللہ برہان الدین قطب عالم بخاری سہروردی اور آپ کے ممتاز خلفا سید عثمان شمع برھانی، شیخ علی خطیب احمد آبادی، شیخ عبداللطیف نہروالی قطب عالم کے فرزند ارجمند سید محمد سراج الدین شاہ عالم بخاری سہروردی۔ آپ اکابر خلفاء حضرت مولانا شیخ احمد میاں مخدوم، شاہ غزنوی، سید زاھد بن قطب عالم، شیخ ابوبکر عیدروس حضرموتی وغیرہ ارشاد و تلقین خلائق میں مشغول تھے۔

سلطان احمد شاہ اول نے شیخ احمد کھٹو مغربی کو لکھا کہ لڑائی کے حالات کی راہ روش سے ایسا لگتا ہے کہ اس دیار میں کچھ عرصہ ٹھہرنا پڑے گا۔ حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ تم ۸۲۶ھ میں فتح و نصرت کے ساتھ اپنی راجدھانی احمد آباد واپس آؤ گے انشاء اللہ ایسا ہی ہوا۔ ولی صفت سلطان احمد شاہ اول کا کیا ہی مبارک زمانہ تھا کہ مذکورہ بالا مشائخین میں ہر ایک اپنے وقت کا قطب تھا۔

مناقب برھانی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی پہلے قدوۃ المحققین حضرت شیخ احمد کھٹو مغربی (المتوفی ۸۴۹ھ) کے مرید ہونے کی خواہش مند تھے۔ کیونکہ شیخ علی خطیب کو سماع کی محفل پسند نہیں تھی۔ اور شیخ احمد کھٹو کے یہاں سماع کا اہتمام ہوتا نہیں تھا۔ اس لیئے شیخ علی خطیب شیخ احمد کھٹو مغربی کے مرید ہونے کے خواہش مند تھے۔ مرید ہونے کے ارادے سے سرکھیج کی راہ لی۔ سابرمتی ندی کے کنارے آپ کی بیل گاڑی تھم گئی۔ اور بیلوں کو جیسے کسی نے پکڑ لیا ہو۔ سید برھان الدین قطب عالم بخاری سہروردی نے باطنی توجہ سے آپ کو اساول بلایا اور شیخ علی خطیب قطب عالم بخاری کی خانقاہ میں جا کر قطب عالم بخاری کے مرید ہوئے مراۃ سکندری سے بھی اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی سے حضرت شاہ عالم بخاری کے خلفا کا استفادہ:

مراۃ احمدی (۱) کے ضمیمہ میں مؤلف لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ عالم بخاری کے وصال (۱۷) (۸۸۰ھ) کے بعد آپ کی نعمت اور فیوض و برکات آپ کے چار خلفا میں منقسم ہوئیں (۱۸):

(۱) صاحب سجادہ سید نصیر الدین محبوب عرف سید محمد راجو بخاری احمد آباد (۱۹)

(۲) حضرت زاہد بن قطب عالم بخاری احمد آبادی (۲۰)

(۳) حضرت مولانا شیخ احمد میاں مخدوم احمد آبادی (المتوفی ۸۹۰ھ) (۲۱)

(۴) حضرت شریف شیخ ابوبکر عیدروس حضرموتی احمد آبادی (المتوفی ۸۹۲ھ) (۲۲)

حضرت مولانا شیخ احمد میاں مخدوم کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ میاں مخدوم نے ابتدائی تعلیم اپنے مادر وطن ناگور میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیئے احمد آباد تشریف لائے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد حضرت شاہ عالم بخاری کی خانقاہ میں اپنی روحانی تسکین کے لیئے حاضر ہوئے۔ ۱۲ سال تک اپنے مرشد عالی کی خدمت میں لگے رہے اور ۱۲ سال خانساماں (منیجر) (۲۳) کے طور پر خدمت انجام دیتے رہے بعد از وصال اپنے پیر و مرشد شاہ عالم بخاری (۸۸۰ھ) آپ دس سال زندہ رہے (۲۴)۔ ۲۲ / ربیع الثانی کو ۶۴ سال کی عمر میں آپ نے اس فانی دنیا کو الوداع کہا (۲۵) اور احمد آباد (۲۶) جماپور محلہ تاج پور میں آپ کا مزار اقدس مرجع خلائق ہے (۲۸) اس پر شاندار گنبد (۲۹) متصل مسجد (۳۰) اور خانقاہ بھی ہے (۳۱)۔

آپ کا وصال ۸۹۰ھ میں ۶۴ سال کی عمر میں ہوا اس حساب سے آپ کی ولادت بسعادت ۸۲۶ھ میں ہوئی ہوگی۔

مناقب برھانی (۳۳) کے بیان کے مطابق حضرت شاہ عالم بخاری کے مذکورہ بالا چار خلفا میں سے حضرت مولانا شیخ احمد میاں مخدوم کا خلیفۂ قطب عالم بخاری حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی سے استفادہ کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب حضرت شاہ عالم

بخاری کے (۳۴) عنقریب وقت وصال حضرت مولانا احمد میاں مخدوم (۳۵) نے اپنے پیر ومرشد سے عرض کیا کہ حضرت میں کہاں جاؤں اور اپنی مشکلات کا حل کہاں تلاش کروں۔ مرشد عالی نے فرمایا بھائی علی (۳۶) یعنی برادرم شیخ علی خطیب ہیں (۳۷) اگر کوئی مشکل پیش آئے تو ان سے رجوع کر لیا کرنا۔ حضرت میاں مخدوم نے اپنے پیر ومرشد کی وصیت کے مطابق حضرت شاہ عالم بخاری کے وصال (۸۸۰ھ) کے بعد حضرت شیخ علی خطیب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ حضرت شیخ علی خطیب نے فرمایا یہ فقیہ تو طالب علم ہے اگر آپ پڑھنا چاہیں تو بندہ حاضر ہے۔ حضرت میاں مخدوم سمجھ گئے کہ تواضع اور انکساری کی وجہ سے حضرت اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں (۳۸) حضرت مخدوم بھی ایک روز طالب علم کی طرح استاد کے پاس تختی لیکر حضرت شیخ علی خطیب کی خانقاہ (۳۹) میں پہونچ گئے موصوف نماز کے لیئے جب حجرہ سے باہر تشریف لائے تو آپ کی نظر حضرت میاں مخدوم پر پڑی۔ نماز سے فراغت حاصل کرنے کے بعد حضرت میاں مخدوم کو طلب کیا۔ اور تختی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھ کر تختی واپس کر دی اور چھ ماہ اپنی خدمت بابرکت میں زیر تربیت رکھا۔ روزانہ ''بسم'' کی تفسیر بیان فرماتے رہے۔ بعد ازاں مبارک نام ''اللہ'' کی تفسیر بیان فرمانے کے بعد تیسرے روز تصرف فرمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت میاں مخدوم کا خاطر خواہ کام ہو گیا۔ انھیں ارشاد خلائق کے لیئے رخصت کیا (۴۰)۔

حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی کا وصال اور مزار اقدس:

اخبار الاخیار (۵۱) کے مؤلف حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی تصنیف میں قطب عالم بخاری احمد آبادی (۵۲) اور ان کے فرزند ارجمند شاہ عالم بخاری کے چند خلف (۵۳) کا احمد آباد (۵۴) میں مدفون ہونے کا ذکر کیا ہے (۵۵) لیکن دونوں بزرگوں کے خلفا کے نام نہیں دیئے ہیں۔ لیکن ثمراۃ القدس من شجرۃ الانس (۵۶) میں لکھا ہے کہ شاہ علی خطیب احمد آبادی (۵۷) قطب عالم بخاری احمد آبادی (۵۸) کے مرید (۵۹) وخلیفہ (۶۰) تھے۔ علم ظاہری وباطنی سے آراستہ تھے (۶۱) بعمر ۶۴ سال آپ اس دار فانی سے عالم بقا کی طرف

کوچ کر گئے۔ آپ کا مزار اقدس احمد آباد (۶۴) میں ہے (۶۵)۔

حضرت شیخ شاہ علی خطیب حضرت قطب عالم بخاری سہروردی کے خلفای کبار میں سے تھے۔ جب آپ کی عمر۶۴ سال کی ہوئی تو آپ نے ماہِ ربیع الاوّل میں بروزِ پیر آپ نے اس فانی دنیا کو الوداع کہا۔ آپ اسلام کے خلیفۂ اول آنحضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے ہیں۔

حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادی کے ممتاز مریدین وخلفا:

حضرت شیخ شاہ علی خطیب کے خرقۂ خلافت پانے اور مرید ہونے کے ضمن میں سید عبد الرحمٰن شاہ بدھا مناقب برہانی(۱) میں رقم طراز ہیں کہ جب باطنی توجہ سے قطب عالم بخاری (۲) نے اپنے آستانۂ عالی پر شیخ علی خطیب (۳) کو آنے کے لیۓ مجبور کر دیا اور جب شیخ علی خطیب قطب عالم بخاری کی خدمت میں پہونچے شیخ علی خطیب کی مرضی کے مطابق پہلے خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا، عبد مریدی کا شرف بخشا چند حضرات (۴) ارادت کے ارادے سے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ قطبِ عالم بخاری نے شیخ علی خطیب کو حکم دیا کہ ان حضرات کو مرید بنائیں (۵)۔ مرشد عالی کے حضور میں اور آپ کے حکم کی تعمیل میں شیخ علی خطیب نے حضرت شیخ دوبن (۸) حضرت شیخ فرید(۹) حضرت شیخ سراج المخاطب(۱۰) اور حضرت شاہ شہباز برھان پوری(۱۱) کو مرید بنایااور اپنی قربتِ میں انھیں کمال تک پہونچایا(۱۲)۔

مناقب برہانی(۱۳) کے علاوہ گجرات کی مستند تاریخی کتب تاریخ مراۃ سکندری(۱۴)، مراۃ الاسرار(۱۵)، مد حکایات(۱۶) اور خاتمہ تاریخ مراۃ احمدی(۱۸) میں شیخ علی خطیب اور آپ کے ممتاز خلفا میں شیخ سراج المخاطب سراج العاشقین (۱۴) کا ذکر ہے۔ تاریخ مراۃ سکندری(۱۹) کے مؤلف سکندر بن منجھو نے سلطان محمود بیگڑا کے حوالہ سے ایک واقعہ قلم بند کیا ہے۔ جب سلطان محمود بیگڑا کو اپنی عاقبت سنوارنے کا خیال ستانے لگا تب اپنے ایک امیر امین الملک کو بلا کر کہا کوئی ایسا خدا رسیدہ بزرگ ہے جو مجھے مقصد حیات تک

پہونچائے (۲۰) امین الملک جو حضرت شیخ سراج کے مریدوں میں سے تھا اس نے اپنے پیر ومرشد شیخ سراج کا اسم گرامی گوشگزار کیا۔ سلطان نے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک روز دونوں حضرت شیخ سراج سے ملے۔ سلطان محمود بیگڑا نے اپنے دل کی بات حضرت شیخ سراج کے سامنے رکھی اور حضرت شیخ سراج نے سلطان محمود بیگڑا کو اپنی تربیت میں لیکر منزل مقصود تک پہونچایا (۲۰)۔

گلزار ابرار (۲۱) میں شیخ علی خطیب کے ممتاز خلفا میں حضرت شاہ شہباز برھان پوری (المتوفی ۱۰ ربیع الآخر ۹۳۴ھ) کے ممتاز مریدین وخلفاء میں آپ کے دو فرزند رشید حضرت شیخ عبدالکریم اور شیخ عبدالرحیم۔ ان کے علاوہ دوسرے اکابر خلفا میں شیخ اکبر اور حضرت شیخ جلال مشہور ومعروف ہیں۔ اور حضرت شیخ جلال (المتوفی ۹۳۸ھ) کے خلفا میں حضرت سید ابراھیم بھکری مشہور ہیں۔ سید ابراھیم بھکری (متوفی ۹۹۸ھ) کی خدمت میں شیخ عیسی جند اللہ المعروف اولیاء سندھ ثم برھانپوری نے (متوفی ۱۰۳۱ھ) تربیت پاکر خرقۂ خلافت حاصل کیا اور سید ابراھیم بھکری کے خلفا میں حضرت شیخ نظام مشہور ومعروف ہیں (۲۲) تاریخ برہان پور میں بحوالہ تاریخ مراۃ عالم کے مؤلف ملا بختیار خاں کا بیان ہے کہ حضرت شیخ نظام کی سرپرستی میں فقہ کی مشہور کتاب فتاوی عالمگیری (۲۴) مرتب ہوئی (۲۵) فتاوی عالمگیری (۲۶) میں حضرت شیخ نظام کو فتاوی عالمگیری کا جامع (۲۷) بتایا ہے۔

تاریخ اولیاء کرام برھان پور میں ملفوظات شاہ شہباز کے حوالہ سے حضرت شاہ علی خطیب احمد آبادی کے خلفا میں حضرت شاہ شہباز برھان پوری کے خاص خادم مریدین کے بارے میں مولوی محمد بشیر خان صاحب لکھتے ہیں کہ ملک شرف الدین بن عبدالقدوس المعروف شاہ شہباز برھان پوری حضرت شیخ علی خطیب احمد آبادی کے مرید وخلیفہ ہیں۔ حضرت شاہ شہباز کے ممتاز خادم ومریدین وصحبت یافتہ میں حضرت بی بی ماہ صاحبہ حضرت شیخ بھکری، حضرت کمال الدین حضرت عین الدین مشہور ہیں (۳۱)۔

تاریخ اردو ادب میں بحوالہ قطب مشتری (۱۰۲۸ھ) مؤلف ملا وجہی شاہ شہباز کے ایک خلیفہ حضرت محمود کے بارے میں پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین لکھتے ہیں

کہ حضرت محمود شاعر ہیں۔ اور حضرت شاہ شہباز کے مرید وخلیفہ ہیں۔ ملا وجہی نے حضرت محمود کو استادِ سخن تسلیم کیا ہے۔ (کتب خانہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ احمد آباد گجرات میں آپ کا دیوان ، دیوانِ محمود کے نام سے مخزون ہے فارسی مخطوطہ نمبر ۱۸۶۳)

حضرت شاہ علی خطیب احمد آبادیؒ آپ کی اولاد :

تذکرہ الانساب[1] میں نبیرہ حضرت شیخ شاہ علی حطیب احمد آبادیؒ کے تذکرہ میں آپ کی اولاد کے بارے میں مولف مولوی سید امام الدین احمد گلشن آبادی لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ منتخب الدین قادری دہولقی ثم بیجاپوریؒ بن شیخ محمدؒ بن شیخ حسینؒ بن شیخ محمدؒ بن حضرت مولانا شیخ شاہ علی خطیب گجراتی[2]۔

مذکور بالا سلسلہ نسب بحوالہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مولانا شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادیؒ کے فرزند کا اسم گرامی حضرت شیخ محمدؒ اور پوتے کا اسم گرامی حضرت شیخ حسینؒ ہے۔ اور آپ کے پورے حضرت شیخ حسینؒ کے فرزند کا اسم گرامی حضرت شیخ محمدؒ اور پوتے کا اسم گرامی حضرت شیخ منتخب الدین قادری دہولقی گجراتی ثم بیجاپوریؒ ہے۔

اخبار الاخیار[3] مولف حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادیؒ کے پوتے حضرت شیخ حسینؒ آپ کا تذکرہ درضمن کرہ حضرت شیخ بہاءالدین جون پوریؒ میں کیا ہے۔ آپ کے پوتے حضرت شیخ حسینؒ آپ حضرت شیخ محمد عیسی جون پوریؒ کے خلفاء کبار میں سے ہیں۔ جو سلسلہ چشتیہ کے اکابرین مشائخ جون پور میں سے تھے۔ آپ کے پوتے حضرت شیخ حسینؒ سے حضرت شیخ بہاو الدین جون پوریؒ (المتوفی ۹۴۷ھ) کے خلیفہ حضرت سید راجی بدشاہ مانک پوریؒ (المتوفی ۹۰۴ھ) جیسے جلیل القدر مشائخ جون پور نے آپ کی صحبت کا شرف حاصل کیا اور مرید ہونے کے خواہش مند تھے۔ الغرض حضرت شیخ شاہ علی خطیب احمد آبادیؒ کے پوتے حضرت شیخ حسین چشتی گجراتی المشہور صاحب ولایت وخطیب دہولقیؒ ہیں جن کا مزار پاک احمد آباد کے قریب شہر دہولقہ (گجرات) میں زیارت گاہ مرجع خلائق ہے۔ آپ کے مزار پاک پر کسی عقیدت مند نے

عالی شان گنبد تعمیر کیا۔ ۴

الغرض حضرت مولانا شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادیؒ کی اولاد میں آپ کے پوتے حضرت شیخ حسینؒ چشتی گجراتی المعروف صاحب ولایت وخطیب دھولقیؒ خلیفہ شیخ محمد عیسی جون پوریؒ سے متعلق مستند تصنیفات بحوالہ سے آپ کا تذکرہ (اخبار الاخیار میں موجود دھولقہ گجرات کے مشائخ) کے نام سے ایک تحقیقی مقالہ میں راقم الحروف مقالہ ھذا احقیر العباد فقیر عاصی عبد اللہ قادری بیجاپوری نبیرہ حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آباد نے اس مذکورہ مقالہ سے قبل پیش کیا ہے۔

تذکرۃ الانساب ۵ بحوالہ سے مذکور پیش کردہ سلسلہ نسب میں حضرت مولانا شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادیؒ کے پوتے حضرت شیخ حسینؒ چشتی گجراتی المعروف صاحب ولایت وخطیب دھولقیؒ کے فرزند ارجمند کا اسم گرامی حضرت شیخ محمدؒ اور آپ کے پوتے کا اسم گرامی حضرت شیخ منتخب الدین قادری دھولقی گجراتی ثم بیجاپوریؒ ہے۔ ۶

روضۃ الاولیاء بیجاپور ۷ میں آپ کے پوتے حضرت شیخ منتخب الدین قادری دھولقی ثم بیجاپوری کے بارے میں علاقہ دکن شہر بیجاپور کے جلیل القدر عالم مؤلف مرزا محمد ابراہیم زبیری بیجاپوریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ منتخب الدین قادری دھولقی ثم بیجاپوریؒ آپ بیجاپور کے بڑے مشائخ میں سے ہیں۔ اور شیخ الکرام حضرت شیخ شاہ علی خطیب گجراتیؒ (احمد آبادی) کی اولاد سے ہیں جن کا سلسلہ نسب خلیفہ اول یار غار شفیع روز محشر حضرت سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا ہے۔ آپ اپنا مولود و مسکن بمقام دھولقہ (ضلع احمد آباد) گجرات سے (علاقہ دکن) شہر محمد آباد بیدر تشریف لائے۔ اور شیخ المشائخ حضرت شیخ ابراہیم دم جی قادر بیدریؒ (المتوفی ۹۷۲ھ) کے ہاتھ پر بیعت ہوکر خلافت واجازت سلسلہ قادریہ کی حاصل کر کے بیجاپور تشریف لائے۔ حضرت شیخ منتخب الدین قادری تقی گجراتی ثم بیجاپوریؒ بن محمد بن حسین بن محمد بن مولانا شیخ شاہ علی خطیب گجراتی احمد آبادیؒ کا مزار پاک دکن میں شہر بیجاپور میں حصار کے باہر ابراہیم پور کے قریب جنوبی جانب ایک چبوترے پر موجود ہے۔ اور آپ کی اولاد موضع گولسنگی بیجاپور میں موجود ہے ۸۔ راقم الحروف

مذکورہ مقالہ ھذا احقیر العباد عبداللہ قادری بیجاپور بھی آپ کی اولاد سے ہے۔

حاشیہ

۱۔ ایک سے دس = گلزار ابرار (سال تالیف ۱۰۴۲ھ) مؤلف حضرت شیخ محمد غوثی شطاری مندوی فارسی ص۔۶۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۳۳، ۱۳۹، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۷۷، ۵۳۔

فوائد الفوائد (اردو) مترجم اردو حضرت سید خواجہ حسن شاز نظامی دہلی، مقدمہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی دہلوی۔

آپ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری ثم دہلوی کے مرید وخلیفہ ہیں۔ جو سلسلہ سہروردیہ کے بانی الثانی شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین عمر سہروردی صدیقی بغدادی (متوفی ۶۳۲ھ) کے مرید وخلیفہ ہیں (بحوالہ گلزار وابرار فارسی ۔۵۳)۔

لطائف اشرفی (ملفوظات مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی) جلد چہارم لطیفہ پندرواں مترجم اردو مطبوعہ ۵۵۔۵۶۔

۲۔ ۱۱ سے ۱۲ یادایام اردو مطبوعہ ص:۸۶۔

۳۔ ۱۳ سے ۱۷ خاتمہ مراۃ احمدی (سال تالیف ۱۱۷۴ھ) مؤلف مرزا علی محمد خاں فارسی۔

۴۔ ۱۸ سے ۲۳ مناقب برھانی (سال کتاب ۱۱۵۴ھ) مؤلف حضرت سید عبدالرحمن المعروف شاہ بڈہ۔ فارسی قلمی ۔ص۔۹۷ تا ۱۰۳۔

۵۔ ۲۴ مراۃ سکندری (سال تالیف ۱۰۲۰ھ) مؤلف سکندر بن منجھو، مترجم اردو مطبوعہ ص۔۹۹، ۱۰۰، ۵۲۔

۱۔ ۱۳ تا ۵۰ (۱) روضہ الاولیا بیجاپور (سال تالیف ۱۲۴۵ھ) فارسی قلمی ص۔۲۸۔ (۲) تذکرۂ اولیای دکن جلد دوم اردو مطبوعہ ص۔۳۹ تا ۱۸۷۔

۲۔ ۱۳ تا ۱۷ مناقب برھانی (سال تالیف ۱۱۵۴ھ) فارسی قلمی ص۔۱۰۳۔

۳۔ ۳۲ تا ۵۰

(۱) عوارف المعارف مترجم اردو (مقدمہ) علامہ شمس بریلوی اردو مطبوعہ ص۔۱۰۳۔

(۲) طبقات الشافیہ مؤلف حضرت امام سبکی عربی

(۳) جواہر فریدی سال تالیف ۱۰۳۳ھ مؤلف حضرت شیخ محمد علی اصغر چشتی فاروقی فریدی فارسی قلمی ص۔۵۱۵، ۵۱۶، ۴۹۷۔

(۴) لطائف اشرفی ملفوظات حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی ثم کچھوچھوشریف جلد چہارم لطیفہ پندرواں مترجم اردو مطبوعہ ص۔۴۵۔

۱۔ ۱ تا ۱۴ مراۃ الاسرار (سال تالیف ۱۰۶۵ھ) حضرت شیخ عبد الرحمن چشتی علوی مترجم اردو مطبوعہ ص۔۶۲، ۱۴۳، ۱۲۸، ۱۲۹۔

۲۔ ۱ تا ۱۴ نظام التواریخ (سال تالیف ۶۷۲ھ) مؤلف حضرت قاضی ابوعبداللہ بیضاوی فاسی ص۔۳۵۔

۳۔ ۱۵ تا ۲۷ مناقب برھانی مؤلف حضرت سید عبد الرحمن المعروف شاہ بڈہ فارسی قلمی ۹۷۔۹۸۔

۴۔ ۱۵ تا ۲۷ خاتمہ مراۃ احمدی مؤلف علی محمد خاں فارسی ص۔۳۲-۳۳۔

۵۔ ۱۵ تا ۲۷ تحفۃ الکرام (سال تالیف ۱۱۸۱ھ) مؤلف میر شیر علی قانع جلد اول فارسی ص۔۲۱-۲۲۔

۱۔ ۱ تا ۱۴ - ۳۱ تا ۴۲ مناقب برھانی فارسی قلمی ص۔۹۷ تا ۱۰۰۔

۲۔ ۱ تا ۱۴ - ۳۱ تا ۴۲ ثمراۃ القدس من شجرۃ الانس (سال تالیف ۱۰۱۷ھ) فارسی۔ ص۔۸۴۵۔

۳۔ ۱ تا ۱۴ - ۳۱ تا ۴۲ گلزار ابرار فارسی ص۔۴۴۸-۴۴۹۔

۴۔ ۱ تا ۱۴ - ۳۱ تا ۴۲ خاتمہ مراۃ احمدی فارسی ص۔۳۲-۳۳۔

۵۔ ۳۲ تا ۳۹ ۔ روضۃ الاولیاء بیجاپور فارسی قلمی ص۔۲۸۔

۶۔ ۳۲ تا ۴۲ مراۃ سکندری مترجم اردو مطبوعہ ص۔۹۹-۱۰۰۔

۷۔ ۳۲ تا ۴۲ مراۃ الاسرار مترجم اردو مطبوعہ ص۔۸-۱۲۔

۸۔ ۳۲ تا ۴۲ تاریخ تحفۃ الکرام جلد اول ۲۱-۲۲۔

۱۔ ۲۵ تا ۴۸ مناقب برھانی فارسی قلمی ص۔۹۷ تا ۱۰۳۔

تا ۸ تذکرۃ الانساب (سال تالیف ۱۳۳۲ھ افضل المطابع دہلی) اردو مطبوعہ ص:۶۔۷

تا ۴ بحر ذخار (سال تالیف ۱۰۵۰ھ) فارسی قلمی ۲۹۹

تا ۸ روضۃ الاولیاء بیجاپور (سال تالیف ۱۲۴۵ھ) فارسی قلمی ۲۸۔۲۹

۳ تا ۴ اخبار الاخیار (سال تالیف ۱۰۰۲ھ) فارسی ۱۹۲

۳ تا ۴ خاتمہ مراۃ احمدی (سال تالیف ۱۱۷۴ھ) فارسی ۱۲۴۔۱۲۵

۷ تا ۸ محبوب ذوالمنن تذکرۃ اولیاے دکن جلد دوم ص:۷۳۹۔۷۴۰۔

ماخذات فہرست عربی و فارسی

- یاد ایام (سال تالیف ۱۱۹۰) مولفہ علامہ سید عبد الحی حکیم حسنی ندویؒ طباعت: مجلس تحقیقات ونشریات ندوۃ العلماء لکھنو۔ اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ

- گلزار الابرار (سال تالیف ۱۰۲۲ھ) مولفہ حضرت شیخ محمد غوثی شطاریؒ (فارسی قلمی مخطوطہ نمبر۔ فن تذکرہ ۱۷۷)

- کتب خانہ اورینٹل مینو اسکرپٹ لائبریری حیدرآباد۔ (فارسی مخطوطہ) طباعت: خدابخش لائبریری پٹنہ۔ ذاتی کتب خانہ

- مراۃ سکندری (سال تالیف ۱۰۲۰ھ) مولفہ سکندر عرف منجھو (فارسی مخطوطہ نمبر۔۱۵۳۲) کتب خانہ

درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ لائبریری احمد آباد۔ مترجم اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ

- مناقب برہانی (سال کتابت ۱۱۵۴ھ) مولفہ حضرت سید عبد الرحمن العروف شاہ بڈاؒ (فارسی قلمی مخطوطہ نمبر ۲۰۰۳۔ شمارہ میکروفیلم ۹۰) کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہؒ لائبریری احمد آباد۔

- تذکرۃ الانساب (سال ۱۳۳۲ھ) مولفہ مولوی سید امام الدین احمد گلشن آبادی طباعت: افضل المطابع دہلی۔ اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ

- نفحات الانس (سال تالیف ۸۸۳ھ) مولفہ حضرت مولانا عبد الرحمن جامیؒ (فارسی مخطوطہ) کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہؒ لائبریری احمد آباد۔ فارسی مترجم اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔

- عوارف المعارف (سال تالیف ۵۶۰ھ) مترجم علامہ شمس بریلویؒ (عربی مخطوطہ نمبر ۶۳۹۔۶۴۰) کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہؒ لائبریری احمد اباد۔ مترجم اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔

- نظام التواریخ (سال تالیف ۶۷۲) مولفہ حضرت قاضی ابو عبد اللہ بیضاویؒ (فارسی مخطوطہ نمبر ۲۱۴) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔: ذاتی کتب خانہ

- مراۃ الاسرار (سال تالیف ۱۰۶۵ھ) مولفہ حضرت شیخ عبد الرحمن چشتیؒ (فارسی مخطوطہ نمبر فن تذکرہ ۱۶۷) کتب خانہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری حیدرآباد۔ مترجم اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔

- رف اشرفی (ملفوظات حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) (فارسی مخطوطہ نمبر فن تراجم ۴۲۹) کتب خانہ آندھر پردیش آرکائیوز لائبریری حیدرآباد۔ مترجم اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔

- جواہر فریدی (سال تالیف ۱۰۳۳ھ) مولفہ حضرت شیخ محمد علی اصغر چشتی فاروقی فریدیؒ (فارسی مخطوط نمبر فن تصوف ۱۵۵۵) کتب خانہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری حیدرآباد: ذاتی کتب خانہ۔

- روضۃ الاولیاء بیجاپور (سال تالیف ۱۲۴۵ھ) مولفہ مرزا محمد ابراہیم زبیریؒ (فارسی مخطوطہ نمبر ۱۲۹۔۲۶۶) کتب خانہ اورینٹل مینواسکرپٹ لائبریری حیدرآباد: ذاتی کتب خانہ

محبوب ذوالمنن تذکرہ اولیاے دکن مولفہ مولوی عبد الجبار ملکاپوری طباعت: حیدرآباد۔ اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ

- خاتمہ مراۃ احمدی (سال تالیف ۱۱۷۴ھ) مولفہ مرزا محمد علی خاں (فارسی مخطوطہ نمبر ۲۹۶) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد: ذاتی کتب خانہ

- تاریخ نایاب تحفۃ الکرام (سال تالیف ۱۱۸۱ھ) مولفہ میر شیر علی قانع (فارسی مخطوطہ نمبر ۲۹۸) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد: ذاتی کتب خانہ۔

- حیات شاہ عالم (مطبوعہ ۱۹۷۶ء) مولفہ مولوی محمد نذیر احمد نیازی اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔
- جامع طرق مولفہ حضرت قطب عالم بخاریؒ (المتوفی ۸۵۸ھ) (عربی وفارسی مخطوطہ نمبر) کتب خانہ آصفیہ لائبریری حیدرآباد۔
- وضاحتی فہرست (عربی وفارسی مخطوطہ) کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ لائبریری احمد آباد: ذاتی کتب خانہ۔
- حلاوۃ العارفین شرح زاد العاشقین (عربی مخطوطہ نمبر ۶۲۳) مولفہ حضرت شیخ عبد الغنی بن ابی بکر بن قاسم الفقتیؒ کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد۔
- ثمرات القدس من شجرات الانس (سال تالیف ۱۰۱۷ھ) مولفہ مرزا لعل بیگ بدخشیؒ (فارسی مخطوط مطبوعہ تہران) ذاتی کتب خانہ پروفیسر شریف الحسن قاسمی دہلوی صاحب (دہلی یونیورسٹی دہلی) (فارسی مخطوطہ نمبر ۲۵۵۸) وضاحتی فہرست خطی نسخہ ھای فارسی جلد اول ص: ۷۹، کتب خانہ رام پور رضا لائبریری رام پور۔
- صد حکایات مولفہ حضرت سید جعفر بدر عالم بکاری احمد آبادیؒ (المتوفی ھ) (فارسی مخطوط نمبر) کتب خانہ درگاہ حضرت شیخ کھٹو گنج بخشؒ ٹرسٹ لائبریری سرکھیج (ضلع احمد آباد)۔
- تاریخ برہان پور مولفہ مولوی خلیل الرحمن برہان پوری کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔ اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔
- تاریخ اولیاء کرما برہان پور موفہ مولوی محمد بشیر خان صاحب اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔
- تاریخ اولیاء کرام برہان پور مولفہ مولوی محمد بشیر خان صاحب اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔
- فتاوی عالمگیری مولفہ حضرت شیخ نظام برہان پوریؒ مترجم اردو مطبوعہ سید امیر علیؒ مترجم اردو مطبوعہ : ذاتی کتب خانہ۔
- تاریخ ادب اردو مولفہ پروفیسر سید جعفر و پروفیسر گیان چند جین طباعت: ادارہ ادبیات اردو دہلی: ذاتی کتب خانہ۔
- مشائخ احمد آباد مولفہ مولوی یوسف متالا بری ((انگلینڈ) حضرت سید تمیز الدین حسینی زیدی صاحب سجادہ نشین کتب خانہ درگاہ حضرت سید عثمان زیدی المعروف شمع برہانی احمد آباد۔
- زاد العاشقین (عربی مخطوطہ نمبر ۱۴۲۶۸۲۔ شمارہ میکروفیلم نمبر ۱۔۸۔۱۴۴) مولفہ حضرت شیخ عبد الطیف نہروالیؒ (المتوفی ۸۸۳ھ) کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد۔

- تاریخ صوفیاء گجرات مولفہ ڈاکٹر ظہیرالحسن شارب طباعت: کتب خانہ شارب انسٹیٹیوٹ وریسرچ سنٹر اجمیر۔ اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔
- تصوف اور صوفیاء کرام مولفہ ڈاکٹر محمد صبغتی اللہ بنگلوری اردو مطبوعہ: ذاتی کتب خانہ۔
- احمد آباد کے اولیاء (گجراتی مطبوعہ) کتب خانہ درگاہ حضرت قطب عالم بخاریؒ احمد آباد: ذاتی کتب خانہ۔
- گجرات کے شان چراغ (گجراتی مطبوعہ) کتب کانہ درگاہ حضرت قطب عالم بخاریؒ احمد آباد: ذاتی کتب خانہ۔
- اے ہسٹری آف صوفیزم ان انڈیا (انگریزی مطبوعہ) مولفہ سید اطہر عباس رضوی صاحب (آسٹریلیہ) کتب کانہ انجمن اسلام ڈگری کالج لائبریری بیجاپور۔
- دیوان محمود (فارسی مخطوطہ نمبری۔ ۱۸۶۳) مولفہ محمود کتب خانہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ٹرسٹ لائبریری احمد آباد۔
- اخبار الاخیار (سال تالیف ۱۰۰۲ھ) مولفہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ (فارسی مخطوطہ نمبر) کتب خانہ مسلم لائبریری بنگلور: ذاتی کتب خانہ۔
(فارسی مخطوطہ نمبر ۱۱۱) کتب خانہ رامپور رضا لائبریری رام پور۔ (فارسی مخطوطہ نمبر ۵۳) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔
- ھفت اقلیم (سال تالیف ۱۰۰۲ھ) مولفہ امین احمد رازی (فارسی مخطوطہ نمبر) کتب خانہ بمبئی آرکیوئیز لائبریری ممبئی۔

۱۶

ولیؔ کا تاریخی کارنامہ

- ڈاکٹر ظفر احمد صد
(علیگڈھ مسلم یونیو)

ولیؔ اورنگ آبادی ہیں یا گجراتی؟ انھیں شاہ سعد اللہ گلشنؔ نے کوئی مشورہ دیا یا نہیں؟ ان کا دیوان عہدِ اورنگ زیب میں دہلی آیا یا عہد محمد شاہ میں؟ یہ تمام امور اختلافی ہیں اور ان کا قطعی حل غالباً ممکن بھی نہیں۔ لیکن یہ بات تمام اختلافات اور شک و شبہے سے بالا ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔

اس گفتگو کے آغاز ہی میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں اب تک ولیؔ کا جس قدر بھی مطالعہ کیا گیا ہے، وہ بیشتر زمانہ مابعد کے شعرا کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ یعنی ولیؔ کی شاعری کے بارے میں جب ہم کچھ لکھتے پڑھتے اور سوچتے ہیں تو ہمارے ذہن میں میرؔ و غالبؔ یا بعض دوسرے شعرا ہوتے ہیں اور ہم انھی زمانۂ مابعد کے شعرا کے تناظر میں ولیؔ کی قدر و قیمت یا اہمیت و انفرادیت پر گفتگو کرتے ہیں، لیکن حق یہ ہیکہ ولیؔ کے ادبی کارناموں اور شعری اکتسابات کا اگر صحیح معنوں میں اندازہ لگانا ہو تو ہمیں ان کا مطالعہ ان سے پہلے کے شعرا مثلاً حسن شوقیؔ، قلی قطبؔ شاہ اور نصرتیؔ وغیرہ کی شاعری کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیئے۔

دکنی ادب کا مطالعہ کرنے والے اس حقیقت سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ دکنی شعرا نے سب سے زیادہ صنفِ مثنوی کی طرف توجہ مبذول رکھی ہے اور اردو ادب کی تاریخ کا دکنی دور دراصل مثنوی نگاری سے عبارت ہے۔ فخر الدین نظامیؔ کی کدم راؤ پدم راؤ، اشرف بیابانی کی

نوسر ہار، نصرتی کی علی نامہ، رستمی کی خاور نامہ، ضعیفی کی قصۂ بے نظیر اور ہاشمی کی یوسف زلیخا کے نام یہاں بہ طور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی دکن میں اس صنف کے فروغ و ارتقا اور کثرت و فراوانی کی وجہ یہ ہے کہ وہاں مثنوی نگاری ہی کو شاعرانہ اظہارِ کمال کا معیار تصور کیا جاتا تھا اور وہاں کے ادبی معاشرے میں کوئی شاعر اس وقت تک پایۂ اعتبار حاصل نہ کر سکتا تھا، جب تک کہ اس صنف میں اپنی قادر الکلامی کا ثبوت فراہم نہ کر دے۔

ولی نے یہ انقلابی کارنامہ انجام دیا کہ صدیوں کی اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے مثنوی کے بجائے غزل کو اپنا مطمعِ نظر قرار دیا اور اس صنف میں نغز گوئی و تازہ کاری کے وہ نقوش قائم کیے کہ آئندہ کے لئے غزل گوئی [illegible] معیارِ فن اور معیارِ سخن قرار پائی۔

بلاشبہ یہ ولی کی وہبی ذہانت اور عبقریت تھی کہ انھوں نے مثنوی نگاری کے بجائے غزل گوئی کی طرف توجہ کی، ورنہ دکنی مثنوی نگاروں کی بھیڑ میں وہ بھی کہیں گم ہو جاتے اور شمال کے اہل زبان و ارباب ذوق انھیں بھی اسی طرح خاطر میں نہ لاتے، جس طرح دکن کے دوسرے شعرا کو انھوں نے قابلِ اعتنا تصور نہیں کیا۔

ولی کا دوسرا تاریخی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دکنی غزل کی اس روایت کو جو محمود، فیروز، خیالی، حسن شوقی، قلی قطب شاہ اور نصرتی وغیرہ سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچی تھی، ایک نیا رخ اور نیا مزاج عطا کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ولی سے پہلے کی اردو شاعری پر مقامی لفظیات اور مقامی طرزِ اظہار کا غلبہ تھا۔ ولی نے اپنی شاعری کے ذریعے اس کا رُخ فارسیت کی جانب موڑ دیا، بلکہ یوں کہیے کہ فارسی لفظیات اور فارسی طرزِ اظہار کو اردو کا غالب رجحان بنا دیا۔ اس کا صحیح طور پا اندازہ لگانے کے لیے ذیل میں نصرتی اور ولی کی ایک ایک غزل پیش کی جاتی ہے۔ واضح ہو کہ نصرتی علی عادل شاہ ثانی کے زمانے کا شاعر ہے اور محققین کا اندازہ ہے کہ ولی نے بھی عادل شاہ مذکور کا زمانہ پایا اور اس میں شاعری کی ہے لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نصرتی اور ولی دونوں قریب العہد ہیں، لیکن دونوں کی زبان میں صدیوں کا فاصلہ محسوس ہوتا ہے۔ نصرتی کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مغرور بے خبر ہے، مدسوں مدن کی بالی عالم کے جیو لینے لوچن میں ہے سوالالی

اس خام تن میں دیکھو، کیا پختگی کے فن ہیں — دینے کو وصل کا ہل، لینے کو جیو اُتالی
برہے کی نس میں غم سوں، جلتا ہوں شمع نمنے — دکھلا سماں درس کا اے خاورِ جمالی
مجہ من کرا کبوتر، ہے تجہ بھواں حیراں — پھر پھر نکو اڑادے پلکاں کی مارتالی
سنتے سبب عجب کیا ہو تلخ طبع، شیریں — نابات سوں نہیں کم شکر لباں کی لالی
کڑونے بچن ہنسی میں یوں او چھپا لجاوے — کرتے ہیں مُوں مٹھا جیوں دارو پلا کسالی
سرمست نصرتی سوں چل سی نہ کچھ حریفی — خوبوں کی بزم کا ہے اور رندِ لاابالی

ملحوظ رہے کہ نصرتی کے قصائد کے برخلاف اس غزل کی زبان بہت صاف اور شستہ ہے۔ اس میں سنکرت کے تت سم اور مقامی زبانوں کے ثقیل اور نامانوس الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں، یعنی ایسے الفاظ جو مثلاً اس کے قصیدے کے درج ذیل شعر میں آئے ہیں :

جاں تو کٹک لے، ٹک اٹک، سنمک ہٹک سو ندل کیا
کھڑکاں کو کھڑکاں لگ لڑک ہر اک کھڑک ہوئی کھر کھری

[یعنی اے ممدوح! تو نے جہاں بھی فوج لے کر، ذرا جم کر، دشمن کے روبرو آکر پکارتے ہوئے جنگ کی، تلواریں تلواروں سے خوب ٹکرائیں اور ہر تلوار کی دھار جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی۔]

اس کے علاوہ اس غزل میں خاورِ جمالی، تلخ طبع، شکّر لباں، سرمست اور رندِ لاابالی جیسی خالص فارسی ترکیبیں بھی موجود ہیں، تاہم اگر اسے ولی کے کلام کے ساتھ پڑھا جائے تو دونوں کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اب ولی کی غزل ملاحظہ ہو :

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے — نین جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
ریاضی فہم و گلشن طبع و دانا دل علی فطرت — زباں تیری فصیحی و سخن تیرا زلالی ہے
نگہ میں فیضی و قدسی، سرشتِ طالب و شیدا — کمالِ بدر، دل اہلی و انکھیاں سوں غزالی ہے
توہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت — ترے ابرو یہ مجھ بیدل کو طغرائے وصالی ہے
ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل — تو ہر اک بیت عالی ہور ہر اک مصرع خیالی ہے

وؔلی کی یہ غزل معنوی مناسبات، لفظی رعایات اور دیگر فنی محاسن کی بنا پر پوری اردو شاعری میں اپنی نظیر آپ ہے، لیکن سرِ دست اس پر تفصیلی گفتگو کو موقوف رکھتے ہوئے محض زبان کی سطح پر بھی دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے اوائل میں وؔلی نے اس زبان پر کس طرح قدرت حاصل کر لی، جو صدیوں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب بھی بالکل تازہ اور آج کے معیاری لب و لہجے سے ہم آہنگ ہے۔

وؔلی سے پہلے کی اردو شاعری بالخصوص غزل میں دو رنگ ملتے ہیں۔ ایک وہ جس میں فارسی مضامین و موضوعات، اور فارسی تشبیہات و استعارات کی جھلک شاذ و نادر دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بہترین نمائندگی قلی قطب شاہ کے کلام سے ہوتی ہے۔ دوسرا رنگ وہ ہے جس میں فارسی کے متذکرہ بالا عناصر قابل لحاظ حد تک اپنا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اس کی سب سے عمدہ مثال حسن شوقؔی کی غزلیں ہیں۔ ان دونوں رنگوں کے مشاہدے کے لئے قلی قطب شاہ اور حسن شوقؔی کی غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

پیا کے نین میں بہوت چھند ہے ‏ ‏ ‏ ‏ او دو زلف میں جیو کا آنند ہے
سجن یوں مٹھائی سوں بولے بچن ‏ ‏ ‏ ‏ کہ اس خوش بچن میں لذت قند ہے
موہن کے او دوگال تشبیہہ میں ‏ ‏ ‏ ‏ سورج ہور دو جاسوجوں پھند ہے
نول مکھ، سوہے حسن کا پھول بن ‏ ‏ ‏ ‏ نین مرگ ہور زلف اس پھیند ہے
اوکسوت تے جیو باس مہکے سدا ‏ ‏ ‏ ‏ تو اوباس ناریاں کا دلبند ہے

قلی قطب شاہ کی یہ پوری غزل فارسی تشبیہات و استعارات اور فارسی میں مروج و مستعمل شعری تلازمات سے خالی ہے۔ اب شوقؔی کی غزل ملاحظہ ہو :

[illegible] زلیخا ہو رہی، تجہ یوسف ثانی سبب ‏ ‏ ‏ ‏ کاٹیا اُپس کو چاند نے، تجہ سور نورانی سبب
مکہ [illegible] کا دریا اہے، اَمّا نمک بھریا اہے ‏ ‏ ‏ ‏ جگ شور میں پڑیا اہے، تجہ لب نمک دانی سبب
یا زلف یا تحریر ہے، یا دام عالمگیر ہے ‏ ‏ ‏ ‏ یا سحر کی زنجیر ہے، جگ کی پریشانی سبب
ہر اک بھنواں [illegible] جیون طاق ہے، عالم ترا مشتاق ہے ‏ ‏ ‏ ‏ نے جفت اتا طاق ہے، نیری جہاں بانی سبب

از بسِ پرت کا طوق سوں، الجھا ہے جیو، جم ذوق سوں   شوقی ہوا ات شوق سوں تیری ثنا خوانی سبب

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شوقی کی یہ غزل از اول تا آخر نہایت رواں اور مرصع ہے۔ داخلی قوافی کے اہتمام نے اس کی موسیقیت اور حسن میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں بعض فارسی تشبیہات و استعارات بھی موجود ہیں، لیکن اول تو یہ عناصر اس میں بہت کم ہیں۔ دوسرے بعض افعال کی قدیم شکلیں مثلاً کا یا، پڑیا، اہے اور بعض جملوں کی قدیم نحوی ساخت اسے قدامت کے دائرے سے باہر نہیں آنے دیتیں۔ اب ولی کی غزل دیکھیں:

روح بخشی ہے کام تجھ لب کا   دمِ عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

حسن کے خضر نے کیا لب ریز   آب حیواں سوں جام تجھ لب کا

منطق و حکمت و معانی پر   مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

جنت حسن میں کیا حق نے   حوض کوثر مقام تجھ لب کا

رگِ یاقوت کے قلم سوں لکھیں   خط پرستاں پیام تجھ لب کا

سبزہ و برگ و لالہ رکھتے ہیں   شوق دل میں دوام تجھ لب کا

غرق شکر ہوئے ہیں کام و زباں   جب لیا ہوں میں نام تجھ لب کا

مثل یاقوت خط میں ہے شاگرد   ساغر مے مدام تجھ لب کا

ہے ولی کی زباں کو لذت بخش   ذکر ہر صبح و شام تجھ لب کا

ظاہر ہے کہ اس غزل کی فضا اور رنگ آہنگ قطب شاہ اور شوقی دونوں کی غزلوں سے مختلف ہے۔ یہاں فارسی مرکبات، فارسی تلمیحات، فارسی تشبیہات، استعارات اور فارسی طرز احساس کا غلبہ نظر آتا ہے۔ زباں کے قدیم عناصر بہ شمول اسما و افعال معدوم ہیں۔ جملوں کی نحوی ساخت بھی جدید ہے۔

ولی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے شعر سازی کے اس طرز کو اردو میں رواج دیا، جسے ہم سبک ہندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طرز اس زمانے کے ایرانی و ہندی فارسی گویوں میں بہت مقبول تھا۔ اس طرز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استعارات، حقائق میں اور حقائق استعارات میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ پیچیدہ بیانی کی گرہیں باعث

انبساط واہتزاز ہوتی ہیں۔ الفاظ کے تہہ بہ تہہ تلازمات وانسلاکات سے نئے نئے مضامین و معانی کی تخلیق وتولید ہوتی ہے۔ اس پہلو سے ولی کی مندرجہ بالا غزل کو دوبارہ دیکھیں۔

اس غزل میں لب معشوق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے لئے شاعر نے نو (۹) استعارے استعمال کیے ہیں۔ یہ لب روح بخش ہیں، دمِ عیسیٰ ہیں، آب حیات ہیں، حوض کوثر ہیں، تحریر خوشخط ہیں، شگفتہ و شاداب ہیں، شیریں ہیں، ساغرِ مے ہیں اور لذت بخش ہیں۔ اب چونکہ ہر استعارہ بمنزلۂ حقیقت بھی ہے، لہذا شاعر کے لیے یہ گنجائش پیدا ہوگئی کہ وہ ایک ہی لب کو نو (۹) حقیقتوں کی طرح پیش کرے۔ ظاہر ہے کہ ہر حقیقت اپنا الگ وجود اور شناخت رکھتی ہے اس لئے ایک ہی چیز کی بار بار توصیف وتحسین طبیعت پر گراں گذرنے کے بجائے ایک طرف حظ آفرینی کا ذریعہ بن جاتی ہے اور دوسری جانب مضامین تازہ کی راہ کھلتی چلی جاتی ہے۔

۱۔ روح بخشی ہے کام تجھ لب کا دمِ عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا

پہلے شعر میں لب، روح اور دم عیسیٰ کو جمع کیا گیا ہے۔ لب اور روح میں رشتہ یہ ہے کہ لبوں کی جنبش روح کی موجودگی کی علامت ہے۔ لب اور دم عیسیٰ میں ربط یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ لبوں کی جنبش سے پھونک مارتے تھے۔ خود حضرت عیسیٰ کی تخلیق فرشتے کی پھونک ہی سے ہوئی تھی۔ لہذا لب، روح، دم، عیسیٰ سب باہم دگر پیوست ہیں۔

۲۔ حسن کے خضر نے کیا لبریز آب حیواں سوں جام تجھ لب کا

دوسرے شعر میں لب آب حیات ہیں۔ آب حیات کے ساتھ خضر کا تصور وابستہ ہے۔ خضر آب حیات پیتے ہیں اور پلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح جام کا جواز پیدا ہوگیا۔ جام لبریز بھی ہوتا ہے، چونکہ ذکر لب کا ہے لہذا لب اور لب ریز میں ایہام کا لطف حاصل ہو رہا ہے۔ گویا لب جام ہیں اور جام لب۔

۳۔ منطق وحکمت و معانی پر مشتمل ہے کلام تجھ لب کا

تیسرے شعر میں لب کو منطق وحکمت و معانی کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ لب آلۂ نطق بھی ہیں اور ذریعۂ اظہار بھی۔ لہذا حکیمانہ مسائل کی شرح اور

بیان کا جادو جگانا بھی انھی کا کام ہے۔ معانی فنون بلاغت کی ایک قسم ہے اور بلاغت لبوں کے بغیر مقصود نہیں ہو سکتی۔

۴۔ جنت حسن میں کیا حق نے حوض کوثر مقام تجھ لب کا

چوتھے شعر میں لب حوض کوثر، جنت حُسن اور حق کے ساتھ آیا ہے۔ ان میں مناسبت یہ ہے کہ اب معشوق حوض کوثر کی تشنگی بجھاتے ہیں، حوض کوثر راہِ جنت میں، جنت کا فیصلہ حق تعالی کے حکم سے ہوگا، جنت آراستہ ہے، حُسن بھی آرائش چاہتا ہے۔

۵۔ رگِ یاقوت کے قلم سوں لکھیں خط پرستاں پیام تجھ لب کا

پانچویں شعر میں لب خط، پیام، یاقوت، قلم اور رگ کے ساتھ آیا ہے۔ ان میں ربط یہ ہے کہ لب پر خط یعنی بال آجاتے ہیں۔ خط کے ایک معنی مکتوب کے بھی اور ہر مکتوب پیام لاتا ہے۔ لہذا خط کے ساتھ پیام کو بھی نسبت ہے۔ اس کے علاوہ خط مطلق تحریر کو بھی کہتے ہیں۔ اس سے ذہن خطاط یعنی کاتب کی طرف چلا جاتا ہے اور کاتبوں میں یاقوت مستعصمی شہرہ آفاق ہے۔ کاتب کو قلم چاہیے۔ لہذا خط، یاقوت اور قلم مربوط ہو گئے۔ یاقوت ایک قیمتی پتھر بھی ہے۔ پتھر میں رگیں ہوتی ہیں۔ اس طرح رگِ یاقوت کا قلم وجود میں آ گیا۔ پیام رسانی کا ذریعہ لب بھی ہیں اور خط بھی۔ اس لئے لب، خط، پیام سب ایک دوسرے کا استعارہ بھی ہیں اور حقیقت بھی۔

۶۔ سبزہ و برگ و لالہ رکھتے ہیں شوق دل میں دوام تجھ لب کا

چھٹے شعر میں لب سبزہ، برگ، لالہ اور شوق کے ساتھ آیا ہے۔ ان کا ربط ظاہر ہے۔ لب شگفتہ بھی ہیں، نازک بھی اور سرخ بھی۔ لہذا یہ سبزہ بھی ہیں، برگ بھی اور لالہ بھی۔ ان کی طرف شوق اور میلان فطری ہے۔

۷۔ غرق شکر ہوئے ہیں کام و زباں جب لیا ہوں میں نام تجھ لب کا

ساتویں شعر میں لبوں کو شیریں کہا گیا ہے۔ شیرینی کا احساس کام و زباں سے ہوتا ہے۔ لہذا لب، کام، زباں اور شکّر باہم مربوط ہو گئے۔

۸۔ مثلِ یاقوت خط میں ہے شاگرد ساغرِ مے مدام تجھ لب کا

آٹھویں شعر میں لب خط، ساغرِ مے، یاقوت اور شاگرد کے ساتھ آیا ہے۔ ان میں ربط یہ ہے کہ خط کا تعلق لب اور ساغرے دونوں سے ہے۔ اسی طرح مستی کا ذریعہ ساغرِ مے بھی ہیں اور لب بھی۔ پھر لب ساغر کے لئے بھی ہوتا ہے۔ اس طرح لب، خط، ساغر کئی جہتوں سے باہم مربوط ہیں۔ دوسری جانب خط کا تعلق یاقوت کاتب سے بھی ہے، جو استاد ہیں۔ یاقوت شاگرد رکھتا تھا تو ساغرِ مے بھی لب معشوق کا شاگرد ہے۔

۹۔ ہے ولی کی زباں کو لذت بخش ذکر ہر صبح و شام تجھ لب کا

مقطع میں لب، زباں، لذت، ذکر اور صبح و شام کے ساتھ آیا ہے۔ ان کا ربط بھی ظاہر ہے۔ لب زبان سے متصل ہیں اور زبان ہی لذت کا احساس کرتی ہے۔ لذت کسی کے ذکر میں بھی ہوتی ہے اور خود ذکر کا ذریعہ زبان و لب ہیں۔ ذکر تصوف کی اصطلاح بھی ہے۔ صوفیا معمولاً صبح و شام زبان و لب سے مصروف ذکر رہتے ہیں۔ اس ذکر میں انھیں خاص لذت ملتی ہے۔

اوپر کے دو اشعار میں لب کو دو الگ الگ انداز سے خط کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ اس پر راقم کو خیال آیا کہ دیکھا جائے کہ ولی نے خط کے ساتھ اور کس کس طرح کے تلازمات قائم کیے ہیں۔ کلیات کی سرسری ورق گردانی کے دوران جو اشعار سامنے آئے ان کی تعداد ۶۳ تک پہنچتی ہے۔ متفرق اشعار کے علاوہ ان میں دو غزلیں بھی ہیں، جن کا ہر شعر مضمون خط پر قائم ہے۔ یقین ہے کہ بنظر غائر دیکھا جائے تو اس طرح کے اشعار کی تعداد سو سے متجاوز ہو جائے گی۔ میں نے یہاں صرف ۲۴ شعر بہ طور انتخاب نقل کیے ہیں۔ انتخاب کی اساس یہ ہیکہ ہر شعر میں مضمون کا کوئی نیا پہلو سامنے آئے۔ اشعار ملاحظہ ہوں :

جاری ہوئے آنسو مرے یو سبزۂ خط دیکھ اے خضر قدم! سیر کر اس آب رواں کا

دیکھ اے اہل نظر سبزۂ خط میں لب لعل رنگ یاقوت چھپا ہے خط ریحان میں آ

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن مطوّل کے معانی کا تمامی مدعا دستا

نشۂ سبزیِ خطِ خوباں والیِ عالم خیال ہوا

سنبل پڑا ہے دام میں تجھ زلف کے اے گل بدن تجھ خط کی خوبی دیکھ کر فرماں میں نافرماں ہوا

سبز بختوں میں اسے لکھتے ہیں — وصف تجھ خط کے جو تحریر کیا

ترا خط خوف میں ہے ہاتھ سوں مقراض کے دائم — کہ جیوں رکھتا ہے کودک دہشتِ استاد ہر ساعت

روایت خضر سے پہنچی ہے مجھ کوں — کہ اس کا خط ہے موج آب یاقوت

یاد تجھ خطِ سبز کی اے شوق ! — زخم دل پر ہے مرہمِ زنگار

نہ جانوں خط ترا کس بے خطا پر — چلا ہے آج فوجِ شام لے کر

خط نہیں آغاز تجھ رخسار کے یہ آس پاس — حسن کے لینے کو یو آئے ہیں استقبال بال

تیرے لب یاقوت اُپر خط خفی دیکھ — خطّاطِ جہاں نسخ کیے خط جلی کوں

یاقوت کو ہے قوت ترے خط کی محبت — ہے دل میں غبار اس کے سبب میر علی کوں

اعجاز ترے اس خطِ روشن کا سر تجمن ! — جوں خط شعاعی ید بیضا یہ لکھا ہوں

خط کے آنے نے خبردار کیا گلرو کوں — نشۂ ہوش ہے اس بادۂ ریحانی میں

خط کا آخر کو ہوا رخ پہ پری رؤ کے گذر — مور کو راہ ملی ملکِ سلیمانی میں

اے وؔلی! شہر حسن کے اطراف — خط سوں اس کے حصار دالے ہیں

تجھ مکھ پہ جو اس خط کا اندازہ ہوا تازہ — اب حسن کے دیوان کا شیرازہ ہوا تازہ

سیاہی خط شب رنگ سوں مصورِ ناز — لکھا نگار کے لب پر نگارِ خاموشی

یاد کرتی ہے خط کوں زلفِ صنم — کام ہندو کا بید خوانی ہے

جب سوں تو خطِ گلرو، جلوہ گر ہے گلشن میں — سبزہ کہربائی ہے، رنگِ گل خزانی ہے

شاہِ خوباں کے سبزۂ خط پر — حُسن کی فوج کی سیاہی ہے

دودِ آہِ شوقِ مشتاقاں نہیں — خط نہیں یہ حُسن کا آغاز ہے

نہ بخشے کیوں ترا خط زندگانی — کہ موجِ چشمۂ آبِ بقا ہے

ان اشعار کے حوالے سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ کسی ایک لفظ کے تلازمات و انسلاکات سے نئے نئے مضامین پیدا کرنا اردو شاعری بالخصوص کلاسیکی اردو غزل کا امتیاز ہے۔ یہ فن وؔلی سے پہلے کے اردو شعرا کو نہیں آتا تھا۔ وؔلی اردو میں اس کے موجد اور بانی ہیں۔ سبکِ ہندی کے ایرانی و ہندوستانی شعرا کو پڑھتے سب تھے، لیکن ان کے طرز کو اردو

کے قالب میں ڈھالنے والے وؔلی ہیں۔ یہ ایسا محیر العقول کارنامہ تھا جو ہندوستانی زبانوں میں صرف اردو میں انجام دیا گیا اور جسے صرف اور صرف وؔلی نے انجام دیا۔ اسی لیے شمالی ہند کے شعرا نے ان کے آگے سرِتسلیم خم کر دیے۔

ہمارے زمانے میں بعض ادبی اور غیر ادبی حلقوں کی جانب سے بہ طورِ اعتراض یہ کہا جاتا ہے کہ اردو نے مقامی زبانوں اور ادبیات سے رخ موڑ کر فارسی زبان و ادب سے اپنا رشتہ استوار کر لیا۔ یہ ایک بنیادی غلطی تھی۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس قسم کے اعتراضات کا باعث و منشا کم علمی اور بے خبری ہے۔ صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ اردو کو دینے کے لیے کچھ بچا نہ تھا۔ اس لئے اردو کا فارسی کی طرف متوجہ ہونا فطری بھی اور مقتضاے حال و وقت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وؔلی نے پیرویِ فارسی کا جو راستہ دکھایا اسے فی الفور رواج اور قبولِ عام نصیب ہوا۔ چنانچہ دکن میں سرؔاج اور شمال میں آبؔرو و ناؔجی وغیرہ اسی راہ پر چل پڑے۔ پھر آگے چل کر اسی کو شاہراہِ عام کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

آخر میں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ موضوع و مواد اور زبان و بیان کے لحاظ سے وؔلی کے ہاں اور بھی کئی رنگ ملتے ہیں اور یہ بھی ان کی ایک شناخت ہے کہ وہ ہر رنگِ سخن پر قادر ہیں۔ چنانچہ ان کے یہاں تصوف بھی ہے اور جنس بھی۔ ان کی غزلوں میں متکلم مرد بھی ہے اور عورت بھی۔ خطاب وہ کبھی مرد سے کرتے ہیں اور کبھی عورت سے۔ لیکن ہمارے نزدیک وؔلی کو شعرالشعراء بنانے والے عناصر وہی ہیں، جن کی نشان دہی ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ ان عناصر کو تفہیم کی خاطر الگ الگ پیش کیا گیا ہے، لیکن درحقیقت وؔلی کی شاعری میں ان کا ظہور ایک وحدت کے طور پر ہوا ہے۔ اسی سرمایۂ ایجاد میں وؔلی کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔

۱۷

شیخ نورالدین احمد بن عبداللہ الطاؤسی الشیرازی اور رسالۂ اخلاق سلطانی

- پروفیسر محبوب حسین احمد حسین عباسی
(رفیق۔حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمدآباد)

احمدآباد کے کتاب خانہ درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے ذخیرۂ کتب میں حال ہی میں شیراز کے نویں صدی ہجری (پندرہویں صدی عیسوی) کے عالم، محدث، مصنف، عربی، فارسی کے شاعر اور صوفی شیخ نورالدین احمد بن عبداللہ ابی الفتوح الطاؤسی کے تین فارسی رسالوں پر مشتمل ایک مجموعہ[۱] دستیاب ہوا ہے جو ادبی، لسانی، دینی اور تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ تینوں رسالے مصنف کے خط میں ہیں جس سے ان کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ قیاس یہ ہے کہ شیخ احمد طاؤسی جب گجرات تشریف لائے تھے تو یہ مخطوطہ بھی اپنے ساتھ ہی لائے ہونگے۔

ہندوستان کے مؤرخین میں سے حکیم عبدالحیؒ نے اپنی مشہور عربی تصنیف نُزھة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر عرف الاعلام بمن فی تاریخ الهند من الأعلام[۲] میں قدرے تفصیل سے اور اردو مقالہ یادایام[۳] میں مختصر طور پر مختلف عنوانات کے تحت شیخ احمد طاؤسی کے حالات درج کئے ہیں۔

شیخ احمد بن عبد اللہ بن ابی الفتوح ابن أبی الخیر بن عبد القادر الحکیم الطاؤسی الشیرازی عالم اور عارف تھے۔ آپ نے سید شریف جرجانی، شیخ شمس الدین محمد بن

الجزری، شیخ مجد الدین فیروز آبادی جیسے محقق علماء سے علم حاصل کیا تھا اور صحیح بخاری کو بابا یوسف الھروی سے پڑھا تھا۔ شیخ احمد کی صحیح بخاری کی سند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ باعتبار قلت وسائط کے اتنی عالی تھی کہ جب وہ سند حجاز ویمن پہنچی ہے تو وہاں کے بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق اور رغبت سے حاصل کیا اور اس پر ہمیشہ فخر کرتے رہے۔ آپ سہروردیہ، کبرویہ، نعمۃ اللہ اور نقشبندیہ سلسلوں کے علاوہ شیخ محمد بن علی الملاسانی کے ہاتھ پر طاؤس الحرمین شیخ ابی الخیر کے سلسلۂ طاؤسیہ میں بھی بیعت ہوئے تھے۔ حکیم عبدالحیؒ کا گمان ہے کہ لی سلسلۂ نقشبندیہ سب سے پہلے گجرات میں شیخ نورالدین احمد الطاؤسی کے ذریعہ سے پہنچا ہے۔ شیخ طاؤسی نے اپنے فارسی رسالوں کے ترقیموں میں اپنے آپ کو الاحمدی اور المرشدی بھی لکھا ہے[۴]۔

حکیم عبدالحیؒ نے یاد ایام میں، گجرات میں محدثین کی تشریف آوری کے عنوان کے تحت بتایا ہے کہ مولانا نورالدین احمد شیرازی غالباً سلطان احمد شاہ اول کے عہد میں گجرات تشریف لائے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے: (۱) قطف الثمر ولطف السمر فی اعیان القرن الحادی عُشر تصنیف نجم الدین غزّی (۲) حصر الشارد (۳) الیالغ الجنی۔ گو شیخ نورالدین احمد کی گجرات میں آمد کی تفصیلی معلومات دستیاب نہیں ہیں لیکن چند اور شواہد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ حکیم عبدالحیؒ ہی کے بیان کے مطابق گجرات کے علامہ علاء الدین ابو العباس احمد بن محمد النہروالی نے آپ سے احادیث کو روایت کیا تھا اور شیخ عبداللہ بن محمود الحسینی البخاری الگجراتی نے آپ سے خرقہ حاصل کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ شیخ نورالدین احمد الطاؤسی کے نواسے سید ھبت اللہ[۵] بن عطاء اللہ الحسینی الشیرازی جو ۸۹۸ھ/۱۴۹۳ء میں اول گجرات کے تاریخی شہر چانپانیر عرف محمد آباد میں اور بعد میں پایۂ تخت احمد آباد میں بس گئے تھے اور جو شاہ میر کے نام سے مشہور ہوئے۔ انہوں نے شیخ نورالدین احمد طاؤسی سے احادیث بھی نقل کیں اور خرقہ بھی حاصل کیا تھا۔ ان کے علاوہ آپ کے نو دریافت شدہ مجموعۂ رسائل میں آخری ورق ۵۴ کے صفحہ ب پر ایک عبارت درج ہے جس کا بیشتر حصہ پانی لگنے سے مٹ گیا ہے لیکن ایک سطر میں کسی نام کے

ساتھ یہ الفاظ الدھلوی الگجراتی سلم اللہ پڑھے جا سکتے ہیں جو گجرات کے لوگوں کے ساتھ آپ کے تعلقات پر دلالت کرتے ہیں۔ شیخ طاؤسی کے نواسے سید ھبت اللہ شاہ میر کے پوتے میر ابوتراب ولی۶؎ نے شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں بڑا مقام حاصل کیا تھا اور فارسی میں تاریخ گجرات بھی تصنیف کی تھی۔ انہی ابوتراب ولی کے خاندان کے لوگ احمد آباد سے کھمبایت منتقل ہوگئے تھے جہاں وہ اب تک آباد ہیں اور جن کے پاس خاندانی شجرہ بھی موجود ہے۔ اس طرح شیخ طاؤسی کے گجرات کے ساتھ تعلقات دائمی طور پر قائم ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

مذکورۂ بالا جزوی معلومات کے علاوہ شیخ احمد طاؤسی کے دیگر حالات مثلاً آپ کی ولادت، وفات، ایران اور گجرات میں آپ کے قیام کا زمانہ وغیرہ کے بارے میں تاریخیں خاموش ہیں۔ صرف اتنا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ایران کے فرمان روا سلطان شاہ رخ مرزا (عہد سلطنت ۸۰۷ھ تا ۸۵۰ھ/ ۱۴۰۵ء تا ۱۴۴۷ء) اور گجرات کے مظفری خاندان کے حکمراں سلطان احمد شاہ اول (عہد سلطنت ۸۱۴ھ تا ۸۴۵ھ/ ۱۴۱۱ء تا ۱۴۴۲ء) کے ہم عصر تھے۔ آپ کے خودنوشت فارسی رسالوں کے ترقیموں میں درج شدہ تالیف اور کتابت کی تاریخوں: ۸۲۸، ۸۳۰، ۸۳۱ اور مقام کتابت کرمان اور شیراز کے اندراج سے ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ آپ نویں صدی ہجری کی ایک برگزیدہ شخصیت تھے۔

شیخ نورالدین احمد طاؤسی ایران کے تیموری سلسلہ کے سلطان شاہ رخ مرزا کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے اور شاہ میں پائی جانے والی صفات کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے متعلق ایک مفصل رسالہ بنام اخلاق سلطانی تصنیف کیا تاہم یہ پتہ نہیں چلتا کہ سلطان شاہ رخ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں۔

آپ کے ہم عصر اور بعد کے بہت سارے عالموں نے آپ سے حدیثیں روایت کی ہیں نیز آپ کے نو دریافت شدہ رسالہ اخلاق سلطانی میں آپ نے چالیس معتبر احادیث کو جمع کیا ہے، اس کے علاوہ آپ نے اپنے رسالوں میں قرآن کریم کی بیسیوں آیتوں کو مع ان کے معنی و مفہوم کے نقل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ عالم حدیث بھی تھے اور عالم

قرآن بھی۔ حکیم عبدالحیؒ نے آپ کو امام حدیث اور حافظ قرآن کے القابات کے ساتھ یاد کیا ہے۔

آپ کے رسالوں میں آپ کے کہے ہوئے اعلیٰ معیار کے عربی و فارسی اشعار بھی شامل ہیں جن میں عربی و فارسی میں الگ الگ نعتیہ قصیدے اور کئی نصیحت آموز قطعات بھی شمار ہوتے ہیں جن پر بحث آگے ان رسائل کے بیان میں آئے گی۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ نور الدین احمد طاؤسی ایک بلند درجہ شاعر بھی تھے۔ جہاں آپ کے اشعار دلچسپ ہیں وہیں آپ کی نثر اور ساتھ میں آپ کا خط بھی جاذب نظر ہے۔

حکیم عبدالحیؒ نے آپ کے نام کے ساتھ ابی الفتوح اور الطاؤسی کی نسبتیں جوڑی ہیں لیکن خود شیخ نے اپنے دو رسالوں کے ترقیموں میں مذکورۂ بالا دو کے علاوہ اپنے آپ کو الاحمدی اور المرشدی بھی لکھا ہے۔

شیخ نور الدین احمد الطاؤسی کے اسفار: حکیم عبدالحیؒ نے شیخ کو العالم، المحدث اور الصوفی کے علاوہ الرَحّالہ کے لفظ سے بھی یاد کیا ہے جس کے معنی بہت زیادہ سفر کرنے والے کے بھی بتائے گئے ہیں۔ آپ نے اپنے رسالہ اخلاق سلطانی میں سلطان شاہ رخ مرزا کے زیر حکومت علاقوں میں امن و امان کی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے یہ تحریر کیا ہے کہ انہوں نے عرب و عجم میں دو ہزار فرسخ کا سفر کیا تھا اور انہیں کسی رفیق سفر کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی ۸۔ بعید نہیں کہ انہی اسفار کے دوران وہ گجرات بھی آئے ہوں۔

تصانیف

حکیم عبدالحیؒ نے بتایا ہے کہ ''ولہ مصنفات ممتِعة ''۔ ممتَعہ کے معنی دلچسپ تصنیفات Enjoyable works کے ہوتے ہیں۔ لیکن شیخ کے صرف ایک رسالہ کا ذکر کیا ہے جس کا نام ''رسالة جمع الفرق لرفع الخرق '' ہے اور بتایا ہے کہ شیخ صفی الدین احمد القشاشی المدنی نے اس کا ذکر السمط المجید میں کیا ہے۔ خود شیخ نے رسالہ اخلاق سلطانی کے ورق ۳۰ ب کے حاشیہ میں اپنی ایک کتاب خزانة اللآء لی کا نام بتایا ہے۔ یہ

دونوں نایاب ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں کوئی رای قائم نہیں کی جاسکتی۔

کتاب خانہ درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہؒ، احمد آباد میں محفوظ شیخ نور الدین احمد الطاؤسی کے قلمی مجموعۂ رسائل میں ۵۴ اوراق پر مشتمل تین رسالے ہیں۔ تینوں کی زبان فارسی ہے۔ اس کے ورق ایک الف پر یہ تحریر درج ہے: ''مجموعۂ حضرت...... ولایت پناہ شیخ الشیوخ نور الدین..... الفتوح قدس سرہ العزیز بخط قدس سرہٗ''۔ اس تحریر کے چند حروف مٹ گئے ہیں۔ اس کے قریب ہی خوبصورت مدور مہر ہے جو کوشش کے باوجود پڑھی نہیں گئی۔ اس میں پہلا رسالہ ورق ایک۔ب سے ورق ۳۶۔الف تک، دوسرا رسالہ ورق ۳۶۔ب سے ورق ۴۲۔الف تک اور تیسرا رسالہ ورق ۴۲۔ب سے ورق ۵۳۔ب تک کے صفحات پر منحصر ہے، جبکہ آخری ورق ۵۴۔الف وب پر اہم تحریرات واشعار درج ہیں۔

سب سے پہلے رسالہ کا نام اخلاق سلطانی ہے جو خود مصنف کا دیا ہوا ہے اور جس کا ذکر متن میں موجود ہے[۹]۔ یہ عجیب وغریب رسالہ مصنف کے ہم عصر سلطان شاہ رخ کے چند اوصاف حمیدہ کو اُجاگر کرنے کی غرض سے لکھا گیا تھا۔ شروع میں حسب معمول حق سبحانہ وتقدس کی بارگاہ میں حمد وثنا اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں تعریفی کلمات تحریر کرنے کے بعد بادشاہ وقت کی پرزور مدح سرائی کی ہے۔

شیخ احمد الطاؤسی یوں رقم طراز ہیں: آن بادشاہ دین پرور وآن سلطان داد گستر.... معین السلطنت والدنیا والدین المختص بعنایۃ الملک المنان شاہ رخ بہادر خان......

پناہ خلق جہاں بادشاہ ہفت اقلیم ...... معین دولت ودین سایۂ خدا شہ رُخ[۱۰].... بادشاہی عادل، کامل، مشفق، منفق، رحیم، حلیم، بردبار، نیکوکار[۱۱]..... آگے ان خصائل کے بارے میں لکھتے ہیں: وآن حضرت گردون رتبہ را..... چہار صفت پسندیدہ وخصلت برگزیدہ..... از حضرت حق سبحانہ کرامت گشتہ کہ درآن ہر چہار تخلق باخلاق نبویؐ واتصاف باوصاف مصطفویؐ حاصل آمدہ[۱۲]۔

دراصل بادشاہ کے اخلاق، رسول اللہؐ سے متصف ہیں، یہی حقیقت اس رسالہ کی تصنیف کا سبب ہے۔ اس کے بعد جو چار خصلتیں شمار کی ہیں ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

(۱) جن علاقوں میں اسلام کی اشاعت ہوئی ہے وہاں شریعت کے احکام کے نفاذ کے لئے بادشاہ کی تلوار چمکتی رہتی ہے۔ (۲) حضورؐ کے اخلاق کی پیروی میں مسلمانوں کے ساتھ عفو و درگذر کا معاملہ فرماتے ہیں۔ (۳) حکومت کی مشغولی کے باوجود دن میں روزہ اور شب میں آہ وزاری عادت شریفہ ہے۔ لوگوں کے ساتھ حاجت روائی اور غم گساری کا معاملہ رہتا ہے۔ (۴) عوام کے لئے عطایا کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔[۱۳]

ان چار خصلتوں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بندہ کو حق سبحانہ کی حفاظت میں رکھتی ہیں اور دراصل یہ ''عظایم اوصاف محمدیؐ'' اور ''غنایم اخلاف احمدی'' میں سے ہیں۔ ان خاص اخلاق کی فضیلت میں بے شمار حدیثیں ہیں (جو عربی میں ہیں)۔ شیخ طاؤسی چاہتے ہیں کہ ان کو ''بہ سمع اشرف اعلیٰ'' پہنچائیں، اس کے لئے ان کو فارسی میں ترجمہ کریں جو سمجھنے میں آسان ہو اور ان اخلاق حمیدہ کے حصول کی حرص پیدا ہو[۱۴]۔ متعلقہ احادیث میں سے شیخ طاؤسی نے چالیس کو چُنا اور بیان کیا ہے تاکہ اس حدیث: ''جو شخص میری امت کے لئے ان کے دینی امور میں چالیس حدیثیں محفوظ کریگا، حق تعالیٰ شانہ اس کو قیامت میں عالم اٹھائے گا اور میں اس کے لئے سفارشی اور گواہ بنوں گا'' کی بشارت سے مستفیض ہوں۔

جناب رسول اللہ کی چار صفتوں کو بیان کرنے کے لئے جن کا پرتو سلطان شاہ رُخ کی ذات میں نظر آتا ہے، مصنف نے اس رسالہ کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے: (۱) باب اول در سلطنت وحکومت وھیبت وحشمت حضرت سلطانِ سریرِ رسالت وپیغمبری، شھسوار میدان ایالت وسروری صلی اللہ علیہ وسلم (۲) باب دوم در اخلاق کریمہ واوصاف حمیدہ آن حضرتؐ۔ (۳) باب سوم در اہتمام آن حضرتؐ بگزاردن حاجات امت۔ (۴) باب چہارم در بذل وعطا وجود وسخا آن حضرتؐ۔

مصنف نے ان چاروں ابواب میں سے ہر باب کے مذکورہ بالا عنوان کی رعایت سے تمہید میں موضوع کی مفصل وضاحت کی ہے اور ہر باب میں دس دس حدیثوں کا عربی متن راویوں کے نام کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ہر حدیث کا فارسی میں مفصل

ترجمہ ومفہوم لکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جدّت یہ کی ہے کہ ہر حدیث کے فارسی ترجمہ کے ختم ہونے پر، اُس حدیث کے موضوع سے مناسبت رکھنے والے نعتیہ شعر کہے ہیں۔ ہر حدیث کے اختتام پر اس طرح کا ایک عربی اور ایک فارسی شعر ایک ہی وزن اور ایک ہی قافیہ وردیف میں آیا ہے۔ یہ تمام اشعار مل کر چالیس اشعار کے ایک عربی نعتیہ قصیدے اور چالیس اشعار کے فارسی نعتیہ قصیدہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ فارسی قصیدہ کا پہلا اور آخری شعر حسب ذیل ہے:

آن رسولی کہ بر آورد زکفار دمار　　چتر وی ابر و جنودش مَلَکِ روحانی
احمؔد اگرچہ متاعت نبودٗ در خور وی　　لیکن این قصہ بہ از ہر چہ تو آن برخوانی

رسالہ میں نقل شدہ حدیثوں کے ذریعہ مصنف نے رسول مقبولؐ کے بہترین اخلاق کی مثالیں پیش کی ہیں جو ہمیشہ قابل اتباع رہی ہیں۔ نمونہ کے طور پر باب دوم کی دو حدیثوں کا خلاصہ اور مفہوم لکھا جاتا ہے۔ اس باب کی چھٹی حدیث میں حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں دس سال رہا۔ آپؐ نے کبھی دل آزاری یا سخت بات نہیں کہی۔ اگر میں نے کوئی ایسا کام کیا جو آپؐ کی خدمت کے لائق نہیں تھا تو آپؐ نے یوں نہیں کہا کہ کیوں کیا؟ اگر مجھ سے کوئی فروگذاشت ہوگئی تو اس پر مجھ سے باز پُرس نہیں کی۔ دسویں حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام کو فرمایا کہ ای دوست سب کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو کیونکہ میں نے اس بات کا عہد کر رکھا ہے کہ جس کے اخلاق اچھے ہونگے اس کو قیامت میں عرش کے سایہ میں جگہ دونگا اور حضیرۂ قدسی سے پانی پلاؤں گا۔

اس رسالہ میں نقل شدہ تمام چالیس حدیثیں معتبر ہیں اور جلیل القدر صحابہ سے مروی ہیں، مثلاً حضرت عائشہؓ، حضرت ابوھریرہؓ، حضرت انس ابن مالکؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، امیر المؤمنین حضرت علیؓ، امیر المؤمنین حضرت عمرؓ، وغیرہ۔ یہ تمام حدیثیں صرف ایک واسطہ سے نقل کی گئی ہیں۔ شاید اسی لئے شیخ طاؤسی کی اسناد کی قلت وسائط کی قدر دانی کی گئی تھی۔

شیخ طاؤسی کی شعر گوئی:

رسالۂ اخلاق سلطانی میں چالیس چالیس اشعار کے دو عربی و فارسی نعتیہ قصیدوں کے علاوہ شیخ نے عربی اور فارسی میں قطعات اور منفرد اشعار بھی کہے ہیں۔ ان کی تعداد فارسی میں ۴۳ اور عربی میں ۷ کی ہے۔ جب کہ دیگر شعراء کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں فارسی کے ۹ اور عربی کے ۱۲ ہیں۔ شیخ نے یہ خبر بھی دی ہے کہ رسول اللہؐ کے صحابی حضرت زہیرؓ نے بارہ نعتیہ اشعار عربی میں کہے تھے اُس کے جواب میں اُسی وزن اور قافیہ میں شیخ نے بھی بارہ شعر کہے تھے جو ان کی کتاب خزانۃ اللآء لی میں محفوظ ہیں ۱۵۔ علاوہ اس کے شیخ طاؤسی نے ۱۱۲ اشعار میں ان کو فارسی کا جامہ بھی پہنایا تھا۔ تین شعر حسبِ ذیل ہیں:

جانم فدات باد کہ از جان نکوتری — تنہا ترا رسد بہمہ خلق بہتری

منسوخ شد بہ دینِ تو ادیانِ سابقہ — از روی تست روشنی شاہ خاوری

فضل وکمال وجود بہ خلقت کمال یافت

شد ختم بر وجود تو حکم پیمبری

حضرت زہیرؓ نے جنگ حنین کے موقع پر رسول اللہؐ کو مخاطب کر کے عربی میں اور بھی بارہ شعر کہے تھے، شیخ نے ان اشعار کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ پہلا شعر یہ ہے:

ایا رسول خدا منت ز روی کرم — بما بنہ کہ تو امیدگاہ معتبری

شیخ احمد طاؤسی کے نعتیہ فارسی قصیدہ کے بھی بہت سارے اشعار پند ونصیحت آموز ہیں، مثلاً

ساعتی کار خلایق بگزار وعمری — مزد طاعت بستان از کرم یزدانی

گر زرت نیست بہر گونہ مدد باز گیر — روی خوش دار وبالفت بگشا پیشانی

گر نیازی نپذیری زنماز تو چہ سُود — آبرو گر طلبی آتشِ دل بنشانی

کار درویش گر امروز براری رُستی — ورنہ فردا بودت حسرتِ نافرمانی

شیخ احمد طاؤسی کی فارسی نثر ان کی نظم کی طرح سادہ اور رواں ہونے کے ساتھ

ساتھ اپنے اندر خاص اثر رکھتی ہے اور قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ نمونہ کے طور پر شیخ کی زبانی ایک حدیث کا مفہوم نقل کیا جاتا ہے:

''دیدم حضرت پیغمبر را صلی اللہ علیہ وسلم در روز عید قربان کہ در جمرۃ العقبہ سنگ می انداخت در غایت بے تکلفی، باوی نہ حاجب ونہ دربان، نہ مردم را می زدند واز راہ وی دور می کردند، نہ قوتالی می انداختند نہ تازیانہ می افگندند، نہ دور باش پیشا پیش وی کہ مردم را براندنہ برو برو کہ حضرت سلطان می خرامد، مانند یکی از آحاد خلق وافراد مردم اعمال حج می گذارد ومجتنب بود از تکبر وتنعم''۔

مصنف نے فارسی کے چند متروک الفاظ بھی استعمال کئے ہیں، جیسے می شنفشیدند (می شنیدند)؛ کاجکی (کاش کہ)

رسالہ اخلاق سلطانی کے خاتمہ کی دعا بھی قابل ذکر ہے:

''.......... ومجموع خلایق را خاصہ کمترینِ بندگان درگاہ، احمد بن عبد اللہ را از عدل تمام وبذل عامش حظی کامل ونصیبی شامل کرامت نمای وور وقت سکرات وہنگام غمرات، ایمان ہمہ را از وساوس شیطان در امان دار وہمہ را با کمال ایمان بمیران وبا کمال ایمان برانگیزان وور دنیا وعقبیٰ با کمال ایمان دار۔ مصرع: وین دعا راز ہمہ خلق جہان آمین باد۔ ۱۸

ترقیمہ کی عبارت بڑی اہمیت رکھتی ہے جو حسب ذیل ہے ۱۹:

فرغ من تنميق وتاليف محرّره واتم تبييض تصنيف مُسطِره العبد الفقير الى الله احمد بن عبد الله الفتوحى الطاؤسى ثم الاحمدى ثم المرشدى عفا عنهم بيوم الاربعا السادس عشر من جمادى الاول لسنه احدى وثلثين وثمانمايه والحمد لله والصلوة والسلام على محمد رسول الله.

ترقیمہ کی عبارت سے صاف ہے کہ یہ رسالہ خود مصنف کا کتابت کردہ ہے۔ ویسے رسالہ میں اس بات کے اور بھی شواہد موجود ہیں کہ مصنف کا اس رسالہ کا یہ پہلا مسودہ ہے۔ کئی جگہ بلکہ ہر صفحہ پر مصنف نے اپنے قلم سے الفاظ اور عبارتوں میں ترمیم کی ہے یا

فقروں کا اضافہ کیا ہے۔

شیخ احمد الطاؤسی کے زیر بحث مجموعہ رسائل کا دوسرا رسالہ مجہول الاسم ہے۔ اس کی تمہید یا خاتمہ میں یا کسی اور جگہ رسالہ کا نام یا اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

یہ رسالہ، پہلے رسالہ اخلاق سلطانی کے ورق ۳۶۔الف پر خاتمہ اور ترقیمہ کے بعد اُسی ورق کے صفحہ۔ب پر شروع ہو جاتا ہے اور ورق ۴۲۔الف پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں چند دینی امور ذکر کئے ہیں اور وضاحت کے لئے کئی قرآنی آیات کو نقل کیا ہے۔ حمد وصلوات کے بعد ایک مسئلہ کی بحث ہے جو دلچسپ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر حالات سُکر (بے ہوشی) میں کوئی خلافِ شرع بات منہ سے نکل جائے تو اللہ تعالیٰ درگذر کرتے ہیں کیونکہ کسی جذبہ کے غلبہ کی وجہ سے وہ کلمات ظاہر ہوئے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر حالتِ نماز میں اگر مصلّی کی زبان سے کوئی اجنبی لفظ نکل جائے تو وہ نماز باطل ہو جاتی ہے لیکن بے اختیار ایسا ہوا ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت کی خاطر مصنف نے شیخ حاجی امین الدین عبد السلام ججیؒ اور قاضی القضات مولانا رکن الدین یحیٰ فالی کی ایک حکایت درج کی ہے۔ شیخ ججیؒ حالت نماز میں بے اختیار آوازیں نکالتے تھے۔ جب یہ مسئلہ مولانا رکن الدین کے سامنے پیش کیا گیا تو جواب دیا کہ شیخ امین الدین ججیؒ سے ایسا ہوتا ہے تو نماز صحیح ہے کیونکہ غلبۂ حال کی وجہ سے اور بے اختیار ہوتا ہے۔ لیکن اگر ان کے علاوہ کسی سے ایسی بات نماز میں ہو تو اس کی نماز باطل ہے۔ شیخ طاؤسی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگر کسی درویش سے ایسی حرکت صادر ہو تو طعن وتکفیر کے کلمات نہ نکالے جائیں۔

یہ مسئلہ بیان کرنے کے بعد ایک فلسفیانہ بات چھیڑی گئی ہے۔ ایک درویش یہ شعر پڑھا کرتا تھا ۔

ذاتی کہ در آن تصورات ممکن نیست
تصدیق چگونہ بی تصور باشد

یعنی ای اللہ تیری وہ ذات ہے جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا؛ اگر تصور نہیں کیا جا سکتا تو اس

ذات کی تصدیق کس طرح ہو۔ شعر کہنے والے نے تصدیق کو تصور کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ شیخ کے خیال میں یہ منطقی بحث ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ذات کی تصدیق معرفت کے ذریعہ ہی ہوسکتی ہے۔ اس بحث کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ رسول اللہؐ نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر قناعت کی جائے اور تمام کاموں میں احکام شریعت کی پیروی کی جائے کیونکہ اسی میں نجات ہے۔

اس مجہول الاسم رسالہ کا ترقیمہ بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس میں مصنف شیخ طاؤسی نے اس کی کتابت وتالیف کی تاریخ کے علاوہ مقام کا بھی ذکر کیا ہے۔ ترقیمہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

''قُبض العنان من تحقیقه و وقع الفراغ من تنمیقه علی ید مملیه الفقیر الی الله احمد بن عبد الله ابی الفتوح بن ابی الخیر بن عبد القادر الحکیم الطاؤسی ثم الاحمدی ثم المرشدی عفا عنهم۔ فی لیلة السبت التاسع عشر من جمادی الاولی لسنه احدی وثلثین وثمانمایه بداری من بلده شیراز بعد ما املیته ببلدة کرمان صانهما الله عن الحدثان فی غرَة ربیع الاخر لسنه ثلثین وثمانمایه والحمد للهِ والصلوة والسلام علی محمد رسول الله۔''

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مصنف نے کرمان میں ۸۳۰ھ میں اس رسالہ کی تصنیف کی اور شیراز میں ۸۳۱ھ میں اس کی خود کتابت کی۔

اس مجموعہ کا تیسرا رسالہ ورق ۴۲-الف پر شروع اور ورق ۵۳-ب پر ختم ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں بھی پہلے رسالہ کی طرح شیخ طاؤسی کے عربی اور فارسی اشعار پر منحصر قطعات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ قرآنی آیات اور مسنون دعاؤں کے ساتھ ان کا فارسی ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس رسالہ کی ترتیب اس طرح ہے کہ مصنف نے پہلے کسی تاریخی واقعہ کو پیش کیا اور پھر اس موقع کے مطابق دعا نقل کی ہے۔ اس طرح اس رسالہ میں کئی احادیث جمع ہوگئی ہیں۔ ایک بات قابل توجہ یہ ہے کہ طویل دعاؤں کو نقل کرنے کے بعد ان

کا فارسی ترجمہ بین السطور سُرخ روشنائی اور باریک خط میں لکھا ہے۔ سابقہ دو رسالوں کے مقابلہ میں یہاں ترمیم اور اضافہ بہت کم ہوا ہے۔ اس کی بھی کتابت خود شیخ طاؤسی کے خط میں ۸۳۱ھ میں ہوئی ہے۔ جو ترقیمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

ترقیمہ : وقد فرغ من تنميقه بعون الله وتوفيقه جامعه العبد احمد بن عبد اللّه ..... فی السادس والعشرین من جمادی الاول لسنه احدی وثلثین وثمانمایه۔

حواشی

(۱) حضرت پیر محمد شاہؒ درگاہ شریف کتب خانہ، احمد آباد۔ عربی، فارسی، اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست۔ جلد ہفتم کتاب نمبر: 2071۔

(۲) حکیم عبد الحیٰ، الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الأعلام، الجزء الثالث، صفحات: ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰۔

(۳) حکیم عبد الحیٰ، یاد ایام، مطبوعہ دہلی، صفحات: ۷۴، ۷۷، ۹۰، ۹۶، ۹۹۔ حکیم عبد الحیٰ نے شیخ احمد الطاؤسی کے بارے میں معلومات کے لئے نجم الدین غزی کی قطف الثمر ولطف السمر فی اعیان القرن الحادی عشر کا حوالہ دیا ہے۔

(۴) قلمی نسخہ، ورق ۳۶-الف اور ورق ۴۲-الف۔

(۵) هبت اللہ شاہ میر شیرازی کے لئے دیکھئے: حکیم عبد الحیٰ کی سابق الذکر الاعلام، ص ۳۴۶؛ محمد غوثی شطاری کی گلزار ابرار، صفحات ۲۱۵، ۲۱۶؛ پروفیسر محبوب حسین عباسی؛ گجرات کے علمای حدیث وتفسیر، مطبوعہ 2003، حاشیہ نمبر ۱۰۹۔

(۶) میر ابوتراب ولی کی فارسی تاریخ گجرات کا اردو ترجمہ گجرات اردو اکادمی، گاندھی نگر سے 2001 میں شائع ہو چکا ہے۔ هبتہ اللہ شاہ میر، میر ابوتراب ولی اور ان

کے خاندانی حالات کے لئے دیکھئے اسی ترجمہ کا پیش لفظ بقلم پروفیسر جمال الدین شیخ، صفحات XX سے XXV۔

(۷) سلطان شاہ رخ مرزا اپنے باپ امیر تیمور کے برخلاف اعلیٰ انسانی صفات کا مالک تھا اس کو قدیم اور جدید مؤرخین نے تسلیم کرتے ہوئے بیان بھی کیا ہے۔ دولت شاہ سمرقندی رقمطراز ہے: شاہ رخ بہادر..... عدلی بردوام و شفقتی تمام دربارۂ خواص وعوام داشتی..... واز کمال طاعت وعبادت وپاکی طینت واخلاق مرضیہ شاہ رخ سلطان را مقام ومرتبۂ ولایت حاصل بودہ..... لاشک پادشاھی کہ بعدل وداد ورواج شریعت روزگار گذرانیدہ۔ (تذکرۃ الشعراء، سال تصنیف درحدود ۸۹۲ھ، مرتبہ محمد اقبال صافی، مطبوعہ لاہور، صفحات ۲۲۹-۲۳۰) جدید دور کے ایک مؤرخ پرویز عباس کی رای میں: سلطان شاہ رخ پادشاھی بود کریم طبع وشجاع لیکن ہوای نفس وحب جاہ ونام درمزاج نداشت..... علماء را محترم داشتی وتحصیل علم را ترغیب وتحریص نمودی (تاریخ ایران از طاہریان تا عصر حاضر، جلد اول، ص ۱۵۹)۔

(۸) شیخ احمد کے الفاظ حسب ذیل ہیں: ''..... واز آثار معدلتش یکی آنکہ امن واستقامۃ وحضور وسلامۃ بمرتبۂ است کہ در دو ہزار فرسخ از نواحی عرب وعجم کہ این فقیر حقیر پیمودہ واین مقدار جزوی یسیر وبعضی حقیر از ممالک محروسۂ آن حضرت است ہرگز احتیاجی برفیقی نبود''۔ اخلاق سلطانی (قلمی) ورق ۵-الف۔ ایک فرسخ کی میزان ۸ کلومٹر یا ۳ میل بتائی گئی ہے (فیروز اللغات) Steingass نے ۱۸۰۰۰ فٹ لکھے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شیخ نے ۱۶۰۰۰ کلومٹر یا ۶۰۰۰ میل، کُل مل کر سفر کئے تھے۔

(۹) قلمی نسخہ ورق ۷-الف۔ مصنف کی تحریر اس طرح ہے: ''واین رسالہ را اخلاق سلطانی نام کردم''۔ لیکن یہ نام رکھنے سے پہلے مصنف نے تین اور نام تجویز کئے تھے اور ان کو کاٹ دئے گئے ہیں۔ سب سے پہلا نام اخلاق معینی لکھا، اسے کاٹ کر شمسی لکھا اور اسے بھی کاٹ کر فخری لکھا، لیکن کسی نامعلوم وجہ سے آخر الذکر کو بھی

کاٹ کر حاشیہ میں سلطانی لکھا ہے۔

(۱۰) قلمی نسخہ، ورق ۵-الف

(۱۱) قلمی نسخہ، ورق ۵-الف

(۱۲) قلمی نسخہ، ورق ٦-ب

(۱۳) قلمی نسخہ، ورق ۵-ب تا٦-الف

(۱۴) قلمی نسخہ، ورق ٦-ب

(۱۵) قلمی نسخہ، ورق ۳۰-ب کا حاشیہ

(۱٦) قلمی نسخہ، ورق ۲۹-ب

(۱۷) قلمی نسخہ، ورق ۱۳-ب اور ۱۴-الف

(۱۸) قلمی نسخہ، ورق ۳٦-الف

(۱۹) قلمی نسخہ، ورق ۳٦-الف

محبوب حسین احمد حسین عبّاسی
سابق پروفیسر اور صدر شعبۂ فارسی،
اردو اور اسلامی ثقافت
گجرات کالج، احمد آباد، گجرات

۱۸

دیوان ملک عبدالسلام بن عبدالرحمٰن العیدروسی

- پروفیسر نثار احمد انصاری
(رفیق۔ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد)

گجرات زمانۂ قدیم سے ہی فارسی زبان وادب اوردرس وتدریس کا مرکز رہا ہے۔ جس کا ذکر مختلف علما، محققین اور دانشوروں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے کیا ہے۔ گجرات کی علمی وادبی تعلقات کی قدامت کا ذکر کرتے ہوئے آنجہانی ڈاکٹر آر۔این۔مہتا، ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف آرکیولوجی، ایم۔ایس۔ یونیورسٹی بڑودہ، رقمطراز ہیں۔

> In Gujarat, the literary contacts open with the reference of Tusaspha (a Governor of Gujarat in the 4th Century B.C.) in the inscription of Rudraman the Kshatrapa ruler.

بقول صاحب مرآۃ احمدی دہلی کا سلطان سکندر بن بہلول لودی اکثر کہا کرتا تھا کہ "مدار بادشاہِ دہلی برگندم جواراست وبنیاد بادشاہِ گجرات برمرجان ومروارید کہ ہشتاد وچہار بندر درتخت بادشاہ گجرات است"۔

گجرات کی اسی فارغ البالی اور بنادر نے ایرانیوں اور عربوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور انھوں نے گجرات کے ساحلی علاقوں میں نہ صرف اپنی کالونیاں قائم کیں، بلکہ اسے اپنا تجارتی اور صنعتی مرکز بھی قرار دیا۔ جس کے نتیجے میں غزنوی، لودھی، خلجی وغیرہ نے اس طرف اپنی نظریں جمائیں اور آخر میں ترقی وبہبود کی اس کشش نے مغلوں کو گجرات آنے پر مجبور کیا۔

مذکورہ تاجروں کے ساتھ بہت سے نامور علماء، شعرااور دانشور بھی گجرات میں آکر سکونت پذیر ہوئے اور اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا۔

گجرات کی خوشحالی، بہبودی اور امن وآشتی کا ذکر رکتے ہوئے عرفات کے مصنف تقی اوحدی نے گجرات میں مقیم مختلف شعراء کا ذکر کرتے ہوئے نظیری نیشاپوری جو فارسی غزل گوئی میں حافظ شیرازی کے بعد ایک بڑا نام ہے، کے بارے میں رقمطراز ہے۔

''در گجرات منزلی پادشاھانہ ساخت وبفراغت ورفاھیت می گذرایند، ھمیشہ جمعی از اعزہ واکابر واصاغر در مجمع او حاضر بودند وھنگامۂ شعر وصحبت درمنزل او بغایت گرم بود'' (عرفات)

صوفی شاعر محمد صوفی ماژندرانی نے بھی گجرات کو ہی اپنا مامن ومسکن بنایا تھا۔ وہ کہتے ہیں:

مرا گجرات ازاں گشت است مسکن
کہ از ماژندرانم یادگار است

غرض کہ گجرات زمانۂ قدیم سے ہی فارسی زبان وادب کا مرکز رہا ہے اور ہمیشہ شعرا، ادبا، علما اور دانشوروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ہے۔

ڈاکٹر ایم۔ایچ۔صدر، شعبۂ فارسی اردو اور عربی
The Gowth of Indo-Persian Literature in Gujarat
کے دیباچے میں رقم طراز ہیں کہ

"During this long period of over five centuries of prepondrance of Persian culture huge literature of diverse nature was produced in Gujarat. And hundreds of Persian poets and writers, scholars and literateuoes who have made dee impect on Persian literature. had made a permanent abode in various cities of Gujarat. Even those who did not visit the region had a longing to visit this attractive land."

مذکورہ بالا اقتباسات فارسی زبان وادب سے گجرات کی وابستگی کا مظہر ہیں۔ لیکن

افسوسناک امر یہ ہے کہ فارسی زبان وادب سے گجرات کی وابستگی اور خدمات کا خاطر خواہ مطالعہ نہ ہو سکا لہٰذا بہت سا ادبی سرمایہ آج تک منظر عام پر نہ آسکا۔ جس کا ذکر استاد محترم ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب دیسائی اپنے مقالے

A 17th Centure Persian Literature and Islamic scholars of Gujarat

میں کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

It is true. paucity of material stares one in the face but it is equally true that no consistant or serious efforts have been made till date to make a diligent search in various sources, like libraries, personal collections, epigraphs and like documents. etc. for Persian works written in Gujarat during the past seven hundred years.

مندرجہ بالا اقتباس محترم دیسائی صاحب کے مقالے سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے ایم۔ایس۔یونیورسٹی بڑودہ کے منعقدہ سیمینار میں ۱۹۸۱ء میں پیش کیا تھا۔

آج اپنے اس مقالے کے ذریعے میرا مقصد گجرات کے ایک شاعر ملک عبدالسلام بن عبدالرحمٰن العیدروسی کے دیوان (مجموعۂ کلام) کو روشناس کرانا ہے۔

حضرت پیر محمد شاہؒ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر کے مخطوطات کی فہرست جلد ۴ میں نمبر 1817 سے ایک مخطوطہ بہ عنوان دیوان درج ہے، جو ملک عبدالسلام بن عبدالرحمٰن العیدروسی کے کلام کا مجموعہ، بلکہ انتخاب ہے۔

مخطوطے کی سائز 13x25 سینٹی میٹر ہے۔ یہ دیوان 18 اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ پر 19 سطور ہیں، خط نستعلیق ہے، کاتب کا نام عبدالصمد ولد عبدالکریم ہے۔

مذکورہ مخطوطے میں ملک عبدالسلام بن عبدالرحمٰن العیدروسی کے کلام کے علاوہ مختلف موضوعات پر لکھے گئے آٹھ اور مخطوطات بھی شامل ہیں اس طرح مخطوطہ نمبر 1817 کل نو مخطوطات کا مجموعہ ہے۔ حالانکہ مخطوطے کا اندراج بہ عنوان دیوان کیا گیا ہے، لیکن مجموعے کی ابتدا میں اس کی پیشانی پر دیا گیا عنوان لفظ 'من' سے شروع ہوتا ہے، مکمل عنوان یوں ہے: ''من دیوان ملک عبدالسلام بن عبدالرحمٰن العیدروسی''۔ عنوان میں لفظ 'من' کے

اضافے سے گمان ہوتا ہے کہ یہ ملک عبد السلام بن عبد الرحمن العیدروسی کا دیوان نہیں بلکہ اس کے کلام کا انتخاب ہے۔ جو کل (31) اکتیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں اشعار کی تعداد 429 ہے۔ شاعر نے مختلف اصناف میں سخن آزمائی کی ہے اور صنائع، بدائع کا بھرپور استعمال کیا ہے، جو اس کی ذہانت، اختراعِ طبع اور قدرالکلامی کا مظہر ہے۔

اس کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو صنائع و بدائع سے کسی قدر شغف تھا۔ اس نے ان صنائع کو جہاں برتا ہے، اس کے سامنے حاشیہ میں اس کا نام اور بعض کی مختصر تعریف بھی رقم کی ہے۔ اس کے کلام میں مندرجہ ذیل صنائع خصوصی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

واسع الشفتین، غزل اللسان، منقوط، معطّل، ترصیع تجنیس، منصوب، مکسور، مرفوع، موصّل، مقطّع، مشدّد، مؤسّس، المسلسل فی الصفت، تقسیم مسلسل، سہ صنعت است مثلث وشامل بر انواع ومقلوب، مثلث، رد العجز علی الصدر، مستنبط، مشجر، تسجیع، لف ونشر، نظم النثر، معما وموشح، لزوم شیر وشگال، حسن المطلع، ایضافیہ، ترصیع با تجنیس، تخییل، توجیہ محاک، بدیع ومخترع، ابہام، خیال لطیف موئیہ، تصور تخییل، طرفہ، موشی یعنی منقوط، تحمیل واقعہ، مبالغت تبلیغ، رجوع، تولید التوامین، سیاقۃ الاعداد، معما مُبدَل، باسم نور الدین معلا، معما مہندس باسم سہو، ذو الوجہین، تجنیس لفظی مرکب، قافیہ متولد، تجرید، مذہب کلامی، استتباع، تفریغ، حسن التعلیل، تجاہل العارف، استیفا، تجنیس تام، تجنیس خطی، تجنیف مردوج، متصل (تجنیس مکرر)، مقلوب مجنع، مقلوب شائع ناطق میر، متلون سالم، مجمع مطرف، ردیف متجانب، تقسیم خلط، متلون مکسر، طباق سلب، متلون معکوس، لوازم ضمینی، ذو المعنین، حسن التعلیل، ادماج، القول بالموجب، الاستخدام، مبالغت غلو، منزلی مشاکلہ، لوازم لفظی، قلندریات، قدسیات، تلمیح، استعارت مجاز، تجنیس مرکب متفق، موازنہ القول بالموجب، خیال دلاویز، تجنیس مزدوج، منفصل، قلب اللسانین پارسی وعربی، مختلف المعنی، متفق اللفظ ذوالمعنیین

غامض، تجنیس محرف زاید، تجنیس محرف ناقص، تجنیس مرکب لفظی وخطی ومتصل مخرد، تجنیس مسجل ومضارع، تجنیس مسجل مطرق، تجنیس مسجل بدایت، خیال لطیف غیر معاینہ، طباق ایجاب ادا، طباق مشاتقة الارتقا، تو فرالدواعی، الاحتجاج بالدلیل، الاطراد، ارصاد، تاکید المدح، الشبہ الذم، سفارت ترشح، ضمن اللفظ، الیضافیہ، دوروئی عربی وپارسی، سوال جواب صریح، سوال جواب کنایت، تفسیر جلی، التلویح محتمل الضدین، مثنویات الربا، محیط، مقلوب محتوی، اقتباس، رقطا، تضمین الترکیب، ردیف المعنین، مبادلۃ الرائین، حسن التخلص، تنسیق الصفات، اقتصاب، لف ونشر، معکوس مستوی، تغزتیر، معمامبدل بقرینہ، ردیف محبوب، ردیف متجانب، ذوالقوافی، ذوقافیتین، علوم مقبول نوع روم، تشبیہ مطلق، تشبیہ بکنایت، تشبیہ مشروط، طروعکس، تشبیہ تفصیل، تشبیہ اضمار، تشبیہ تسویہ، انعارت تجرید، اشتقاق، ایراد المعطوفات، استدراک، تقسیم، جمع باتفریق، جمع باالتقسیم، جمع باتفریق وتقسیم، متزلزل، مشاکلہ، تصحیف، اعتفاض الکلام قبل التمام، مقلوب، متلون، خیفا، لزوم شیرورو باہ در ہر مصرع، ترجمۃ اللفظ، تغیر خفی، کریم الطرفین، نظم النثر، حسن الطلب، ملمع، مسمط، حسن المقطع۔

مذکورہ صنائع بدائع میں مندرجہ ذیل صنعتوں کو شاعر نے اپنی اختراع جدید کہا ہے:

منصوب، مکسور، مرفوع، موصل، مثنویات الربا اور مقلوب متلون۔

اصناف سخن کے اعتبار سے اگر ہم تجزیہ کریں تو اس میں غزل، رباعی، مثلث، مربع، مستبط، مدور، مشجر وغیرہ دیکھے جاسکتے ہیں۔ سولہ اوراق پر پھیلے ہوئے کلام کا اصناف سخن کے اعداد وشمار کے اعتبار سے جائزہ لیں تو اس میں دو مثلث، دو مربع، دو مستبط، دو مدور، تین مشجر شامل ہیں۔ ص:۴۶ سے دیوان کا آغاز مندرجہ ذیل شعر سے ہوتا ہے ؎

کسی اندر جہانی کار دارد

رحیق عاشقی درکار دارد

صفحہ ۵۰ سے ہر صفحہ پر اشعار کے ساتھ حاشیہ میں رباعیات دیکھی جاسکتی ہیں۔ رباعیات کی تعداد ۱۲۹ ہے۔ رباعیات کی ابتدا سے پہلے؛ انھیں ایک مجموعی عنوان دیا گیا ہے۔ نیز مزید یہ کہ ان عنوانات کے تحت کہی گئیں ان رباعیات کا خالق عبدالسلام العیدروسی ہے۔ عنوان یوں ہے: ''ولہٗ ای از عبد السلام فی الرباعیات در اوصاف وافعال واقوال محبوب وحرکات وسکنات وخواب وبیداری وشکل وشمائل واعضا واجزا در ہر عضوی رباعی، اس عنوان کے بعد ہر رباعی اپنے جداگانہ عنوان کے ساتھ مرقوم ہے۔ ان رباعیات کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

توحید، مناجات، نعت، درآفرینش معشوق، درجز پیش اززادن معشوقہ، ورزادہ شدن، در طفلی، کودکی جوانی، حسن، جمال، دیدار، موی سر، تارک، موی درازور، جعد، زلف، گیسوی، طرہ، فرق، گوش، نرمۂ گوش، بناگوش، پیشانی، ابرو، چشم، بیاض چشم، سواد چشم، مردم چشم، پلک، مژہ، غمزہ، بینی، رخسارہ، عارضت، غدار، روی، خال، دہن، لب، بوسہ، دندان، زبان، زنخداں، غبغب، نای، گلوی، گردن، دوش، پہلو، بازو، پشت، آرنج، ساعد، دست، کف دست، پنجۂ دست، انگشت، ناخن، بغل، درسینہ، حقایقت، شکم، تہیگہ، کمر، سُرین، قبل، ران، زانو، ساق، شتالنگ، پای، پشت پاپتی، کف پای، قد، قامت، بالا، اندام، پوست، زنگ، بوی، نفس، عرق، خوی، صورت، سیرت، شکل، شمائل، سخن، گفتار، خندہ، نگاہ، اشارت، رفتار، خرام، نشست، خاست، خواب، بیداری، عشوہ، کرشمہ، غمزہ، ناز، فریب، نمک، شیرینی، شیوہ، آہنگ، عشق بازی، عاشق، محبت، معما، ہمونست، نیز ہموں...

ان کے علاوہ رباعی در تنبیہ اور رباعی در ہزل کے عنوان سے ایک ایک رباعی اور درصنعت سہل ممتنع، نیز بطک شراب، کے تحت دو دو رباعیاں ملتی ہیں۔ ایک رباعی آخر میں درج ہے جسے کوئی عنوان نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد ترقیمہ ہے۔ اسی صفحہ پر ترقیمہ کے بعد ایک اور رباعی رقم کی گئی ہے۔ اس کے بعد کے صفحہ پر اوپر کی جانب دو رباعیاں فارسی میں اور ایک جکری ہے جو گجری زبان میں ہے۔

مخطوطے کے صفحہ ۵۰ پر شاعر نے اپنے محدوح فیروز خان فتح خان المعروف بمعلہ جون کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ ان اشعار میں بھی اس نے صنعتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ ممدوح کے ساتھ شاعر عنوان بھی تبدیل کر دیتا ہے۔ عنوان میں اشعار کی اجمالاً تفصیل بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ عنوان یوں ہے:

وَلـهٗ هـذا الـنسـخة الـمسـمات باملح البدائع المشتمل لجميع الـصـنـائع اللنظير اللفظی والمعنوی القديم والـجديد وفيها الـصـنـائـع مـن اختـراع منشی هذا السفينة فی مدح الخان الاعـظـم مسـند العالی فيروزخان فتح خان المعروف بمعلا جون دام دولته الی يوم التناد"۔

شاعر نے عنوان عربی زبان میں لکھا ہے۔ جس سے اس کی عربی دانی کا اندازہ ہوتا ہے، اتنا ہی نہیں اس نے فارسی مصرعوں پر عربی مصرعے پہنچائے ہیں۔ فیروز خان کی مدح میں اس نے ایک جگہ "قلب اللسانین پارسی وعربی" صنعت کے عنوان سے مندرجہ ذیل عربی شعر چسپاں کیا ہے۔

تَـذِلُّ وَخَـالَ فِـیْ بـرّظَـنَ مَـنَـا
تـحـرِقُ مَـوجُ تَـهـجِـرُ حُبّةَ نَـفِـرْ

علاوہ ازیں بھی اس نے اپنے کلام میں عربی الفاظ کا استعمال روا رکھا ہے۔ عربی زبان کا یہ استعمال بتاتا ہے کہ وہ عربی زبان پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ مثلاً:

ترا ہمت کہ بر احیای دین است
خدا دایم یحب المحسنین است
دلت تقویٰ و دینداری گزیده
از آیات هد اللمتقین است
ستم را از جهاں برکنده بیخ
کہ عدلت لا یحب الظالمین است

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں اس کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

زیر بحث مجموعے میں شاعر نے اپنے دو ممدوحین کا ذکر کیا ہے۔ ایک مسند عالی احمد خان اور دوسرے الخان الاعظم المعظم مسند تعالیٰ فیروز بن فتح خان المعروف بمعلا جون اور اس نے ان دونوں کی مدح میں خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کے ممدوحین کے ناموں کے ساتھ مسند عالی، مسند الخان الاعظم المعظم، مسند العالی وغیرہ خطابات منسوب ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہونگے، کیونکہ یہ خطابات گجرات میں ان امرا کو دیئے جاتے تھے جنھیں دربار میں باریابی کا حق ہوتا تھا۔ اس امر کا ذکر محترم ڈاکٹر ضیاءالدین صاحب دیسائی نے اپنے مقالے Inscritions from the states of Alwar (Epigraphca Indiaca 1955-56) میں یوں کیا ہے :

"The title Majlis-i-Aali, Majlis ele are frequently met with in inscription as well as historical works, but nowhere they have been properly explained. In one place, for example, the little Majlis-i-Aali is stated to mean the great prop. (Epigraphica Ind.was 1933-34-p.9) (i bid 1915-16. p.13 F.N.3) Dr. G.Yazdani tried to explain them thus : the titles Majlis, Masnad, Sadr etc. all mean Sahib-i-Majlis, Sahib-i-Masnad i.e. Lord of the assembly, Lord of the throne, Lord of the seat the honour etc. The clue to their exact conotation is provided in the Arabic history of Gujarat. While explaining these title Haj Dabir states that "and it is the custom of the men of this country to subtitle the King's deputy (Naib-ul-Mutlaq) as Masnad-i-Aali and the Master (wazir) as Majlis-i-Aali and he who is permitted to take a seat in the presence of the King is given the title of Majlis to which a term in opposition to his (status) is appointed". Zafrul Walah vol.II 1921 p.613).

مذکورہ اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مسند، مجلس وغیرہ خطابات عنایت کرنے کی روایت گجرات میں تھی۔ عبد السلام بن عبد الرحمٰن العیدروسی کے ممدوحین کے نام کے ساتھ ان خطابات کی نسبت، اس کے گجرات کا باشندہ ہونے کی دلیل ہے۔ مزید یہ کہ شاعر کے

نام کے ساتھ لفظ ملک منسوب ہونے سے اس دلیل کو اور تقویت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا قرین قیاس ہے کہ شاعر بذات خود بھی کسی سرکاری عہدے پر فائز رہا ہوگا۔ دیوان کے آخر میں ایک جکری ہے جو گجری زبان میں ہے اور چونکہ جکری کا رواج عموماً گجرات میں تھا۔ اس سے شاعر کے گجرات کا باشندہ ہونے کی دلیل کو مزید تقویت پہنچتی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ شاعر اپنے حالات کے بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔ لیکن جکری کا گجری زبان میں ہونا اور اس کے کلام کے ساتھ درج ہونا، نیز ممدوحین کے مسند، مجلس وغیرہ خطابات، شاعر کے نام کے لفظ ملک کا منسوب ہونا، یہ تمام ایسے محاکات ہیں جو اسکے گجرات کا باشندہ ہونے کی دلیل ہے۔

شاعر نے اپنے دور کا بھی کہیں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اس کے کلام کا اسلوب، اس کا لب ولہجہ، اس کی طرز ادا زبان اور سبک وغیرہ کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے کہ یہ گیارھویں صدی ہجری کا زمانہ رہا ہوگا۔

عبد السلام نے اپنے پورے کلام میں صنائع وبدائع لفظی ومعنوی کا جس کثرت سے استعمال کیا ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں شاذ ونادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے، جو شاعر کے قادر الکلامی، قوت بیان اور زبان پر اس کے مکمل عبور کا مظہر ہے۔ البتہ صنعتوں کا اسی قسم کا استعمال جہانگیر کے دور کے شاعر غضنفر گجراتی کے یہاں بھی اسی شدومد کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر استاد محترم سید میر حسن میر عابدی صاحب نے اپنے مقالے، جو انھوں نے ایم۔ ایس یونیورسٹی بڑودہ کے منعقدہ سیمینار 1981 میں پیش کیا تھا، میں کیا ہے۔

(The Growth of Indo-Persian literature in Gujarat. Edited by Dr.M.H.Siddiqui, Pub.by the Dept. of Persian, Arabic & Urdu, The M.S. University of Baroda, Vadodra).

عبد السلام العیدروسی کے مخطوطے کا آغاز ہی صنائع لفظی سے ہوتا ہے کہ

کسی اندر جہانی یار دارد ۔۔۔ رحیق عاشقی درکار دارد

نہ شاید کردنش ظاہر شکایت ۔۔۔ اگر یاری زیار ازاد دارد

مذکورہ شعر میں واسع الشفتین صنعت کا استعمال ہوا ہے، اس صنعت کی تعریف یہ ہے کہ شعر کی قرأت کے دوران ہونٹ ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ یہ مکمل غزل اس صنعت میں کہی گئی ہے۔

اس کے بعد کی غزل میں 'غزللسان' کی صنعت برتی گئی ہے جس میں دوران قرأت زبان حرکت نہیں کرتی۔

غم محبوب باماہی خوب　　　بکام ماغم محبوب موہوب

محبّ آں حبیب بیوفائیم　　　بمایہ بیوفائی ہای محبوب

العیدروسی نے اگر منقوط کی صنعت کو برتا ہے یعنی اشعار میں ایسے الفاظ کا استعمال کہ جس میں سبھی حروف نقطے والے ہوں۔ مثال پیش ہے ۔

بہ پیش بت نشینی بی یقینی　　　بجز این بت نشینی بی یقینی

تو وہیں اس کے برعکس معطل کو برتنے میں بھی وہ پیچھے نہیں رہتا۔

معطل یعنی اشعار میں ایسے الفاظ کا استعمال کہ جس کے کسی حرف پر نقطہ نہ ہو یعنی تمام الفاظ غیر منقوط ہوں۔ مثلاً ۔

داوی درداگر دلدار آرد　　　کدامم درد کودرکار دآرد

صلای داد او دردہ مدام　　　کہ وصل او دوا ہموار آرد

رقطا ملاحظہ فرمائے۔

رقطا اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں لفظ کا ایک حرف منقوط اور دوسرا غیر منقوط ہو۔ مثلاً ۔

قد خوش آن صنم بدیدی　　　باتو چہ کنم چو غم خریدی

ان صنعتوں کے علاوہ اس نے دیگر بہت سی اور صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ ان میں ایسی صنعتیں بھی ہیں جنہیں شاعر کی اختراعات کہا گیا ہے۔ مثلاً غیر منصوب، مکسور، مرفوع وغیرہ خود شاعر کی اپنی اختراعات ہیں۔ جن کا ذکر شاعر نے بذات خود کیا ہے۔ غزل میں جن صنائع، بدائع کا استعمال ہوا ہے اسے غزل کے بالمقابل سرخ روشنائی سے درج کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کی اپنی اختراع ہے تو اس نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ وہ صنعت مکسور کے متعلق کہتا ہے ''مکسور در طرح پیش وزیر اختراع جدید مؤلف راست'' منصوب اور مرفوع کو بھی وہ اپنی اختراع بتاتا ہے۔ یہاں ان صنعتوں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

منصوب : بخوبی نصب کرد او رایت خوب
بکردم اختراع نظم منصوب

مکسور : من مکسور کزوی مانده ام دور
جدید آورده ام این نظم مکسور

مرفوع : چو اوشد خرم وخوش خلق وخوش خو
دو رخ پر نور وموچون مشک خوشبو

سجع ترصیع : اس صنعت میں ہم وزن الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

آرائش آفاق شدر خسار بزم آرای تو
آسائش عشاق شد دیدار روح افزای تو

اسی طرح دیگر بہت سے صنائع بدائع لفظی ومعنوی کا استعمال شاعر نے کیا ہے جو اس کی ذہانت اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔

صنعتوں کے علاوہ شاعر نے مشجر، مدور، مثلث، ادماج، معطل یا غیر منقوط لف ونشر وغیرہ بہت سارے صنائع بدائع کا استعمال کیا ہے۔

مثلث کی ایک مثال پیش ہے۔ مثلث میں تین مصرع اس طرح لکھے جاتے ہیں کہ ہر مصرع کے ابتدائی الفاظ کو جمع کر دیا جائے تو چوتھا مصرع مکمل ہو جائے۔ مثلاً

جہانگیری بود ازروی تدبیر

اگر تینوں مصرع کے ابتدائی الفاظ جمع کریں تو چوتھا مصرع یوں ہوگا ۔

جہانگیری، جواں بختی، جہاں یار

مثلث کے علاوہ مربع، جس میں چند سطروں (مصرعوں) کو چار حصوں میں بانٹ کر چار چار خانوں میں اس طرح لکھا جائے کہ ان کی قرأت طول وعرض میں یکساں ہو اور کسی قسم کا فرق نہ پیدا ہو۔ مثال دیکھئے ۔

دادی	درد	باز	خوش کردی
شادی	ارچہ	زغم دوست	باز
وغم	بتابدادی	ارچہ	درد
نہادی	وغم	شادی	دادی

مربع محض کسی ایک بحر میں لکھنا مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ دیگر بحور میں بھی لکھے جاسکتے ہیں۔

علاوہ ازیں مدّور: مصرع یا شعر کے چار یا آٹھ رکن کو ایک دائرے کی شکل میں تقسیم کر کے علیٰحدہ علیٰحدہ لکھیں اور پھر کسی بھی رکن سے اس کی قرأت کی ابتدا کریں، اور رکن کی تقدیم وتاخیر کے اعتبار سے مختلف مصرع یا اشعار حاصل ہوتے ہوں تو اسے مدور کہا جاتا ہے۔

اسی طرح مشجر یعنی اشعار کو درختوں کی شکل میں لکھنا۔ مطلع کو درخت کے تنے کی طرح سیدھا لکھا جاتا ہے، بقعہ اشعار شاکوں کی مانند مطلع کے دونوں جانب لکھے جاتے ہیں۔ مطلع کا ہر لفظ اگلے شعر کا پہلا لفظ قرار پاتا ہے۔

اس قسم کی تمام صنعتوں کو عبدالسلام عیدروسی نے بہت ہی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

غزلوں کے علاوہ اس نے رباعیات بھی لکھی ہیں جو اس کی ندرت بیان اور نازک خیالی کا [illegible]ہر ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس نے مختلف عنوانات کے تحت رباعیات قلمبند کی ہیں یہاں اس کی چند مثالیں پیش ہیں:

محبوب کی کمر کا ذکر ملاحظہ ہو ۔

از موی کمر ترا کہ باریک تر است	خلقی بہ تحیر بہ کمر دارد دست
در حیرت آنم کہ کمری طلبی	چون نیست کمر کمر کجا خواہی بست

اندام سے متعلق وہ کہتا ہے ۔

اندام تو ہست ای بت سیم اندام	یا آنکہ تبی زعاج کردند تمام
با آب حیات در تہِ پیرہن است	کز دیدن آن زندہ شود مردہ مدام

نگاہ کا انداز دیکھئے ۔

پیوستہ نگاھت ارچہ خون ھا ریزد	جانم ز نگاہ تو نمی پر ہیزد
گدگہ نگہی بسوی من کن با آنک	ہر سوز نگاہ تو قیامت خیزد

ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر اس کے یہاں رباعیات ملتی ہیں جن کی چند اور مثالیں دیکھئے۔

خاست

از خاستن تو سرو را در گل پاست
در ہر طرفی دگر قیامت برخاست
از خاست چنین کہ می ربائی دلہا
دلہا کہ خاستت ربودن زیباست

عشق

عشق تو بہ تقدیر ماموہوب است
زین روی غم عشق توام محبوب است
در عشق تو زیستن بدام ارچہ نکوست
با عشق تو مردنم ازاں ہم خوب است

در زاده شدن

آن روزی که ای صنم ترا مادر زاد
در هر طرفی به شهر غوغا افتاد
گفتند به زادن کسی کین شودست
تاخود به نهایت چه بلا خواهد زاد

موی سر

ای موی سرت زپا در آورد مرا
و از دست خرد کار همه برد مرا
من از تو سرموی نه رنجم با آنک
موی سرتو زیر و زبر کرد مرا

ابرو

ابروی بران روی تو ای جان همه حال
اندر دل آفتاب پیدا دو هلال
نه بود به هلال و آفتاب این خوبی
کان روی تراست زابرواں حسن جمال

خال

ای خال سیه هست که پیدات بروی
برغارت دین است زلف یاری دهِ او
هرگز نه شنیدم بجز این کافر شوخ
کا ندر حرم کعبه نشیند هندو

بوسہ

یک بوسہ بران لبانِ شیرین فرمای
راحت قدری بہ جان غمگین فرمای
بوست دل بیقرار را تسکین است
ہاں جان مرا بوسہ تسکین فرمای

رفتار

رفتار خوشت کہ کبک ازویست خجل
از حیرت آنست کہ سرورا پای بگل
دلہا برھت تا تو بہ وقت رفتار
برروی زمیں پانہی جز بردل

رباعیات کے بعد اس کی جکری کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کا پہلا بند دیکھئے، جس سے اس دور کی گجری زبان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ؎

رت سہاوں ساون آیا   چن دس بادل گرج جنایا
ات رت پیو پردیس سدھایا

اس کے دیوان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا کلام ایک متوسط درجے کا کلام ہے۔

عیدروسی سلسلے کے بزرگوں کا گجرات سے خاص تعلق رہا ہے آج بھی عیدروسی سلسلے کے کئی بزرگ گجرات خصوصاً احمد آباد، بھروچ اور سورت میں مدفون ہیں۔ جن کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔ ملک عبدالسلام بن عبدالرحمٰن العیدروسی بھی اسی سلسلے کے ایک بزرگ ہیں اور غالباً پہلے بزرگ ہیں جن کا منظوم کلام دستیاب ہوا ہے۔

۱۹

گجرات کے بارھویں صدی ہجری کے کاتب اور ان کی کتابت کردہ کتابیں

- پروفیسر محبوب حسین احمد حسین عبّاسی
(رفیق۔حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر،احمد آباد)

بارھویں صدی ہجری کے اوائل (یعنی سترھویں صدی عیسوی کے اواخر) میں مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹمانا شروع ہوا تھا تب گجرات میں بھی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کے زوال کی ابتداء ہوئی تھی۔ لہذا اس کا منفی اثر معاشرتی زندگی کے دیگر تمام شعبوں پر بھی پڑا اور خاص طور پر اسلامی تہذیب وتمدن کا جو طرۂ امتیاز تھا، یعنی علوم دینیہ کی تعلیم واشاعت کے کام میں بھی رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ اس سے قبل علوم وفنون کو جو سیاسی سرپرستی حاصل تھی اور درس وتدریس نیز تصنیف وتالیف کا جو خوشگوار ماحول موجود تھا وہ سب باتیں مفقود ہونے لگیں تو اس کے نتائج بھی بہت جلد سامنے آئے۔ اس سے پہلے کی صدیوں میں جہاں کثیر التصانیف بزرگ گذرے تھے، مثلاً مولانا محمد بن طاہر پٹنی، مولانا صدیق بن شریف، مولانا حسن محمد چشتی، حضرت محی الدین عبد القادر عیدروس، حضرت شاہ وجیہ الدین علوی وغیرہ وہاں بارھویں صدی ہجری میں قابلِ ذکر صاحب تصنیف صرف چند نام ملتے ہیں جیسے حضرت پیر محمد شاہ، مولانا نور الدین صدیقی، شیخ محمد فاضل وغیرہ۔

اُس زوال کے دور کی ایک خصوصیت انتہائی قابل توجہ یہ ہے کہ اس صدی میں قدیم وجدید کتابوں کی کتابت گجرات میں بڑے پیمانے پر ہوئی جس کی ایک وجہ یہ معلوم

ہوتی ہے کہ مدارس اور مدرسوں کی سرپرستی میں کمی واقع ہونے کے نتیجے میں تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنی مٹتی ہوئی میراث کی حفاظت کا جذبہ پیدا ہوا اور ان نیک دل لوگوں نے جو نایاب نسخے دستیاب ہوئے ان کی نقلیں تیار کرنے کا عظیم کام انجام دیا۔ اس صدی کی کتابت شدہ قلمی کتابوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے کاتبوں میں سے چند کے سوا باقی سب پیشہ ور کاتب نہیں تھے اور انہیں فن کتابت میں مہارت بھی حاصل نہیں تھی۔ انہیں تو صرف ایک فکر تھی کہ اسلاف کی یادگاریں مٹنے نہ پائیں اور آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو جائیں۔

بارھویں صدی کے کاتبوں اور ان کی کتابت کردہ کتابوں کی تاریخی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر درگاہ شریف حضرت پیر محمد شاہؒ کتاب خانہ اور تحقیقی مرکز، احمد آباد میں مخزون اس وقت کے قلمی نسخوں اور ان کے کاتبوں کا مختصر تعارف یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) بارھویں صدی ھجری کے سب سے اہم کاتب آخوند ولی اللہ صاحب ہیں۔ آپ کے 1117 /6-1705 سے لے کر 1138 /26-1725 تک کتابت کردہ بیس قلمی نسخے دستیاب ہیں[۱]۔ ''مولانا ولی اللہ ایک بلند پایہ خطاط تھے اور خط نسخ میں انہیں کامل مہارت حاصل تھی''۔ ان کے پایہ کا خطاط پھر کبھی گجرات میں پیدا نہیں ہوا۔ (مولانا ولی اللہ کے کتابت کردہ تمام نسخوں کی تفصیل کے لئے حوالہ نمبر ایک (۱) دیکھئے۔

(۲) عبد الغنی بن ابوبکر بن عبد الرحمٰن محمد قاسم، گو عالم تھے جیسا کہ ان کی قلمی کتابوں میں مندرج تحریرات سے پتہ چلتا ہے لیکن وہ پیشہ ور کاتب نہیں تھے کیونکہ جن چار کتابوں کے قلمی نسخے یہاں موجود ہیں ان کا خط معمولی ہے اور اس میں کوئی قابل ذکر خصوصیت بھی نہیں ہے۔ البتہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ گیارھویں صدی ھجری کے عالم، مفسر اور مصنف مولانا محمد صدیق بن شریف کی نایاب تفسیر ''بدیع التفسیر'' کی کتابت کر کے اُسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے کیونکہ اس تفسیر کا کوئی اور قلمی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا۔[۲]

مولانا عبدالغنی کی کتابت کردہ دیگر کتابیں حسب ذیل ہیں:

(۱) امام مالک کی موطا [۳]

(۲) ابوالفضل احمد المالکی کی: ''التنویر فی اسقاط التدبیر'' [۴]

(۳) امام محمد بن سلیمان جزولی کی: مفاتیح الجنات شرح دلائل الخیرات۔[۵]

(۳) اس صدی کے سب سے زیادہ اہم اور خوبصورت خط میں کتابت شدہ قلمی نسخے مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کے چھ دفتروں کے ہیں۔ ان تمام دفتروں کی کتابت خط نستعلیق میں ضیاء الدین ابوبکر بن ابوالقاسم نے ۱۱۶۱/ ۱۷۴۸ء اور ۱۱۶۶/۱۷۵۳ء کے درمیان مکمل کی ہے۔[۶]

اس صدی کے مذکورۂ بالا کاتب ضیاء الدین بن ابی القاسم کا کتابت کردہ ایک اور قلمی نسخہ اس کتاب خانہ کی زینت ہے۔ شہاب الدین القسطلانی کی سیرت کے موضوع پر لکھی گئی عربی تصنیف المواہب اللدنیہ جس کا خود مصنف کا کتابت کردہ نسخہ بھی یہاں موجود ہے [۷]۔ اس مشہور کتاب کی کتابت ضیاء الدین کے استاد شیخ محمد حسین نے ۱۱۵۹ھ/ ۴۷-۱۷۴۶ء میں شروع کی لیکن ۱۱۶۰ھ/ ۴۸-۱۷۴۷ء میں ان کی وفات ہونے کے بعد خود ضیاء الدین نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔[۸]

(۴) ۱۱۲۵ھ/۱۴-۱۷۱۳ء کا کتابت شدہ ایک قابل ذکر قلمی نسخہ مثنوی معنوی کی فارسی شرح مکاشفات رضوی کا ہے۔ شارح محمد رضا ہیں جو گجرات کے کردنژاد علمی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ یہ احمد بن سلیمان کرد کے پوتے ہیں[۹]۔ مکاشفات رضوی طبع ہو چکی ہے[۱۰]۔ نسخۂ ھذا کے کاتب شیخ محمد ہیں۔

(۵) گجرات کے ناگر برھمنوں نے فارسی زبان و ادب کی زبردست خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں کثیر تعداد میں خوش نویس ہوئے ہیں[۱۱]۔ ایسے ہی ایک خوش نویس نول رای ناگر پٹنی نے ۱۱۳۳ھ/ ۲۱-۱۷۲۰ء میں فارسی کے مشہور شاعر چندر بھان برہمن کے رقعات کا ایک نسخہ احمد آباد یا بڑودہ میں قلمی کیا تھا[۱۲]۔

(۶) احمد آباد کے ایک اور ناگر برھمن پورنا نند ناگر کا کتابت کردہ قلمی نسخہ بھی ملتا

ہے۔ واہلجی کے بیٹے سرخانند کے بیٹے پورنانند جوشی جو ساتھودرہ ناگر اور احمد آباد میں ساکن تھے انہوں نے بنوالی داس ولی کی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کردہ گلزار حال کی کتابت ۱۱۰۹ھ/ ۹۸-۱۶۹۷ء میں کی تھی۔ اس میں کاتب نے سنسکرت زبان اور ناگری خط میں بھی ترقیمہ لکھا ہے۔۱۳

(۷) گجرات کے بڑے شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی علوم کا چرچا تھا اور ایسی جگہوں پر بھی عربی و فارسی کتابوں کی کتابت کا کام بارھویں صدی میں ہوا تھا۔ مثلاً شمالی گجرات کے ایک قصبے بیجاپور میں عماد الدین المرغینانی کی فقہ کے موضوع پر عربی کتاب فصوص العمادیہ کا ایک نسخہ عبد الکریم بن ایلجیو ابن عبد الرحمٰن نے ۱۱۰۷ھ/ ۹۶-۱۶۹۵ء میں قلمی کیا تھا۔۱۴

(۸) شمالی گجرات کے قصبہ احمد نگر جو اب ہمت نگر کے نام سے مشہور ہے، وہاں کے جمال محمد بن شیخ محمد نے علم الکلام کے موضوع پر ابی الحسن الشاذلی کے عربی قصیدہ کی کتابت غالباً اسی صدی میں کی تھی۔ اس مخطوطہ پر محمد ابو بکر کی ۱۱۲۳ کی اور قاضی شرع محمد صالح کی ۱۲۲۲ کی مہریں موجود ہیں۔۱۵

(۹) گجرات، کاٹھیاواڑ کے مشہور شہر جوناگڑھ میں ۱۱۹۸ھ/۸۴-۱۷۸۳ء میں انشاء کے موضوع پر (فارسی خطوط کے) مجموعے کی کتابت شیخ عزت اللہ انصاری نے کی تھی۔ یہ ایک اہم مخطوطہ ہے جس میں چند تاریخی اہمیت کے مکاتیب شامل ہیں۔۱۶

(۱۰) جوناگڑھ ہی میں ابراہیم بن حسین کی فقہ کے موضوع پر لکھی گئی کتاب ارشاد المؤمنین کا قلمی نسخہ شیخ فتح محمد ولد شیخ محمد قاسم نے ۱۱۴۱ھ/ ۲۹-۱۷۲۸ء میں تیار کیا تھا۔۱۷

(۱۱) مذکورۂ بالا کاتب شیخ فتح محمد ولد شیخ محمد قاسم کا کتابت کردہ ایک اور قلمی نسخہ بعنوان ''مجموعۂ سلطانی'' بھی ملتا ہے۔ ۱۱۳۳ھ/ ۲۰-۱۷۱۹ء کے اس نسخہ میں کاتب نے مقام کتابت قصبۂ معصوم آباد لکھا ہے۔۱۸

(۱۲) گجرات کے تاریخی شہر چانپانیر میں ابو نصر فراخی کی لغت کے موضوع پر

لکھی گئی فارسی کتاب نصاب الصبیان مع شرح کا قلمی نسخہ ۱۱۶۵ھ/ ۵۲-۱۷۵۱ء میں تیار کیا گیا تھا۔ اس کے کاتب اخوند محمد بھکن ولد دوست محمد برودیہ ہیں۔ [۱۹]

مذکورۂ بالا مخطوطات کے علاوہ بارھویں صدی ھجری میں گجرات میں کتابت شدہ دیگر مخطوطات کی تفصیل کا ایک گوشوارہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

نمبر شمار	مقام کتابت	سال کتابت	کاتب کا نام	کتاب اور مصنف کا نام	موضوع اور زبان	حواشی میں حوالہ نمبر
۱۳	-	۱۱۰۶/ ۱۶۹۵	محمد نور الدین الگجراتی	الجزریہ (منظوم) محمد ابن محمد الجزری	تجوید عربی	۲۰
۱۴	-	۱۱۰۰/ ۱۶۸۸	بدر الدین بن شیخ بہاء الدین العباسی	خلاصہ لب اللباب اختصار ہبۃ اللہ شاہ میر	اصول حدیث عربی	۲۱
۱۵	مزار اقدس حضرت پیر محمد شاہ، احمد آباد	۱۱۶۵/ ۵۲-۱۷۵۱	محمد بن فاضل بوھرہ المشہور بظہور	شرح فصوص الحکم ملا نور الدین جامی	تصوف عربی	۲۲
۱۶	بلدۂ گجرات (احمد آباد؟)	۱۱۱۹/ ۱۷۰۸	محمد صالح عبد الطیف	احیاء علوم الدین الغزالی	تصوف عربی	۲۳
۱۷	شاہ جہان آباد دہلی	۱۱۳۵/ ۱۷۲۲ (سال تصنیف اور سال کتابت	ابی البکر الاحمد آبادی	رفع النقاب	سیرت عربی	۲۴
۱۸	نہروالہ (پٹن)	۱۱۸۸/ ۷۵-۱۷۷۴	عزت اللہ ابن شیخ نظام الدین تھتوی	حل الموجز -	طب عربی	۲۵

۱۹	احمد آباد	۱۱۴۲/ ۱۷۲۹	خواجہ شکر اللہ احمد آبادی	مثنوی معنوی دفتر دوم	تصوف فارسی	۲۶
۲۰	پٹن	۱۱۱۸/ ۱۷۰۶	شیخ حامد ولد شیخ قاسم	مثنوی معنوی دفتر دوم	تصوف فارسی	۲۷
۲۱	سورت	۱۱۳۵/ ۱۷۲۲-۲۳	صدر الدین بن شیخ پیر محمد	رسائل عبد الحق	تصوف فارسی	۲۸
۲۲	–	۱۱۲۰/ ۱۷۰۸-۹	محمد بن عبد الکریم	زاد العاشقین فی سبیل الصادقین عبد اللطیف پٹنی	تصوف عربی	۲۹
۲۳	احمد آباد	۱۱۰۶/ ۱۶۹۴-۹۵	محمد زاهد ولد محمد صالح صدیقی	زبدۃ الحقائق عبد الجلیل	تصوف فارسی	۳۰
۲۴	مقبرۂ خواجہ محمد دہدار مسجد روشن ضمیر سورت	۱۱۵۵/ ۱۷۴۲-۴۳	سید محمد مفلح ولد میر سہانوی لکھنوی	اربعون رسائل حضرت شیخ محمد چشتی	تصوف عربی۔ فارسی	۳۱
۲۵	سورت	۱۱۶۷/ ۱۷۵۳-۵۴	سید غلام محمد	الحواشی الازہریہ زین الدین خالد الازہری الشافعی	قرأت وتجوید عربی	۳۲
۲۶	– احمد آباد؟	۱۱۲۶/ ۱۷۱۴-۱۵	محمد حماد ابن سید حامد الرضوی الشاهی	اعمال الصلوٰۃ المخصوصۃ بالسادات	تصوف فارسی	۳۳
۲۷	راندیر (سورت)	۱۱۸۲/ ۱۷۶۸-۶۹	سید احمد بن میاں محی الدین	فقہ المبین غلام حسین شاہ یقین	فقہ اردو	۳۴

۲۸	جامع مسجد راندیر (سورت)	-	سید احمد بن میاں محی الدین	مسائل الایمان غلام حسین شاہ یقین	فقہ اردو	۳۵
۲۹	-	١١٥١/ ١٦٨٩-٩٠	سید پیر خوند میر شمس حسینی نہر والی	مفتاح القلوب فی شرح مرغوب القلوب	سلوک فارسی	۳۶
۳۰	محلہ محمد یہ پٹن	١١٧٧ /٦٤-١٧٦٣	عمر خان بن محمد عارف مدنی، نہروالی	منہل الصائمین ومعراج المخلصین، (کاتب خود)	فضائل شہور عربی	۳۷
۳۱	-	١١٦٠/ ١٧٤٧-٤٨	ابوبکر بن احمد بن ابی بکر بن علی العیدروس	نامعلوم ابی الحسن علی العطاس	مدح امام غزالی عربی	۳۸
۳۲	بھروچ	١١٣٠/ ١٧١٧-١٨	محمد صالح بن نور الدین	نکات العارفین سکندر بن منجھو (مرأة سکندری کا مصنف)	تصوف فارسی	۳۹

یہاں پر بارھویں صدی میں کتابت شدہ گجرات کے چند عربی - فارسی مخطوطات کا ذکر نمونے کے طور پر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کی ایسی کئی کتابوں کے نام ملتے ہیں جو بارھویں صدی میں تصنیف ہوئی تھیں یا داخلی شواہد کی بنیاد پر جن کے بارے میں اسی صدی کی ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے لیکن ان پر کتابت کے سال درج نہیں ہیں۔ یہ کتابیں مزید تحقیق کی محتاج ہیں۔

اس کے علاوہ کتابوں کے وہ خاندانی اور خانقاہی ذخیرے ہیں جن کے موجود ہونے کا تو ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے لیکن جن کی وضاحتی فہرستیں تیار نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان

سے ہنوز ناواقف رہے ہیں۔

مزید یہ کہ ہند اور بیرون ہند کے کتاب خانوں کی مطبوعہ فہرستوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو گجرات کے خاص طور پر بارھویں صدی کے مخطوطات کا پتہ چل سکتا ہے۔

گجرات کے بارھویں صدی کے کاتب اور ان کی کتابت کردہ کتابوں کے بارے میں مندرجہ بالا مختصر جائزے سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ناسازگار حالات ہونے کے باوجود گجرات میں علوم دینیہ کا (۱) درس وتدریس کا کام جاری تھا (۲) جدید تصانیف کا تو اضافہ نہیں ہوا لیکن درسی وغیر درسی کتابوں کی نقلیں تیار ہوئیں اور (۳) تصوف کی طرف رجحان بڑھا چنانچہ ہمین قریباًبارہ نسخے تصوف کے موضوع پر ملتے ہیں۔(۴) ناگر برہمنوں کے کتابت کردہ نسخے ہمیں پہلی بار اسی صدی میں ملتے ہیں۔ (۵) یہ قلمی نسخے اکثر عربی کتابوں کے ہیں جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ درس وتدریس کی زبان عربی ہنوز رائج تھی۔

حواشی

۱۔ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اور ریسرچ سینٹر، احمد آباد۔ جنرل -۳، سال اشاعت ۲۰۰۳ء۔ مقالہ: خاندان ولی اللہ کی علمی اور دینی خدمات؛ مصنفہ ڈاکٹر سید عبدالرحیم صاحب، ناگپور۔ ص ص ۴۳ تا ۴۶۔

۲۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۱۔ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری۔ مخطوطات نمبر ۱۱۴۔ ۱۲۱۔ ۱۲۷۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۲۔

۳۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۱۔ مخطوطہ نمبر ۳۶۷۔

۴۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۲۔ مخطوطہ نمبر ۶۶۰۔

۵۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۳۔ مخطوطہ نمبر ۹۴۴۔

۶۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۸۔ مخطوطہ نمبر ۲۲۲۹ تا ۲۲۳۴۔

۷۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۲۔ مخطوطہ نمبر ۷۰۱۔

۸۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۲۔ مخطوطہ نمبر ۷۰۲۔

۹۔ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اور ریسرچ سینٹر، احمد آباد۔ جرنل نمبر-۲، سال اشاعت۔۲۰۰۱۔مقالہ: احمد آباد کے ایک غیر معروف عالم مولانا محمد رضا کردی کی علمی خدمات۔مصنفۂ ڈاکٹر سید عبدالرحیم، ناگپور۔ص ص ۶۸ تا ۷۵۔

۱۰۔ وضاحتی فہرست۔جلد۔۴۔ مخطوطہ نمبر۱۳۰۰۔

۱۱۔ ناگروں کی فارسی زبان وادب کی خدمات۔(گجراتی تصنیف۔مصنف: ڈاکٹر چھوٹو بھائی نایک) اردو ترجمہ از پروفیسر جمال الدین شیخ۔ سال اشاعت : ۲۰۰۶، احمد آباد۔(اس کتاب میں نول رای ناگر کے نسخہ کا ذکر نہیں ہے)۔

۱۲۔ وضاحتی فہرست۔جلد۔ششم۔مخطوطہ نمبر A-۱۶۰۴۔

۱۳۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:ہفتم۔ مخطوطہ نمبر C-۲۰۶۲
نیز دیکھئے محولۂ بالا ناگروں کی۔۔۔خدمات (اردو ترجمہ) ص۴۷

۱۴۔ وضاحتی فہرست۔جلد۔۱۔مخطوطہ نمبر۴۸۹

۱۵۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۱۔ مخطوطہ نمبر۵۵۴

۱۶۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر ۱۶۰۱

۱۷۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر A-۱۸۳۹

۱۸۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر B-۱۸۴۰

۱۹۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر ۱۶۸۰

۲۰۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۱۔ مخطوطہ نمبر ۱۱۴

۲۱۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۱۔ مخطوطہ نمبر ۳۳۹

۲۲۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۲۔ مخطوطہ نمبر ۶۳۵-۶۳۶

۲۳۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۲۔ مخطوطہ نمبر ۶۴۷ تا ۶۵۰

۲۴۔ وضاحتی فہرست۔ جلد:۲۔ مخطوطہ نمبر ۷۴۵

۲۵؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۳۔ مخطوطہ نمبر ۹۵۶

۲۶؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۴۔ مخطوطہ نمبر ۱۲۸۴

۲۷؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۴۔ مخطوطہ نمبر ۱۲۸۵

۲۸؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۵۔ مخطوطہ نمبر ۱۳۱۳

۲۹؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۵۔ مخطوطہ نمبر ۲-۱۴۶۸

۳۰؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۵۔ مخطوطہ نمبر ۲-۳-۱۴۷۳

۳۱؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۵۔ مخطوطہ نمبر ۱۴۸۰/ اور جلد-۷، مخطوطہ نمبر ۲۱۳۷

۳۲؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر A-۱۷۶۵

۳۳؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر A-۱۸۰۸

۳۴؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر ۱۹۳۶

۳۵؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۶۔ مخطوطہ نمبر ۱۹۵۰

۳۶؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۷۔ مخطوطہ نمبر A-۲۱۷۱

۳۷؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۷۔ مخطوطہ نمبر B-۲۱۸۴

۳۸؎ وضاحتی فہرست۔ جلد:۸۔ مخطوطہ نمبر C-۲۲۱۶

۳۹؎ یہ مخطوطہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری، ممبئی میں محفوظ ہے۔

۲۰

آزادی کے بعد
گجرات کے مسلم تعلیمی اداروں کی خدمات-ایک جائزہ

-جناب اِبہام رشید شیخ
(احمد آباد)

انیسویں صدی میں سر سید احمد اور ان کے رفقا نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف موڑنے کی بہترین کوششیں کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی بھرپور کوششوں کے درمیان پورے ہندوستان کے مسلمان میں تعلیم حاصل کرنے کے ضمن میں ہلچل مچ گئی تھی۔ بہت سارے نوجوانوں کو عصری تعلیم حاصل کرنے کی لگن لگ گئی تھی۔اس سے پہلے جن مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنا ہو وہ کسی بھی مدرسے یا دارالعلوم کا رخ کرتے اور دینی تعلیم کے حصول میں لگ جاتے۔لیکن سر سید احمد کی کوششوں سے اس رجحان میں بیّن فرق رونما ہوا تھا۔ نئے لڑکے دنیوی تعلیم کے شوق میں اسکولوں اور کالجوں کا رخ کرنے لگے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم کی طرف رجوع ہونے والے ایسے نوجوانوں کی شرح پوری مسلم آبادی کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جیسے حالات تھے ٹھیک ویسے ہی یا اس سے بھی زیادہ تشویش ناک حالات گجرات کے مسلمانوں کے تھے۔آزادی کے وقت تک پورے ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب فروغ پا چکی تھی۔ اور ملک کی شرح خواندگی میں خاطر خواہ اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا۔تاہم مسلمانوں میں تعلیمی فقدان کی وجہ سے یہ شرح بہت ہی کم رہی۔

آزادی کے بعد سے حکومت نے بھی پرائمری تعلیم کو مفت اور لازمی بنا کر عوام کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے عوام اور دنیا کے دیگر عوام کے ساتھ بڑھتے روابط کی وجہ سے بھی عوام میں تعلیم حاصل کرنے کا ایک جوش رونما ہوا۔ اس کا صاف اور سیدھا اثر مسلمانوں پر بھی پڑا اور ہماری قوم میں بھی لوگ تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ ایسے وقت میں بعض مسلم تعلیمی ادارے ہماری نوجوان نسلوں کو تعلیم کی طرف موڑنے میں اور عصری تعلیم کی اہمیت کے مدِّ نظر اسکولوں اور کالجوں میں انہیں داخل کروانے میں کامیاب رہے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں شرح خواندگی بڑھی گو دیگر اقوام کے مقابلے میں، یہ شرح خواندگی ہنوز تشویشناک حد تک کم ہے۔ تاہم اس کے موجودہ رجحان سے مستقبل کے لیے ہماری امیدیں قوی سے قوی تر ہوتی جارہی ہیں۔

آزادی کے بعد سے آج تک کے حالات پر اگر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو ہمارے گجرات سے متعلق ایک بات خاص طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے کہ سوراشٹر میں خاص طور پر جوناگڑھ اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں، بڑودہ شہر اور نواحی علاقوں میں ایسی ہی دیگر مقامات پر جہاں جہاں اردو میڈیم کے اسکول تھے وہ اب بند ہو چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ لیا جاسکتا ہے کہ گجرات کے مسلمانوں میں ایک رجحان صاف نظر آرہا ہے کہ یہاں اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے مادری زبان یعنی گجراتی کو دیگر زبانوں پر فوقیت دی جارہی ہے۔ احمد آباد اردو پرائمری اسکولوں کی تعداد میں ہونے والی کمی بیشی پر نظر ڈالنے سے بھی صاف نظر آتا ہے کہ ایک طرف فصیل کے اندرونی حصوں میں اردو میڈیم میں پڑھنے والے طلبہ کی تعداد تشویشناک حد تک کم ہوتی جارہی ہے تو دوسری جانب شہر کے نواحی علاقوں مثلاً باپونگر، رکھیال، گومتی پور، شاہ عالم، دانی لمڑا، دودھیشور جیسے علاقوں میں اردو میڈیم میں پڑھنے والے بچوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ابھی جو ناموں کو گنوایا گیا ہے ان مقامات میں غیر گجراتی مسلمان زیادہ بستے ہیں جو اپنے بچوں کو خاص طور پر اردو میڈیم میں پڑھانا چاہتے ہیں۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمانوں کو اردو زبان سے نفرت ہو کیونکہ ''طبقات

الاولیاء''، ''کیمیائے سعادت''، غنیت الطالبین''، ''فضائل اعمال''، ''فیضان سنت'' جیسی ضخیم کتابوں کے اردو زبان میں ہی لیکن گجراتی رسم الخط میں کئی ایڈیشن مختلف اداروں کی جانب سے نہ صرف شائع ہو چکے ہیں بلکہ فروخت بھی ہو چکے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ علمائے کرام کی مخالفت کے باوجود گجراتی رسم الخط میں قرآن کریم کا متن مع اردو، گجراتی ترجموں کے گجراتی رسم الخط میں شائع ہوا ہے اور ان کے کئی ایڈیشن بھی نکل چکے ہیں مثلاً ''کنز الایمان'' وغیرہ۔

میونسپل اسکولوں میں یا سرکاری یا نیم سرکاری اسکولوں میں تعلیم کے گرتے ہوئے معیار کے پیش نظر لوگوں کو پرائویٹ اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کا شوق جنون کی حد تک بڑھتا جا رہا ہے۔ گو ایسا کرنے سے ان پر معاشی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ کیونکہ نجی اداروں میں انہیں فیس ادا کرنی ہوتی ہے۔ احمد آباد میں مسلمانوں نے پچھلے برسوں میں کافی پرائمری اور ہائی اسکول شروع کیے ہیں جن میں سے تین یا چار کے علاوہ سبھی اسکول گجراتی میڈیم کے ہیں دو یا تین انگریزی میڈیم کے بھی ہیں۔

پچھلے ہی برسوں میں مسلمانوں کی زندگی کا معیار بھی کافی اوپر تک آیا ہے۔ معاشی طور پر ترقی ہوتی ہے۔ اسی لیے لوگ پرائویٹ اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوا سکتے ہیں۔ گجرات میں باہر سے آکر بسنے والے مسلمانوں کی مالی حالت یہاں کے لوگوں کے مقابلے میں کم تر ہونے کی وجہ سے ان کے بچے زیادہ تر سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں ہی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

ایک اور خاص بات کی طرف میں آپ لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا کہ حالیہ برسوں میں مسلمانوں کا رجحان تکنیکی تعلیم کی طرف بڑھا ہے۔ بیرون ملک ملازمت حاصل کرنے کے لیے تکنیکی تعلیم کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی تعلیم حاصل کرنے والے آسانی سے بیرونی ممالک میں سیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی مسلمان بچوں کو ایک [illegible] تعداد تکنیکی تعلیم کے وصول میں جُٹی ہوئی ہے۔ بیرونی ممالک کی ملازمتوں کے علاوہ یہ تعلیم انہیں اپنے ہی ملک میں خود کے کاروبار شروع کرنے میں اور چھوٹے موٹے

کارخانے شروع کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہیے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں میں خودکفیل ہونے کے لیے ملازمتوں کے مقابلہ خودروزگاری حاصل کرنے کا رجحان بھی بڑھا ہے۔

گجرات میں بار بار ہونے والے فسادات کی وجہ سے یہاں کے عوام کو بار بار جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ بے کس اور مجبور عوام اس طرح کے حادثوں سے بار بار دوچار ہونے والے لوگوں میں الگ الگ آبادیاں بسانے کا ایک کافی غلط رجحان پیدا ہوا ہے۔ جسے وہ جانی اور مالی تحفظ کی مجبوری بتاتے ہیں۔ اس رجحان کی وجہ سے ہی مسلم آبادی کے بڑے مرکز جوہاپورہ، شاہ عالم، بٹوااور سرخیز وغیرہ بنتے جارہے ہیں۔ ان مراکز میں آباد لوگوں کو اپنی تعلیمی اور معاشی حالتوں کو سدھارنے اور سنوارنے کی لگن لگی ہے۔ تعلیمی بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی ہے جو پوری ریاست میں جہاں کہیں مسلمان ہیں دکھائی دے رہی ہے۔ 1969, 1985, 1992, 2001 وغیرہ میں ہونے والے فسادات کی وجہ سے اس بیداری نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف موڑ دیاہے۔ موجودہ زمانے کی ترقی کے ساتھ قدم ملانے کے لیے پورے گجرات میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی باڑھ سی آ گئی ہے۔ ہر ادارہ اپنے طور پر محنت کررہا ہے۔ اور عوام میں خواندگی بڑھانے، تعلیم عام کرنے اور مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کی طرف راغب کرنے میں مشغول ہے۔ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی طرف بھی مسلمانوں کا رجحان نہایت تیزی کے ساتھ بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ نتیجتاً مختلف مکاتیب فکر کے بڑے بڑے مدارس اور دارالعلوم قائم ہورہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان اداروں میں بھی کثیر تعداد میں مسلم بچے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

اسی کے ساتھ ہی اسے سماج کے بچھڑے ہوئے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کافی تعداد میں NGOS ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ جو مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی نیز سماجی اصلاح میں لگے ہوئے ہیں آئے دن کے فسادات کی وجہ سے یتیم اور بے سہارہ ہونے والے بچوں، بیوہ اور لاچار ہوجانے والی عورتوں کی بہبودی کے لیے یہ ادارے کوشاں ہیں۔ ساتھ ہی مسلم عوام کے لیے طبّی سہولتیں بہم پہنچانے کی غرض سے بھی کافی اسپتال اور میڈیکل سینٹر شروع کیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے غریب مفلس اور بے سہارا مسلمانوں کے لیے یہ

ادارے بہت ہی کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔ ان اداروں میں خاص طور پر IQRA, SPRAT, SANCHETNA, AMWA وغیرہ کی خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ دیگر NGOS بھی پوری تن دہی سے جٹے ہوئے ہیں کچھ غیر مسلم NGOS بھی مسلم NGOS کے ساتھ مل کر کام کررہے ہیں۔

گجرات کے 34,000 پرائمری اسکول، 6500 ہائی اسکول اور 2000 ہائر سیکنڈری اسکولوں میں سے صرف 350 اسکول مسلمانوں کے زیرِ انتظام ہیں جن میں پرائمری، سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری اسکول بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں احمد آباد، سورت، کھیڑا کے میونسپل کارپوریشن کے اردو پرائمری اسکول ہیں جن کی تعداد تقریباً 155 سے زائد ہے۔ شہری اسکولوں میں داخلہ لینے والے دیہاتی بچوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ شہر میں قیام کا ہوتا ہے۔ ان کی اضرورت کو پورا کرنے کے لیے گجرات میں مسلمانوں کے 43 ہاسٹل ہیں۔ تشنگان علوم کی تشنگی کو دور کرنے کے لیے پوری ریاست میں مسلمانوں کے ذریعے چھوٹی بڑی کل 35 لائبریریاں یا کتب خانے ہیں۔ گجرات میں سے شائع ہونے والے یومیہ، ہفتہ وار اخبار، پندرہ روزہ اخبار یا ماہانہ رسالوں کی تعداد 50 کے قریب ہے۔ بھروچ میں تین، سورت میں دو، جوناگڑھ اور بڑودہ میں ایک ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ موجود ہیں جو مسلم طلبہ کو تکنیکی میدان میں دیگر طلبہ کے شانہ بہ شانہ رکھنے میں کوشاں ہیں۔ اسی کے ساتھ سورت میں Para Medical انسٹی ٹیوٹ بھی موجود ہے۔

گجرات میں مسلم قوم کی نئی نسل کو نیا آہنگ اور نئی شان دینے کی کوشش میں مصروف تمام اداروں کے ناموں کا ذکر کرنا سردست مناسب نہیں ہے کیوں کہ اس میں کافی وقت درکار ہوگا۔ اس لیے میں کچھ خاص اداروں کے ذکر ہی پر اکتفا کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ جن کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ان اداروں کی اہمیت کم ہے یا ان کی کوشش پرخلوص اور بارآور نہیں۔ احمد آباد کے چار اداروں کی بات میں خاص طور پر کرنا چاہوں گا مثلاً فلاحِ دارین ایجوکیشن ٹرسٹ جو جمال پور میں ہے۔ گزشتہ 35 برسوں میں مسلسل جدوجہد اور پیہم کوششوں کے بعد آج ان کی اسکولوں، مدرسوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی

اداروں کی کل تعداد 27 تک پہنچی ہے۔ جن میں 14000 تقریباً طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ ان کی اسکولوں میں گرلز اسکول، Boys School، مخلوط اسکول ہیں جن میں گجراتی میڈیم، اردو میڈیم اور انگلش میڈیم میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی طرح انجمن اسلام ایجوکیشن ٹرسٹ ہے جس کے ماتحت اردو اور گجراتی میڈیم کے گرلز اسکول اور Boys School چل رہے ہیں۔ گو یہ ادارہ ایک صدی سے بھی زیادہ پرانا ہے مگر کام کرنے کا جنوں اور جذبہ اب بھی جوان ہے۔ ری پبلک ایجوکیشن ٹرسٹ کے ماتحت گجراتی میڈیم کا اسکول ہائر سیکنڈری تک چلا رہا ہے۔ اسی طرح مرزا پور موٹی قریش قصاب جماعت اور ینٹل پرائمری اور ہائی اسکول چلا رہی ہے۔ سورت میں سورت ینگ مسلم گریجویٹ ایسوسی ایشن کی جانب سے گجراتی، اردو اور انگریزی میڈیم کے ہائی اسکول اور پرائمری اسکول خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔ بھروچ میں منوبر والا منشی میموریل چیریٹیبل ٹرسٹ بھی کئی تعلیمی ادارے چلا رہا ہے۔ بڑودہ میں مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کی طرف سے بہت سے گجراتی میڈیم کے اسکول چلائے جا رہے ہیں۔ حسینہ بائی چیریٹیبل ٹرسٹ کی جانب سے انگریزی میڈیم کا اسکول Zenith ہائی اسکول چلایا جا رہا ہے۔ اسلامک اسٹڈی سینٹر بڑودہ کی جانب سے باوانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ چلایا جا رہا ہے۔

پچھلے کئی برسوں سے ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جدت پسند طبقے کی جانب سے دینی مدارس کے نظامِ تعلیم ہزار بار نو غور کرنے کی دعوت فکر دی جاتی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو بھی عصری علوم سکھائے جائیں۔ انہیں مقامی زبانیں، ریاضی، سائنس جیسے مضامین بھی پڑھائے جائیں اس کے بر خلاف دینی ادارے درس نظامی کے طویل اور مشکل ہونے کا بہانہ بنایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود دینی تعلیمی اداروں کی فضا بھی آہستہ آہستہ بدل رہی ہے۔ ۲۰ مئی ۲۰۰۳ کے روزنامہ "The Asian Age" میں شائع شدہ آرٹیکل کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ یہ ترجمہ رسالہ اردو دنیا جولائی ۲۰۰۳ سے لیا گیا ہے۔ ''گجرات میں تقریباً 38 ایسے مدارس ہیں جہاں طلبہ کو قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ انگریزی، ریاضی، سائنس اور کمپیوٹر کی

تعلیم تیز پیشہ ورانہ تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اکل کنواں کنتھاریا، نار کیشور، راندیر، بناس کانٹھا، مانگرول، لونی، چھاپی اور احمد آباد جیسے مقامات کے مدارس نے اپنے طلبہ کو عصری تعلیم دینا شروع کر دیا ہے۔ جامعہ اشاعت العلوم نے اس میدان میں ایک انقلاب لانے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ اس کے ناظم مولانا غلام محمد وسطانوی صاحب نے اپنے ایک حالیہ دورے کے دوران صوبے کے تمام مدارس سے اپیل کی تھی کہ وہ اپنے دائرے کو وسیع کریں، انگریزی اور جدید مضامین کو تعلیم دے کر اپنی اور اپنے طلبہ کی ذہنی سطح کو مزید وسیع اور بلند کریں۔ مدرسہ فیضان القرآن سرس پور، مدرسہ جامعہ دار القرآن سرخیز اور ان جیسے دیگر مدرسوں میں بھی انگریزی اور کمپیوٹر کی تعلیم شروع کر دی گئی ہے۔ (اقتباس پورا)۔

تعلیم کے میدان میں ہونے والی اجتماعی کوششوں اور پیہم عمل کی وجہ سے ہی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی ایک لہر دکھائی دے رہی ہے۔ یہاں کے مسلم عوام اپنے بچوں کو تعلیم کی اس دوڑ میں پیچھے نہیں دیکھنا چاہئے۔ ایک طرف دینی مدارس ومکاتیب میں عصری تعلیم دینے کا رواج ہو رہا ہے تو دوسری جانب کچھ اسکولوں میں دینی تعلیم دینے کی شروعات بھی ہوئی ہے۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھیں تو محسوس ہوگا کہ مستقبل میں ہمارے طلبہ اور نوجوان تعلیم، ملازمتوں، خود روزگاری اور خود کفایت کسی بھی میدان میں انشاء اللہ پیچھے نہیں رہیں گے۔ خدا حافظ۔

۲۱

مرحوم سیّد ابوظفر ندوی۔ بہ حیثیت مترجم

- جناب وفاؔ جونپوری، احمد آباد

تاریخ روزگار سراپا نوشتہ ایم　　شیریں تر از حکایت ما نیست قصۂ

عموماً ہندوستان اور خصوصاً گجرات کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مولوی سید ابوظفر صاحب ندوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف کا تعلق دسنہ (عظیم آباد، پٹنہ) بہار کے ایک دینی اور علمی خاندان سے تھا۔ ان کے پردادا، دادا اور والد سبھی اپنے اپنے زمانے کے ماہر وحاذق طبیب نیز صاحب زہد وتقویٰ تھے۔ ان کے چچا علامہ سید سلیمان ندوی کا نام دنیائے علم وادب اسلامی میں مینارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔

ابوظفر صاحب نے اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد ابوحبیب اور ماموں صغیر الحق صاحب سے حاصل کی۔ تقریباً بارہ (۱۲) سال کی عمر میں ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں بغرض مزید تعلیم داخل ہوئے۔ یہاں انھوں نے اپنے دیگر استادوں کے ساتھ ساتھ خصوصاً مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا شبلی سے بھی خوب اکتساب علم کیا۔

دارالعلوم ندوۃ سے تعلیمی فراغت کے بعد متعدد مدارس ومکاتب میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ کچھ عرصہ ملتان کے ایک عربی مدرسہ میں درس دیا۔ وہاں سے ۱۹۱۵ء میں رنگون گئے۔ دراصل مولانا کا ملتان اور رنگون کا سفر پیرویِ شیخ سعدی میں پوری دنیا کی سیر وسیاحت کا پیش خیمہ تھا۔ لیکن چند ناگزیر وجوہات نے ان کے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ وہ ۲۲۔۱۹۲۱ء میں وارد احمد آباد ہوئے اور گجرات ودیا پیٹھ

(مہاودیالیہ) میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ یہاں کے قیام کے زمانے میں ریاستِ گجرات کے محکمہ آثار قدیمہ کی فرمائش پر ۱۹۲۸ء میں تاریخِ گجرات کی جلد اوّل مرتب کی۔ جو ۱۹۵۸ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کی گئی۔

ابوظفر صاحب ندوی کی پوری دنیا کی سیر وسیاحت کی آرزو جب پوری نہ ہوسکی تو خوب سے خوب تر کی تلاش نے انھیں ہندوستان میں بھی کسی ایک مقام پر مستقل طور پر سکونت پزیر نہ ہونے دیا۔ احمد آباد سے وہ مدراس گئے اور وہاں جمالیہ کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہاں سے ریاست جونا گڈھ کے وزیر تعلیم جناب نواب علی کی دعوت پر جونا گڈھ چلے آئے اور کئی مذہبی وعلمی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۳۳ء میں دار المصنفین نے تاریخ ہند کی تدوین وترتیب کا منصوبہ بنا کر انھیں اعظم گڈھ بلایا۔ موصوف نے وہاں اپنے پانچ سالہ قیام کے دوران مختصر تاریخ ہند، تاریخ سندھ اور تاریخ خاندان غزنہ لکھی۔

۱۹۳۹ء میں کلکتہ پہنچے اور رانبدر ناتھ ٹیگور کی یونیورسٹی شانتی نکیتن میں عربی وفارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن موصوف کی تاریخی خدمات کی ضرورت مشیتِ خداوندی سے آخرش گجرات کے حق میں تھی۔ لہٰذا وہ کلکتہ سے بہت جلد ''رشکِ گلشنِ فردوس'' احمد آباد چلے آئے۔ اور اپنی عمر کے آخری لمحے (کم وبیش ۳۵ سال) تک یہاں کی گجرات ودیا سبھا سے منسلک ہوکر تاریخِ گجرات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق وتدقیق کرتے رہے۔ جس میں گجرات کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی تاریخ مظفر شاہی کو از سرِ نو ایڈٹ کرنا اور دار المصنفین کے پنج سالہ منصوبے کے تحت ہندوستان کی تاریخ کی دس جلدوں میں سے ایک گجرات کی تمدنی تاریخ کی تدوین بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔

سید ابوظفر صاحب ندوی کے قلم سے تاریخی موضوعات پر یوں تو متعدد کتابیں ملتی ہیں لیکن اسی مضمون میں موصوف کو ایک مترجم کی حیثیت سے سمجھنے کی ادنیٰ کوشش کی گئی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے سردست ان کی تین دستیاب کتابوں پر اکتفا کیا ہے۔ اول تاریخ اولیائے گجرات (ترجمہ مراۃ احمدی)، دویم تحفۃ المجالس اور سویم مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسولؐ (سیرتِ احمدیہ)۔

تاریخ اولیائے گجرات فارسی کی گرانقدر کتاب مراۃ احمدی کے آخری حصہ کا اردو ترجمہ ہے جو گجرات کے برگزیدہ اکابرین واولیا کرام کی مقدس سوانح پر مشتمل ہے۔

احمد آباد کے قیام کے زمانے میں ندوی صاحب کے ایک مصاحب اور تاجر کتب حاجی بدرالدین حسین الدین نظامی صاحب کی فرمائش پر مذکورہ تاریخ کا ترجمہ بہ حسن وخوبی ۱۹۳۳ء میں پورا کیا۔ جس کو نظامی صاحب نے حمایت اسلام پریس، لاہور میں چھپوا کر پانچ پٹی احمد آباد سے ۱۹۳۴ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا۔ اس کے بعد گجرات اردو ساہتیہ اکادمی نے مذکورہ تاریخ کو از سرِ نو کمپیوٹر کمپوز کروا کر اپنے اشاعتی پروگرام کے تحت ۱۹۹۳ء میں دوبارہ شائع کیا۔

مراۃ احمدی کے سلسلے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ ترجمہ کی ابتدا سے قبل انہیں دو نسخے دستیاب ہوئے جو بمبئی اور کلکتہ میں بالترتیب ۱۳۰۷ھ اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکے تھے۔ لیکن دونوں نسخے کتابت اور طباعت کی اغلاط سے پُر تھے۔ تلاش بسیار کے باوجود جب کوئی قلمی اور مستند نسخہ دستیاب نہ ہوا تو مذکورہ نسخوں کی مکرّر سہ کرّر تصدیق کر کے جب ان کی صحت پر اطمینان ہو گیا تب ترجمہ مکمل کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا کی طبیعت میں اصل واقعہ کے صحیح ماخذ کی تحقیق کا مادہ کس قدر غالب تھا۔ لہٰذا ہندوؤں کے مندروں اور تیرتھوں کے بارے میں اپنے ایک ہندو دوست پروفیسر پاٹھک جو گجرات کے مشہور ادیب اور گجراتی رسالہ ''پرستھان'' کے ایڈیٹر تھے، ان سے ان امور کے بارے میں صحت کرنے کے بعد ہی ترجمہ کیا جس سے اصل مصنف کی غلطیاں دور ہو گئیں۔ علاوہ ازیں چونکہ مولانا تاریخ گجرات کے خصوصی ماہر تھے اس لئے گجرات کے ایسے بزرگان دین جن کے واقعات کچھ غلط بیان ہوئے تھے ان سب کی تصحیح بھی وہ حاشیہ میں کرتے چلے گئے۔ علاوہ ازیں اپنی مزید معلومات کی بنا پر بعض بزرگوں کے حالات کے ذیل میں اضافی نوٹ بھی تحریر کی ہے۔ اس کے علاوہ اصل متن میں جس چیز کی مزید تشریح ضروری سمجھی اس کو قوسین میں تحریر کر دیا ہے۔ مولانا کی ان تشریحات اور اضافی نوٹ سے واقعات کی سند اور قطعیت مزید بڑھ گئی ہے۔

دیگر یہ کہ مراۃ احمدی کے مصنف نے مضامین کو فصول اور ابواب پر مرتب نہ کرتے ہوئے مسلسل حقائق پیش کئے ہیں۔ لیکن ترجمے میں مولانا موصوف نے قارئین کی سہولت کی غرض سے مضامین کی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے متعدد ابواب کے تحت اس کے ذیل میں فصلیں قائم کی ہیں۔ دیگر یہ کہ مضامین کی جابجا تکرار کو حذف کر دیا ہے۔ نیز طویل قصوں کے بیان میں بھی اختصار سے کام لیا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھا ہے کہ مصنف کا اصل مقصد و منشا متاثر نہ ہونے پائے۔

''تاریخ اولیائے گجرات'' کو ندوی صاحب نے کل نو (۹) ابواب پر منقسم کیا ہے جس میں باب اول میں چھ ذیلی فصول کے تحت شہر احمد آباد کے سنگ بنیاد سے متعلق نہایت سیر حاصل معلومات فراہم کی ہیں۔ شہر کے ۱۲/دروازے، شاہ راہیں، مساجد، اندرون و بیرونِ شہر کے محلے نیز باغات وغیرہ کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے گویا ان تمام مقامات پر بہ نفس نفیس جا کر ایک ایک چیز کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تاریخی شواہد کی روشنی میں ضروری تشریح اور اضافی معلومات بھی فراہم کرتے گئے ہیں۔ مثلاً باب دوم کے فصل اول میں قدم شریف کے بیان میں مجاہدین و شہدائے اسلام کے مقبروں کی صحیح جائے وقوع کے بارے میں حاشیہ میں لکھتے ہیں:

> ''کھمبایت کے متعلق تو آج کل نہ یہ بات مشہور ہے اور نہ تاریخ سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ لیکن راندیر کے متعلق مشہور ہے کہ تابعی یا تبع تابعی کا مزار ہے۔ لیکن کسی تاریخ سے اس کی تائید نہیں ملتی۔ البتہ بھروچ کے پاس بھاڑ بھوت مقام پر ایک تابعی کی شہادت تاریخ سے ثابت ہے۔ آپ کا نام ابو بکر ربیع بصری تھا۔ خلیفہ مہدی عباسی کے عہد ۱۶۰ء/۷۷۶ھ میں بغرض جہاد تشریف لائے۔ بلاذری ذکر سندھ۔''

اسی باب میں دیگر چھ فصول میں حضرت شاہ عالم کی اولاد، پوتوں، پرپوتوں نیز آپ کے خلفاء، اور آپ سے نسبت وارادتمندان کے حالات درج کئے ہیں۔

باب سویم میں تیرہ (۱۳) فصول قائم کئے ہیں۔ جن میں دیگر سلسلے کے اولیاء

نظام کا تذکرہ ہے۔ مثلاً سادات شیرازی، سادات رفاعیہ، سادات عیدروسیہ، سادات عریضی اور سادات مہدیہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ صوبہ احمد آباد کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتوں اور دیگر اضلاع میں مدفون بزرگوں کا بیان ہے۔

باب چہارم کو کل پانچ فصول پر منقسم کیا ہے۔ جن میں احمد آباد کے مختلف باشندے مثلاً بوہرہ، ہندو، برہمن، جین اور ان کے منادر و تیرتھ گاہوں کی مفصل معلومات مستند و مدلل شواہد کے ساتھ درج ہیں۔ مثلاً فصل اول میں بوہرہ قوم کے گجراتی النسل ہونے پر مصنف کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں؟

''مصنف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ان میں سے بعض مصر اور بعض یمن کے علاوہ مکہ و مدینہ، طائف سے بھی آ کر آباد ہوئے۔ البتہ کثیر تعداد گجراتیوں کی ہے۔''

بوہرہ قوم کی مزید تفصیلات ندوی صاحب کی تصنیف ''تاریخ بواہر'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

باب پنجم کے ذیل میں چھ فصلیں قائم کر کے گجرات اور احمد آباد کے مختلف مقامات پر بنے ہوئے منادر اور تیرتھ گاہوں اور ان سے متعلق ہندوؤں کے مختلف فرقوں کے عقاید اور ان سے منسوب مستند روایات کا ذکر کیا ہے۔

چھٹے باب میں تین فصلوں کے تحت مختلف اشیاء کے ناپ تول، جنس اور دواؤں کے اوزان، سے متعلق متفرق اصطلاحات پیش کی ہیں۔

ساتواں باب سات فصول پر مشتمل ہے۔ اس میں محکمہ نظامت، تھانے، دیوان، کچہری، عدالت، ڈاک، خزانہ، چوکی، ٹکسال، عمارت، دارالشفاء وغیرہ امور سے متعلق کافی تفصیل اور وضاحت سے معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

آٹھویں باب کے ذیل میں گیارہ (۱۱) فصلیں ہیں۔ اس میں احمد آباد اور صوبۂ گجرات کے دیگر ضلعے اور پرگنے، ان کے مواضعات و سالانہ آمدنی، فوجداری و تھانہ داری کی تفصیل درج ہے۔

نویں باب میں پانچ فصلیں ہیں۔ جس میں صوبہ گجرات کی بندرگاہیں، جزائر،

دریا، اضلاع کے قدیم نام، پہاڑ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔

دسواں اور آخری باب گجرات کی چند نادرات اور عجائبات پر مشتمل ہے۔

تاریخ اولیاء گجرات کے اس مختصر تعارف کے بعد اس کتاب کے عنوان کی روشنی میں قاری کے ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا بعید از قیاس نہیں کہ مولوی صاحب نے جہاں میراۃ احمدی میں مندرج بعض واقعات وتفصیلات کی صحت سے اختلاف کرتے ہوئے صحیح اور مستند نکات حاشیے میں تحریر کئے وہیں کتاب کے عنوان سے گریز کرتے ہوئے گجرات کے اولیا کرام وصالحین کے تذکرے کے بعد دیگر سات ابواب کے تحت مختلف اقوام، منادر، ناپ تول کے آلات واوزان، انتظامات، اضلاع ومواضعات کی آمدنی، بندرگاہیں، جزیرے، دریا، پہاڑ، عجائبات ونادرات پر منحصر جو مشمولات درج کیں وہ کتاب کے عنوان سے کہاں تک علاقہ رکھتی ہیں اور مذکورہ بالا ابواب کی عدم موجودگی سے کتاب کی افادیت اور اہمیت باعتبار موضوع کس حد تک متاثر ہو سکتی ہے۔

تاریخ اولیاءِ گجرات کے بعد سید ابوظفر صاحب نے مزید دو کتابیں ''تحفۃ المجالس'' اور ''مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسولؐ'' (سیرت احمدیہ) ترجمہ کیں۔ یہ دونوں کتابیں حضرت مخدوم قطب عالم شیخ احمد کھٹوی کی سوانح عمری اور ملفوظات پر مشتمل ہیں۔

''تحفۃ المجالس'' کا ترجمہ مولانا نے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانے کے نسخہ نمبر ۴۷۱/۸ سے کیا جو کتابت اور عبارت کی اغلاط سے پُر ہے۔ تاہم یہ مولوی صاحب ہی کا علمی تبحر اور تاریخی بصیرت تھی کہ مضامین کی صحت کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت سلیس اور عام فہم ترجمہ ۱۹۳۷ء میں مکمل کر کے اس وقت کی کمیٹی درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے صدر جناب حاجی سیٹھ شیخ احمد صاحب کملوڑی والے کے نام منسوب کیا۔ یہ کتاب درگاہ پیر محمد شاہ کے سلسلہ مطبوعات کے تحت مطبع معارف اعظم گڈھ سے ۱۹۳۹ء/ ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوئی۔

قطب عالم شیخ احمد کھٹو دہلی پر حملۂ تیمور کے ہنگامے کے بعد گجرات تشریف لائے اور پٹن میں قیام فرمایا۔ چند دنوں بعد مراقبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں

سرکھیج احمد آباد میں آ کر مقیم ہوئے۔

سرکھیج کے قیام کے زمانے میں ایران سے ایک محمود ایرجی نامی بزرگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شیخ احمد کی خواہش پر مع اہل وعیال یہیں قیام کیا۔ اور شیخ کے حالات وملفوظات ان کی اجازت سے روزنامے کی شکل میں ''تحفۃ المجالس'' کے نام سے تحریر کرتے رہے۔

تحفۃ المجالس کل پچھتر (۷۵) مجالس پر مشتمل ہے۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس میں مندرج واقعات کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ شیخ محمود ایرجی چونکہ احمد آباد کے محلّہ بھنڈیری پول (کالوپور) میں رہتے تھے اس لئے ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ چند گھنٹوں کے لئے اپنے شیخ کی خدمت میں حاضری دے کر واپس آجاتے۔ اس لئے وہ صرف انہیں واقعات اور حالات کو قلمبند کر سکے جنہیں اس مختصر وقفے میں سنایا دیکھا۔

''تحفۃ المجالس'' کے بالمقابل شیخ احمد کھٹو کی مکمل سوانح پر لکھی جانے والی دوسری کتاب ''مرقاۃ الرسول الی اللہ والرسولؐ'' ہے۔ جس کے مصنف مولانا محمد قاسم، امام جامع مسجد سرکھیج اور شیخ احمد کے مرید ہیں۔ وہ تقریباً تیس سال شیخ احمد کی خدمت میں رہے اور ان کی وفات کے بارہ (۱۲) سال بعد اس کتاب کو ترتیب دیا۔ یہ کتاب سولہ (۱۶) فصلوں پر منقسم ہے۔ اس کتاب میں حضرت شیخ احمد کھٹو کی ولادت، تعلیم وتربیت، عبادت، ریاضت، کشف وکرامات وغیرہ کے مفصل حالات درج ہیں۔ تحفۃ المجالس کے مقابلے میں اس کتاب میں زیادہ حالات شامل ہیں۔ نیز واقعات کے انتخاب میں صحت اور ترتیب زمانی کا خاص خیال رکھا ہے۔

مولانا قاسم نے ''مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول'' لکھنے کی وجہ احباب اور دیوانی محکمہ کے افسران کا اصرار بتایا ہے۔ لیکن ندوی صاحب نے ترجمے سے قبل دونوں تصانیف کا غائر مطالعہ کیا ہوگا۔ جس سے وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ تحفۃ المجالس میں متعدد مقامات پر شیخ محمود نے مولانا قاسم کا تذکرہ اچھے الفاظ میں نہیں کیا ہے۔ یہ بات فطرتاً مولانا کے معتقدین کو ناگوار گزری ہوگی اور انہوں نے مذکورہ کتاب کی تردید یا جواب میں دوسری

کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی ہوگی۔ دونوں کتابوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے متعدد واقعات ہیں جو تحفۃ المجالس میں شامل ہیں لیکن مولانا قاسم نے انکو اپنی تصنیف میں شامل نہیں کیا۔ کیوں کہ یا تو وہ صحت کے اعتبار سے مستند نہیں تھے یا پھر شیخ محمود کو مغالطہ ہوا ہو۔ مولانا نے اس قسم کا ایک دو واقعہ مثالاً تحریر کیا ہے۔ مثلاً سفر حجاز میں جہاز سے گر کر پانی پر چلنے کا واقعہ یا چالیس (۴۰) شہداء کا واقعہ جو کوہ قاف میں تھے۔ حالانکہ ہندوستان سے جدہ یا مکہ جانے میں مقام کوہ قاف آتا ہی نہیں اور نہ ہی ان دو مقامات کے درمیان کوئی سمندری راستہ ہے۔

اسکے علاوہ متعدد واقعات تحفۃ المجالس میں ایسے ہیں جن کو نہ تاریخی شہادت قبول کرتی ہے نہ عقلی دلائل۔ اور اسی لئے ندوی صاحب نے ترجمے کے ساتھ ساتھ ایسے واقعات کے ضمن میں حاشیہ میں اسکی تصریح اور وضاحت کردی ہے۔ جنکی تفصیل اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔

''مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسولؐ'' کے اردو ترجمے کا نام مولانا ابوظفر صاحب نے سیرت احمدیہ رکھا ہے۔ اس کے ترجمے کے وقت ان کے سامنے دو نسخے موجود تھے۔ ایک سید حسینی پیر صاحب کا عنایت کردہ اور دوسرا قاضی احمد میاں اختر (جوناگڑھی) کی طرف سے درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتب خانہ میں بھیجا گیا نسخہ۔ چونکہ یہ دونوں نسخے بھی اپنی عبارت اور صحت کے اعتبار سے ناقص تھے لہذا مولانا نے دونوں کا بنظر غائر مطالعہ کر کے ضروری تصحیح کی اور اس کے بعد نہایت سلیس، اور آسان ترجمہ ۱۹۴۵ء میں مکمل کیا۔

مولانا ابوظفر چونکہ عربی اور فارسی کے عالم وفاضل تھے۔ اس لئے اصل کتاب میں عربی آیات، احادیث اور دیگر عبارات کا خلاصہ اور تصریح بھی جابجا سلیس اردو میں کی ہے۔ اسکے علاوہ متعدد عربی وفارسی کے اشعار کا نہایت آسان اور عام فہم ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ یہ اشعار سلوک، عشق الٰہی اور بے ثباتی دنیا اور توحید جیسے خشک موضوع کے ذیل میں نقل ہوئے ہیں۔ ایک دو عربی اشعار کا ترجمہ دیکھیں جو فصل آٹھ کے ذیل میں توحید کے بیان میں حضرت شیخ سے منقول ہیں۔

ے انسانی عمر صرف دو گھنٹوں کی ہے۔ایک گھنٹہ گزر گیا اور دوسرے کے آنے کی اُمید کرتا ہے۔

ے ''اور کتنی لذتیں صرف ایک گھڑی کی ہیں جس کے لئے حریص کوشش کرتا ہے۔حالانکہ اس کا حاصل کرنا کچھ یقینی نہیں ہوتا''۔

اسطرح فارسی اشعار کا ترجمہ بھی نہایت آسان معلوم ہوتا ہے۔مثلاً بے ثباتی دنیا سے متعلق حضرت شیخ کی مندرجہ ذیل رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

ے ''اگر میری مرضی پر آنا ہوتا تو میں نہ آتا اور میرا وجود میری خواہش پر ہوتا تو نہ ہوتا۔ یہ سب سے بہتر ہوتا کہ اس کمینی دنیا میں نہ میں آتا، نہ میری شد، بُد ہوتی۔'' وغیرہ

تاریخ اولیاء گجرات کی طرح ندوی صاحب نے سیرتِ احمدیہ میں نہ تو مختلف ابواب قائم کئے اور نہ اس کی ذیلی فصلیں متعین کیں۔ بلکہ مولانا قاسم کے قائم کردہ سولہ ابواب کو جوں کا توں رکھا ہے۔لیکن قارئین کی سہولت اور دلچسپی کی غرض سے مولف نے جہاں پر واقعہ کو لفظ ''حکایت'' سے موسوم کیا ہے اس میں مولانا نے یہ تبدیلی کی کہ مضمون کی مناسبت سے ایک عنوان قائم کر دیا۔ مثلاً فصل گیارہ کے ذیل میں کشف وکرامت اور عجائبات کے بیان میں حسبِ ذیل عنوان قائم کئے۔

رفتار کی تیزی، کوٹھے سے گرنے کا واقعہ، مراقبہ میں کشف، خواجہ خجر وغیرہ۔

الغرض مذکورہ بالا تینوں تصانیف کے اُردو ترجمے اس بات کے شاہد ہیں کہ ابوظفر صاحب عربی و فارسی کے کس درجہ متبحر عالم وفاضل تھے۔ وہ واقعات کی صحت اور سند میں کس درجہ تلاش وتحقیق سے کام لیتے تھے۔ چونکہ تاریخی بصیرت بدرجۂ اتم ان میں موجود تھی اس لئے غیر مستند اور غلط عبارت کی تردید کر کے صحیح اور مدلل نوٹ اور خلاصہ حاشیہ میں ضرور تحریر کرتے اور ساتھ ہی ضمنی معلومات بھی فراہم کر دیتے۔ یقیناً موصوف جیسی نابغہ روزگار شخصیت کی کمی ہمیشہ محسوس کیجاتی رہے گی۔ آخرش علم وادب کا یہ نیر تاباں پھر کبھی نہ طلوع ہونے کیلئے ۲۸ رمئی ۱۹۵۸ء کو غروب ہو گیا۔ ان اللہ وان الیہ راجعون۔ بقول شاعر:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

جہاں تک مولانا سید ابوظفر ندوی کی ہست پہل شخصیت پر ان کی مجموعی عملی، ادبی اور تاریخی خدمات کے اعتراف کا تعلق ہے، گجرات میں ہنوز اس جانب توجہ اور تحقیق کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اُمید ہے کہ گجرات سے کوئی محقق یا اسکالر ضرور اس جانب اپنی توجہ مرکوز کریں گے اور صحیح معنوں میں تب ہی مولانا موصوف کی گجرات کے تئیں خدمات کے اعتراف کا حقیقی حق ادا ہو سکے گا۔

۲۲

حضرت شیخ مخدوم رحمت اللہ

- پروفیسر جمال الدین شیخ
(سدگنا گرلز کالج، احمد آباد)

ملک عرب میں ظہور مذہب اسلام کے فوراً بعد اسلام کے داعیان اور مبلغین نے سرزمین ھند کو اپنے مبارک قدموں کا شرف بخشا [۱]۔ سرزمین ہندوستان پر اسلامی حکومت قائم ہونے سے قبل مختلف سلسلوں کے مشائخ ھند کے گوشہ گوشہ میں پہونچ کر رشد وھدایت، تعلیم وتلقین، فکر وذکر اور ریاضت میں مشغول ہوگئے تھے۔[۲]

گجرات میں گوجر راجپوت حکومت انہلواڑہ یا نہروالا پٹن میں قائم ہونے کے ساتھ ہی صوفیائے کرام نے گجرات کو اپنے میشن کا مرکز بنایا۔ جن سلسلۂ مشائخ نے اپنے کارھای نمایاں سے گجرات میں دوامی شہرت پائی ان سلسلۂ مشائخین میں سلسلۂ چشتیہ عالیہ اور سلسلۂ سہروردیہ عالیہ سرفہرست ہیں۔[۳] ان دو سلسلوں کے خاندانوں میں سات پشتوں تک جید عالم پیدا ہوئے ہیں۔ عالم اسلام میں اس کی مثال شاذ ونادر ہی ملتی ہے۔ یہ سلسلے سرزمین گجرات اور زین البلاد شہر معظم احمد آباد کے لیئے باعث فخر ہیں[۴]۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہندوستان میں سلسلۂ چشتیہ عالیہ کو روشناس کرانے والے عظیم المرتبت سلطان الھند خواجۂ خواجگان، ھند الولی عطائے رسول حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی اجمیری ہیں۔ آپ کے خلفای کبار نے سلسلہ چشتیہ عالیہ اور اس کی تعلیم کو ھندوستان کے کونے کونے تک پہونچانے میں جاں فشانی سے کام لیا ہے۔[۴]

گجرات میں پہونچ کر مسند مشیخت پر جلوہ افروز ہوکر رشد وہدایت، فکر وذکر، اوراد

ووظائف میں مشغول ہونے والے سلسلۂ چشتیہ کے موقر مشائخ حضرت قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کے خلفاء میں شیخ محمود نہروالی[5]، شیخ حامد الدین نہروالی[6]، مولانا حسام الدین ملتانی (متوفی ٧٣٦ھ)[7]، حضرت کمال الدین یعقوب (متوفی ٧٩٨ھ)[8]، حضرت سید حسین (متوفی ٧٩٨ھ)[9]، مولانا حسام الدین[10] اور حضرت بارک اللہ چشتی[11] ہیں۔ اس سلسلۂ چشتیہ عالیہ کو گجرات میں بام اوج پر پہونچانے والے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے بھانجے اور خلیفہ علامہ کمال الدین کا خاندان گجرات واحمد آباد میں مشہور ومعروف ہے۔

نویں صدی ھجری کے عظیم صوفی حضرت شیخ بابا مخدوم رحمت اللہ بن عزیز اللہ متوکل بن یحیٰ بن لطیف الدین دریا نوش جن کا روضۂ اقدس موجودہ گاندھی دھام ریلوے اسٹیشن کی مغربی سمت اور احمد آباد میونسپل کارپوریشن کی نگری آنکھ کے اسپتال کے شمال میں واقع کلیان سوسائٹی میں ہے۔ بابا رحمت اللہ نے یہاں ڈیرا ڈال کر خانقاہ قائم کی اور رشد وھدایت وعبادت وریاضت وخدمت خلق میں مصروف ہوگئے تھے۔ آپ کی خانقاہ کی وجہ سے یہ علاقہ آباد اور پر رونق ہوگیا تھا۔ آپ کے نام کی نسبت سے یہ علاقہ شیخ پورہ کے نام سے مشہور ومعروف ہوگیا تھا۔ آپ کے بارے میں ہماری معلومات نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کے مشہور ومعروف خلیفہ اور گوجری (قدیم اردو) کے استاد شاعر بہاؤ الدین باجن جن کا روضۂ پر انوار برھانپور مالوہ میں مرجع خلائق ہے[12] ان کی مشہور تصنیف ''خزانۂ رحمت'' میں اپنے مرشد کامل کے جو حالات قلم بند کیے ہیں کسی دوسری کتاب میں دستیاب نہیں ہیں۔ ''خزانۂ رحمت'' سات خزانوں پر مشتمل ہے۔ خزانۂ اول میں چار مناقب ہیں اول میں حضرت شیخ مخدوم رحمت اللہ کے حالات دیئے گئے ہیں، مناقب دوم میں شیخ رحمت اللہ کے والد بزرگوار عزیز اللہ متوکل کا بیان ہے، مناقب سوم میں شیخ رحمت اللہ کے جد امجد حضرت لطیف الدین دریا نوش کے حالات درج ہیں، مناقب جہارم میں مرشد کامل شیخ محمد زاھد چشتی، شاہ جلال اور شیخ فرید الدین گنج شکر کے حالات کا ذکر ہے۔ انھیں چار مناقب سے استفادہ کا شرف حاصل کیا ہے۔

سلطان الاولیاء محبوب الٰہی نظام الدین کے مرید وخلیفہ حضرت شیخ لطیف الدین دریا نوش کے چشم و چراغ حضرت یحییٰ کے واصل بحق ہو جانے کے بعد آپ کے دونوں صاحبزادے شیخ احمد اور شیخ عزیز اللہ نے اپنی والدہ محترمہ سے نہروالا پٹن (گجرات) جانے کی اجازت طلب کی، ماں نے انھیں ایک چادر بطور نشانی عنایت فرمائی۔ دونوں بھائی دہلی سے رکن الدین کان شکر کے پاس نہر والا پٹن اپنی والدہ کی دی ہوئی چادر کے ساتھ پہونچے۔ حضرت رکن الدین کان شکر کو بذریعہ کشف معلوم ہوا کہ شیخ یحییٰ بن لطیف الدین دریا نوش دہلوی کے فرزند دروازے پر آئے ہیں۔ دونوں بھائیوں کو حجرہ میں طلب کیا اور نہایت شفقت اور محبت سے پیش آئے۔ [۱۳] کچھ عرصے کے بعد شیخ احمد کو دہلی واپس روانہ کرتے ہوئے ارشاد عالی ہوا کہ ''اے محمد تمہیں والدہ ماجدہ کی خدمت میں فیض حاصل ہوگا اور نعمت خداوندی بھی ملے گی''۔ عزیز اللہ کو اپنی تربیت میں رکھا۔ ظاہری اور باطنی علم سے آراستہ کیا۔ سلوک کی منزلیں طے کروائیں اپنا مرید کیا اور نعمت خلافت سے سرفراز کیا۔ اور فرمایا ''اے عزیز اللہ قلعہ مانڈو تمہارے حوالے کیا، مانڈو گڈھ کے چار حوض کے درمیان قیام کرنا'' [۱۴]۔

شیخ عزیز اللہ نے اپنے پیر ومرشد عالی مقام سے اجازت طلب کی اور احمد آباد تشریف لائے۔ اس دوران قطب الاقطاب شیخ مخدوم احمد گنج بخش مغربی سرکھیجی نے ۱۴ شوال بروز جمعرات قبل از وقت زوال ۸۴۹ھ میں راہ عدم کا سفر اختیار کیا [۱۵]، عزیز اللہ نے فرمایا ''میں اور میرے بھائی ایک ہی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ برادر عزیزم شیخ احمد حقیقی سفر پر چل پڑے اور عزیز اللہ مجازی سفر کے لیے روانہ ہوگا [۱۶]، شیخ عزیز اللہ متوکل احمد آباد سے بھروچ ہوتے ہوئے نندربار پہونچے مالوہ کا سلطان محمود خلجی آپ کا استقبال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے شادی آباد عرف مانڈو گڈھ آنے کی مؤدبانہ درخواست کی۔ عزیز اللہ نے استقبال کے لیے منع فرمایا اور چند شرطیں رکھیں جسے سلطان محمود خلجی نے بلا تامل قبول کیں۔ آپ شادی آباد عرف مانڈو گڈھ تشریف لے گئے اور چار حوض کے پاس قیام کیا [۱۷]۔

حضرت شیخ مخدوم عزیز اللہ متوکل نے تمام فرزندوں کو طلب کیا۔ اور انھیں مرید کیا

لیکن رحمت اللہ اور ان کی حقیقی بہن عائشہ کو شرف مریدی سے محروف رکھا۔ ایک روز رحمت اللہ کی والدہ محترمہ نے عزیز اللہ متوکل سے بروی التماس عرض کیا کہ رحمت اللہ اور عائشہ کو مرید کیوں نہیں کیا۔ مخدوم شیخ عزیز اللہ نے فرمایا ان کی نعمت چشت میں ہے۔ چشت سے کوئی تشریف لائے گا اور انھیں شرف مریدی سے نوازے گا[۱۸]۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ مخدوم محمد مودود چشتی بن خواجہ محمد زاھد چشتی اپنے والد بزرگوار سے کسی معاملہ میں ناراض ہو کر احمد آباد تشریف لائے ہیں۔ اور مغلپورہ میں قیام کیا ہے۔ حضرت خواجہ محمد زاھد چشتی بھی مغلپورہ میں اپنے صاحبزادے کو سمجھانے احمد آباد میں وارد ہوئے ہیں[۱۹]، خواجہ محمد زاھد نے چند روز اپنے فرزند کے پاس قیام فرما کر اسے بہت سمجھایا لیکن صاحبزادے سمجھنے کے لیئے تیار نہیں ہوئے، آخر اپنے فرزند سے دل برداشتہ ہو کر مغلپورہ سے شیخ عزیز اللہ کے مکان پر تشریف لائے۔ ارشاد عالی ہوا، ''اے عزیز اللہ تمہارے بچوں کو میرے سامنے حاضر کیجئے'' حکم کی تعمیل کی گئی۔ رحمت اللہ کی طبیعت ناساز ہونے کی بنا پر انھیں اور ان کی ہمشیرہ عائشہ کو پیش نہیں کر سکے۔ خواجہ محمد زاھد نے نام کے ساتھ طلب کیا[۲۰]۔ بعد ازاں رحمت اللہ اور ان کی بہن کو خواجہ محمد زاھد چشتی کے سامنے حاضر کیا گیا، جب خواجہ محمد زاھد چشتی کی نظر شیخ رحمت اللہ پر پڑی، آپ بے ساختہ بول اٹھے ''سبحان اللہ'' خادموں میں سے ایک خادم کو طلب کیا۔ آپ نے تہہ بند باندھا اور تمام جامے جسم سے اتار کر خادم کو دیئے۔ بعد ازاں یہ جامے شیخ رحمت اللہ کو پہنچائے[۲۱]۔ عائشہ کے سر پر ٹوپی رکھی اور فرمایا۔ ''اے عزیز اللہ یہ میرے بچے ہیں[۲۲] اور یہ لڑکی مردوں کا کام کرے گی اور مردوں کا کام اللہ پر کامل توکل رکھنا ہے''۔ خواجہ محمد زاھد چشتی نے مجلس میں شیخ رحمت اللہ کے ساتھ عائشہ کو بھی مرید کیا اور شیخ رحمت اللہ کو نعمت خلافت کا شرف بخشا[۲۳]۔

ایک روز تمام فرزندوں کو عزیز اللہ متوکل نے طلب کیا اور فرمایا ''تم سب علم و فن میں کامل ہو اور میری درویشی بھی تم پر واضح ہے۔ درویشی وہ نہیں کہ زمانہ میں مشہور و معروف ہو جانا۔ سلاطین سے کوئی چیز قبول نہ کریں۔ غیب پر نظر رکھیں اور غیب سے جو ملے اس پر قانع رہیں۔ میری قبر تیار کریں۔ زیارت کے تیسرے روز میری قبر کے قریب کوئی نہ

رہے ۲۴؎ یہ چند نصیحتیں کیں اور صاحبزادوں کو رخصت کیا اور خود عبادت میں مشغول ہو گئے۔ دوسرے روز علی الصبح تمام فرزند زیارت کا شرف حاصل کرنے پہونچے۔ دیکھا کہ حضرت مخدوم عزیز اللہ حالت سنجیدہ میں اپنی جان عزیز جانانِ حقیقی کو سپرد کر چکے تھے۔ آپ اتوار ۲۳ ماہ صفر ۸۵۲ھ کو دار الفنا سے دار البقا کوچ کر گئے ۲۵؎، آپ کی ولادت باسعادت ۷۶۸ھ میں بمقام دہلی ہوئی تھی۔ وصال کے وقت آپ کی عمر ۸۵ سال کی تھی ۲۶؎ آپ کا روضۂ اقدس شادیاباد عرف مانڈوگڈھ میں مرجع خلائق ہے آپ نسبتاً فاروقی ہیں ۲۷؎ آپ کا نسب نامہ درج ذیل ہے۔

نسب نامۂ عزیز اللہ بن یحییٰ بن لطیف الدین دریا نوش

(۱) عزیز اللہ متوکل بن (۲) یحییٰ بن (۳) لطیف الدین دریا نوش شرفی القریشی الفاروقی الحسنے والحسنے بن (۴) عطاؤ الدین بن (۵) قاضی یعقوب بن (۶) شیخ سراج الدین بن (۷) شیخ عبدالرحمٰن بن (۸) شیخ محمد بن (۹) شیخ طبیب بن (۹۱۰ طاہر بن (۱۱) سلیمان بن (۱۲) طاہر احمد المعروف شمس بن (۱۳) فرخ شاہ کابلی بن (۱۴) سیمان بن (۱۵) نصیر الدین بن (۱۶) سیمان بن (۱۷) عبدالطیف بن (۱۸) عبدالجلیل بن (۱۹) واعظ لاصغر بن (۲۰) واعظ الاکبرین (۲۱) ابوالفتح بن (۲۲) اسحاق بن (۲۳) ناصر الدین ابراھیم بن (۲۴) عبدالعزیز بن (۲۵) ریاح بن (۲۶) عبداللہ بن (۲۷) حضرت امیر المؤمنین عمر فاروق بن (۲۸) الخطاب (۲۹) نفیل بن (۳۰) عبدالعزیز بن (۳۱) ریاح بن (۳۲) عبداللہ بن (۳۳) فرطہ بن (۳۴) عدی بن (۳۵) کعب بن (۳۶) لوی۔

آپ کے مرشد کامل حضرت شیخ مخدوم رکن الدین کانِ شکر چشتی ۲۲ رشوال ۹۱۲ھ میں واصل بحق ہوئے ۲۸؎ رحلت سے قبل اپنے مرید وخلیفہ حضرت شیخ عزیز اللہ متوکل کو اپنا خرقہ، عصا اور مصلا عطا کیا تھا ۲۹؎۔ شیخ عزیز اللہ متوکل کے پانچ فرزند صاحب ولایت تھے ۳۰؎۔

(۱) شیخ حسن سرمست عرف کریم اللہ۔آپ کا مزار شریف بھروچ شہر میں ہے۔
(۲) شیخ سعد اللہ شیخ پورہ احمد آباد(گجرات)میں مدفون ہیں۔
(۳) شیخ رحمت اللہ دریائے سابرمتی کے کنارے خود کا آباد کیا ہوا شیخ پورہ بمقام احمد آباد عالی شان مقبرے میں محو استراحت ہیں۔
(۴) شیخ شکر اللہ معروف بہ شیخ بھور مانڈو گڈھ میں ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں۔
(۵) شیخ نصر اللہ اسیر گڑھ میں محو خواب ہیں۔

آپ کا توکل اتنا بلند تھا کہ ''یوم جدید رزق جدید'' (نیا دن نیا رزق) گھر میں کوئی چیز رکھی نہیں جاتی تھی۔ یہاں تک کہ رات کو پانی بھی اتنی مقدار میں رکھا جانا جو تہجد میں وضو کے لیے کافی ہو سکے۔ بیٹی درالملکہ کا دودھ چھڑایا جانے کے سبب سے دودھ میں روٹی بھگو رکھی تھی۔ بابا حضرت مخدوم گھر آئے اور کہا گھر میں کوئی دنیوی چیز ہے جواب ملا کہ دودھ میں روٹی بھگوئی ہوئی ہے۔آپ نے حکم دیا اسے کسی سائل کو دے دو یا جانور کو کھلا دو۔ گھر والوں نے حکم کی تعمیل کی بچّی بھوک کے مارے تلملانے لگی۔ ماں نے بچی کو آپ کے قدموں کے پاس لیٹا دیا۔آپ نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا بچی کے منہ میں دے دیا اور بچی چپ ہوگئی۔غیب سے ندا آئی ''عزیز اللہ المتوکل علیٰ اللہ'' اس کے بعد آپ اس لقب سے مشہور ومعروف ہوگئے [۳۱]۔ شیخ عزیز اللہ نے اپنی دختر نیک طالع دار الملکہ (غالباً عائشہ سے مراد ہے) کی شادی خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کے بھانجے اور موقر خلیفہ علامہ کمال الدین [۳۱ الف] کے خاندان میں ہونہار صاحبزادے حضرت محمود راجن ابن خواجہ علم الدین ابن سراج الدین چشتی کے ہمراہ کی تھی۔ [۳۲] حضرت شیخ مخدوم عزیز اللہ متوکل نے اپنے اقبال مند داماد محمود راجن کو نعمت خلافت سے نوازا تھا۔ [۳۳]

شجرۂ خلافت درج ذیل ہے:

(۱) حضرت شیخ محمود راجن چشتی
(۲) حضرت شیخ مخدوم عزیز اللہ متوکل
(۳) حضرت شیخ خواجہ رکن الدین کان شکر

(۴) حضرت خواجہ محمد زاھد چشتی

(۵) حضرت ابو یوسف چشتی

(۶) حضرت قطب الدین محمد

(۷) حضرت خواجہ محی الدین علی بن رکن الدین محمد

(۸) حضرت رکن الدین محمد بن ابی احمد

(۹) حضرت خواجہ احمد ابدال

(۱۰) حضرت ابی اسحاق ثانی

(۱۱) حضرت خواجہ شمشاد دینوری

(۱۲) حضرت ھبۃ اللہ بصری

(۱۳) حضرت حذیفہ مرعشی

(۱۴) حضرت سلطان ابراھیم اودھم بلخی

(۱۵) حضرت فضیل بن عیاض

(۱۶) حضرت عبدالواحد بن زید

(۱۷) حضرت خواجہ حسن بصری

(۱۸) حضرت امیر المؤمنین خلیفہ چہارم حضرت علی کرم اللہ وجہ [۳۴]

جس وقت حضرت شیخ عزیز اللہ نہروالا میں مقیم تھے۔ ایک روز آپ کے مرشد عالی بھی آپ کے قریب خانہ پر تشریف فرما تھے۔ اس دوران... زور سے بارش ہو رہی تھی [۳۵]۔ عزیز اللہ متوکل کے یہاں فرزند نیک بخت کی ولادت باسعات کی مبارک خبر پہونچی۔ مرشد عالی شیخ رکن الدین کان شکر نے فرمایا ''درخانۂ عزیز اللہ رحمت اللہ آمد'' [۳۶]۔ یعنی عزیز اللہ کے گھر خدا کی رحمت آئی۔ مرشد کامل کے قول کی نسبت سے بچہ کا نام نامی اسم گرامی ''رحمت اللہ'' تجویز پایا [۳۷]۔

ایک روز سید السادات قطب زماں سید عبا اللہ برھان الدین قطب الدین عالم بخاری سہروردی بغرض ملاقات شیخ عزیز اللہ متوکل کے مکان پر تشریف لائے ہوئے تھے۔

آپ نے شیخ رحمت اللہ کو بھی ملاقات کا شرف بخشا اور فرمایا مخدوم شیخ بابا رحمت اللہ کو اسم با مسمّٰی پایا[۳۸]۔ شیخ رحمت اللہ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ پہلے خواجہ محمد زاھد چشتی سے خرقہ اور نعمت خلافت پائی[۳۹] اور بعد اپنے پدر محترم کی ترتیب میں رہے اور والد محترم نے نعمت خلافت سے سرفراز کیا۔ آپ بارہ سال کی عمر سے ہی عبادت و ریاضت میں مشغول رہنے لگے۔ توکل میں اپنے والد بزرگوار کے نقش قدم پر قائم رہے۔ تمام عمر تارک الدنیا اور مجرد رہے[۴۰]۔

نہروالا پٹن شہر کے مفتی میاں ابوالقاسم نبیرۂ خواجہ احمد اجمیری سے روایت ہے کہ ایک روز مخدوم بابا رحمت اللہ کے آستانۂ عالی پر بغرض ملاقات حاضر ہوا، قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور مجلس عالی میں بیٹھ گیا۔ اس دوران ایک درویش آیا اور اپنی بپتا سنانے لگا اور کہنے لگا " آقا میری بہت خستہ حالت ہے"۔ توجہ فرمائیں حضرت بابا رحمت اللہ نے اسے بیٹھنے کے لیئے اشارہ کیا، وہ فقیر بیٹھ گیا۔ اچند لمحے گزرے ہونگے ایک شخص غیب سے نمودار ہوا کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز کو حضرت شیخ مخدوم کے سامنے رکھتے ہوئے آپ کے دست مبارک میں ایک خط دیا اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ مخدوم بابا رحمت اللہ نے بیٹھے ہوئے درویش سے مخاطب ہوکر فرمایا۔ جو کچھ اس کاغذ میں بندھی ہوئی چیز ہے اٹھالو اس درویش نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کاغذ میں لپٹی ہوئی چیز کو مع کاغذ اٹھالی اور سلام کر کے رخصت ہوا۔ مجھے وداع کر کے بابا رحمت اللہ اپنے حجرہ میں تشریف لے گئے۔ میں نے درویش کا تعاقب کیا کہ کاغذ میں کیا ہے۔ درویش نے کاغذ کھولا وہ خالص سونا تھا۔ میں نے درویش سے کہا جاؤ یہ میرے خواجہ کی عنایت ہے۔ درویش چلا گیا۔ میں نے تھوڑا توقف کیا اور شیخ کے خادموں سے پوچھا کہ شیخ کے گھر کا کیا حال ہے۔ خادموں نے جواب میں کہا شیخ کے گھر میں تین روز سے فاقہ ہے۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل پڑا سبحان اللہ شیخ مخدوم کا کیا فقر اور کیا غنا ہے[۴۱]۔

جس وقت سلطان محمود بیگڑا (۸۶۳ھ تا ۹۱۷ھ/ ۱۴۵۹ء تا ۱۵۱۱ء) بن سلطان محمد گجراتی کو شیخ مخدوم رحمت اللہ مرید کر رہے تھے۔ اس وقت مخدوم شیخ رحمت اللہ نے فرمایا

''اے محمود تجھے گجرات کی سلطنت عطا کی''۴۲۔ سلطان محمود بھی اس مجلس میں اپنے دل میں یہ خیال کر رہا تھا کہ اگر مجھے گجرات کی سلطنت عطا ہوگی جیسا کہ شیخ مخدوم رحمت اللہ نے میرے حق میں فرمایا ہے یہ غلام بھی دریائے سابرمتی کے کنارے پر واقع تمام گاؤں جس طرف شیخ مخدوم رحمت اللہ کی خانقاہ اور آستانہ ہے۔ وہ تمام گاؤں شیخ مخدوم کے نذر کردوں گا تا کہ مرشد عالی اس کی آمدنی اپنی خانقاہ اور لنگر کے اخراجات میں صرف کریں۴۳۔ اس وقت سلطان محمود بیگڑا کا سوتیلا بڑا بھائی سلطان قطب الدین (۸۵۵ھ تا ۸۶۳ھ/ ۱۴۵۱ء تا ۱۴۵۹ء) گجرات پر برسر اقتدار تھا۔ مخدوم صاحب کی پیشین گوئی کے بعد بہت کم عرصہ میں سلطان قطب الدین ۲۲ رجب ۸۶۳ھ/ ۱۴۵۹ء میں فوت ہوگیا۴۴۔ اس کی جگہ داؤد خان کو گجرات کے تخت شاہی پر بٹھایا۔ سلطان محمود کی والدہ اس عمل کے بعد شیخ مخدوم رحمت اللہ کے آستانۂ عالی پر پہونچی اور مؤدبانہ عرض کیا کہ آقا محمود کے حق میں جیسا فرمایا تھا کہ محمود کو گجرات کی سلطنت عنایت ہوگی۔ لیکن اب کوئی دوسرا گجرات کے تخت شاہی پر بیٹھا ہوا ہے۴۵۔ شیخ مخدوم نے فرمایا فقیر کی زبان سے محمود کے حق میں نکلا ہوا سخن خدا تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ضائع ہونے نہیں دیگا۴۶۔ سلطان محمود کو چالیس خرما عنایت کیئے اور ارشاد عالی ہوا کہ چالیس روز کے اندر محمود ضرور سلطان ہوگا۔ ہوا بھی ایسا ہی۔ بہت جلد گجرات کے موقر امراء اور فقیر خان متفق ہوکر سلطان داؤد خان کو معزول کر کے سلطان محمود کی والدہ کے محل پر پہونچے۔ ادھر محمود کو خوف کے مارے زنانہ لباس پہنا رکھا تھا اسے اتار کر اعلیٰ اور نفیس کپڑوں میں ملبوس کر کے گجرات کے تخت شاہی پر جلوہ افروز کیا اس وقت سلطان محمود کی عمر ۱۳ سال کی تھی۔۴۷

شیخ مخدوم رحمت اللہ نے ایک روز زیب تن خرقہ کو اتارا اسے فرمان خلافت کے ساتھ لپیٹ کر باندھا اور اپنے عم زاد بھائی ابو احمد بن عطاء اللہ بن نصر اللہ کو طلب کیا اور بستہ حوالے کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے بھائی ابو احمد اس امانت کو اپنے گھر لے جاؤ۔ میرے وصال کے بعد میرا فرزند آئے گا۔ اسے یہ امانت سپرد کرنا۔ وہ اپنا نام اور اپنے باپ دادا کا نام تفصیل سے بتائے گا۔ میرا فرمان خلافت کھول کر دیکھنا۔ تحقیق کے مطابق اسے درست

پاؤ تو یہ خرقہ اور فرمان اسے عنایت کرنا۔ یہ نصیحت کی اور اسے وداع کیا۴۸؎۔ اس کے بعد آپ عبادت میں مشغول ہو گئے۔ علی الصبح خادم اور مرید حاضر ہوئے، دیکھا کہ مرشد عالی کی طبیعت ناساز ہے۔ اس دوران سلطان محمود بن سلطان محمد شاہ گجراتی بھی حاضر ہوا۔ سلطان کو مرشد عالی نے حجرہ میں طلب کیا۔ سلطان محمود قدم بوسی کا شرف حاصل کر کے ادب سے دوزانو بیٹھ گیا خادموں نے سلطان سے عرض کیا کہ آج حضرت شیخ مخدوم کی طبیعت ناساز ہے، سلطان نے اپنے مرشد عالی سے نہایت مؤدبانہ درخواست کی کہ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو یہ غلام آپ کی خدمت میں ایک تجربہ کار حاذق طبیب روانہ کر سکے۔ شیخ رحمت اللہ نے از روی سنت نبوی صلی اللہ علیہ وعالیہ وسلم اپنی رضامندی ظاہر کی۴۹؎ اور سلطان کو رخصت کیا۔ سلطان محمود نے ایک تجربہ کار ماہر طب حکیم آپ کی خدمت میں روانہ کیا۔ طبیب نے حضرت شیخ مخدوم کی نبض کا معائنہ کیا۔ مرض لا علاج پایا۔ طبیب نے خادموں سے کہا کہ شیخ کا علاج ناممکن ہے۔ اس لیئے کہ شیخ مخدوم کے شکم میں جگر نہیں ہے۔ تمام جگر جل گیا ہے۔ طبیب نے سلطان کے حضور میں حاضر ہو کر تمام کیفیت سے آگاہ کیا۔ سلطان نے دوسرے طبیب کو روانہ کیا۔ اس طبیب کو بھی شیخ مخدوم کا علاج سمجھ میں نہیں آیا۔ طبیب آستانۂ شیخ مخدوم سے لوٹ آیا۔ شیخ مخدوم رحمت اللہ نے تمام لوگوں کو حجرہ سے باہر جانے کے لیئے کہا اور خادموں کو کچھ دیر کے بعد حجرہ میں داخل ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ جب خادم حجرہ میں داخل ہوئے دیکھا کہ شیخ مخدوم رحمت اللہ قبلہ رو بیٹھے ہوئے تھے اور روح اقدس پنجرۂ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ خادموں نے شیخ بابا رحمت اللہ کو اٹھا کر لیٹا دیا اور تجہیز و تکفین میں لگ گئے۔ سلطان محمود بیگڑا یہ دل سوز خبر پاتے ہی احمد آباد میں موجود تمام مشائخ اور علماء کے ہمراہ پیادہ حاضر ہوا۔ سلطان نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا۔ جنازہ سنوارا اور پالکی میں رکھا۔ پالکی کا ایک سرا اپنے دوش پر رکھ کر قبر تک گیا۔ اپنے ہاتھوں سے جنازے کو قبر میں اتارنے کی سعادت حاصل کی اس روز جمادی الاوّل کی ۱۹/تاریخ ۸۷۷ھ تھی۵۰؎۔

سلطان محمود بیگڑا نے آپ کے مزار پر ایک عالی شان مقبرا اور اس کے متصل ایک

خوبصورت مسجد تعمیر کی۔ فی الحال مقبرا شیخ پورہ احمد آباد میں اپنی جگہ موجود ہے۔ لیکن مسجد دست بردز مانہ کے نذر ہوگئی ہے۔

مرشد کامل کے وصال کے وقت آپ کے خلیفہ بہاؤالدین باجن دہلی کی طرف گرم سفر تھے۔ آپ جب گجرات احمد آباد تشریف لائے اور شیخ پورہ بغرض زیارت اپنے مرشد عالی مقام کے مزار اقدس پر حاضری دی شیخ مخدوم رحمت اللہ کے جانشین عم زاد ابواحمد سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ ابو احمد نے آپ کی شناخت اور تحقیق کے بعد آپ کو حضرت شیخ مخدوم رحمت اللہ کا خرقہ اور فرمان خلافت عنایت کرتے ہوئے شیخ ابو احمد نے خرقہ مزار اقدس پر کھول کر رکھا اور فرمانِ تربت کے قریب رکھا تمام حاضرین باادب کھڑے ہوگئے۔ قوالوں نے بہاؤالدین باجن کا ھندی (گوجری) کلام گانا شروع کیا...... قوال جب اس شعر کو پہونچے۔

شاہ رحمت اللہ ھمنہ ملاؤ	تم باج لاگوں کس پاؤ
قبر اقدس سے ندا آئی	باجن لاگے میرے پاؤ

تب سے آپ کا لقب باجن مشہور و معروف ہوگیا۔

خرقہ مزار اقدس سے اڑ کر چکر لگانے لگا۔ مرقد پرنور سے ندا آئی ''یہ خرقہ تمہارا ہے'' باجن نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور خرقہ جسم پر مزین ہوگیا[۵۱] باجن کو جو فرمان اپنے پیر و مرشد بابا رحمت اللہ سے عطا ہوا تھا درج ذیل ہے۔

(۱) حضرت شیخ بہاؤالدین باجن

(۲) حضرت شیخ مخدوم رحمت اللہ

(۳) حضرت شیخ مخدوم عزیز اللہ متوکل

(۴) حضرت شیخ رکن الدین کان شکر

(۵) حضرت خواجہ محمد زاھد چشتی

(۶) حضرت خواجہ قدوۃ الدین ابی احمد چشتی

(۷) حضرت خواجہ قطب الدین محمد چشتی

(۸) حضرت خواجہ محی الدین علی چشتی

(۹) حضرت خواجہ رکن الدین ابی احمد چشتی

(۱۰) حضرت خواجہ قدوۃ الدین احمد چشتی

(۱۱) حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتی

(۱۲) حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتی

(۱۳) حضرت خواجہ ابو اسحاق چشتی

(۱۴) حضرت خواجہ ممشاد دینوری

(۱۵) حضرت خواجہ ہبۃ اللہ بصری

(۱۶) حضرت خواجہ حذیفہ مرعشی

(۱۷) حضرت سلطان ابراھیم ادھم بلخی

(۱۸) حضرت فضیل بن عیاض

(۱۹) حضرت خواجہ عبد الواحد بن زید

(۲۰) حضرت خواجہ حسن بصری

(۲۱) حضرت امام الانبیاء خاتم النبین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعالیہ وسلم [۵۲]

حاشیہ

۱ پریچنگ آف اسلام از ٹامس آرنلڈ ص۔۲۸۰-۲۷۹۔

۲ تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص-۱۵۸۔

۳ تاریخ صوفیائے گجرات از ظہور الحسن شارب ص-

۴ تاریخ شائخ چشت از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص-۲۵۳-۲۵۲۔

۵ گلزار ابرار۔ اذکار ابرار کا اردو ترجمہ

٦ اذ کارابرار از محمد غوثی مانڈوی۔ اردو ترجمہ گلزار ابرار از فضل احمد جیوری لاہوری۔ ص۔۴۴۔

۷ گلزار ابرار ص۔۱۰۳۔۱۰۲۔ تاریخ اولیائے گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی ص۔۱۲۸، پیدائش ۶۳۹ھ وفات ۷۳۶ھ۔ ۹۷ سال عمر پائی۔

۸ گلزار ابرار ص۔۹۱، اخبار الاخیار ص۔۱۹۶-۱۹۵، پیدائش ۶۷۱ھ وفات ۷۵۲ھ۔

۹ گلزار ابرار ص۔۱۱۷-۱۱۶ اخبار الاخیار ص۔ ، اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی ص۔۱۲۸ پیدائش ۸۹۸ھ وفات ۹۷۹ھ۔ ۱۳۵ کی عمر پائی۔

۱۰ اذ کار ابرار ص۔۱۰۳۔

۱۱ اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی ص۔۸۶۔ تاریخ صوفیائے گجرات ص۔۳۲۵۔

۱۲ تاریخ اولیائے کرام برھانپور جلد اول ص۔۹۰-۸۹۔ صبح صادق بتاریخ ۱۴/ذی القعدہ ۹۱۲ھ میں آپ اس فانی دنیا سے کوچ کر گئے۔ آپ کا مزار پر انوار شہر برھانپور میں محلہ شاہ بازار میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

۱۳ تاریخ اولیای کرام برھانپور جلد دوم۔ ص۔۴۰ اذ کار ابرار ص۔۱۵۸۔

۱۴ ''خزانہ رحمت'' غزانۂ اول مناقب دوم ص۔۸۴ اخبار الاخیار ص۔۵۵۹-۵۵۸۔ صاحب اخبار الاخیار رقم طراز ہیں کہ آپ شیخ متقی کے پیر اور شیخ باجن کے مرشد تھے اور آپ کا قیام برھانپور میں تھا۔ یہاں پر شاید سہو ہو گیا ہے، بہاؤ الدین باجن نے اپنے مرشد کے حالات خود کی مشہور و معروف تصنیف ''خزانۂ رحمت'' میں قلم بند کئے ہیں۔ اس تصنیف کی رو سے بہاؤ الدین باجن کے پیر و مرشد عزیز اللہ متوکل کے فرزند رحمت اللہ ہیں۔ عزیز اللہ متوکل تو دادا پیر ہیں۔ اس تصنیف کے بیان کے مطابق شیخ عزیز اللہ متوکل کا مقام مانڈو گڈھ ہے نہ کہ برھانپور۔

۱۵ تاریخ اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی۔ ص۔۴۵۔ تاریخ صوفیائے گجرات از ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ص۔۲۵۶-۲۴۴ ۱۳۳۷ء میں بمقام دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۴ شوال ۸۴۹ھ مطابق ۱۴۴۵ء میں بمقام احمد آباد واصل بحق ہوئے۔

۱۷ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب دوم ص۔۸۵-۸۴۔

۱۸ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب دوم ص۔۸۵-۸۴۔

۱۹ خزانۂ رحمت'' خزانہ اوّل مناقب دوم ص۔۴۴۔

۲۰ خزانۂ رحمت'' خزانہ اوّل مناقب دوم ص۔۴۵۔

۲۱ ابد ص۔۴۵

۲۲ ابد ص۔۴۵

۲۳ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب اول۔ص۔۴۶۔

۲۴ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب دوم ص۔۸۷

۲۵ خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب دوم ص۔۸۷ تاریخ اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی۔ص۔۹۷ سالِ وصال نہیں دیا گیا ہے۔

۲۶ ''خزانہ رحمت'' خزانہ اول مناقب دوم ص۔۸۷۔

تاریخ اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی ص۔۹۷۔آپ کا مزار معدل پور احمد آباد بتایا ہے اور تاریخ اولیائے کرام برھانپور مرتب و مصنف بشیر احمد خاں جلد دوم ص۔۱۴۱۔آپ مدفن میرا پور احمد آباد لکھا ہے۔

۲۷ ''خزانہ رحمت'' خزانہ اول مناقب دوم۔ص۔۱۰۸-۱۰۷۔ تزکرۂ اولیای دکن۔محبوب لتواریخ از مولوی ابوتراب محمد عبدالجبار خاں۔ص۔۵۵۲۔ آپ کو صدیقی لکھا ہے جو قطعی غلط ہے۔

۲۸ تاریخ اولیائے کرام برھانپور از بشیر خاں ص۔۱۴۱۔''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب دوم ص۔۹۳۔سالِ وصال ۲۲رشوال ۸۰۱ھ درج ہے۔اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی ص۔۱۲۹۔آپ کا سال وصال ۲۲رشوال ۸۴۲ھ دیا ہے۔یہی سالِ وصال درست ہے۔ تاریخ صوفیائے گجرات از ظہور الحسن شارب ص۔۲۴۲ اور اذکار ابرار ص۔۱۳۷ پر ۲۲رشوال ۸۴۲ھ مطابق ۱۴۳۸ء۔

۲۹ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب دوم ص۔۹۲۔

۳۰ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب دوم ص۔۸۹۔

۳۱ تاریخ خانوادۂ چشتِ احمد آباد از ابوالحسن قادری چشتی عرف ولی پاشا ص۔۳۳۵۔ تاریخ اولیائے کرام برھانپور جلد دوم از بشیر احمد خاں ص۔۴۱۔ اذکار ابرار ص۔۱۵۹۔

۳۱الف علامہ کمال الدین کا نسب نامہ۔ پندرہ واسطوں سے فرخ شاہ کابلی تک پہونچتا ہے۔ اور پندرہ واسطوں سے امیر المؤمنین عمر فاروق پر انتہا ہوتا ہے۔

۳۲ تاریخ خانوادۂ چشت احمد آباد ص۔۳۳۵۔ تاریخ صوفیائے گجرات ص۔۳۱۵-۳۱۴۔

۳۳ ابد

۳۴ تاریخ خانوادۂ چشت احمد آباد۔ از ولی پاشا ص۔۳۳۶-۳۳۵۔

۳۵ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول ص۔۱۶۔

۳۶ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب اول ص۔۱۷۔

۳۷ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب اول ص۔۲۰۔ آپ کو صاحب تصنیف مراۃ احمدی نے نسبتاً ''صدیقی'' لکھا ہے۔

۳۸ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب اول ص۔۴۶۔

۳۹ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب اول ص۔۳۶۔

۴۰ ''خزانۂ رحمت'' خزانہ اول مناقب اول ص۔۳۲-۳۱

۴۱ صاحب گلزار اس واقعہ کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ سلطان محمود جب بچہ تھا دایہ اسے بیج گاڑی میں ڈال کر دربار سے باہر سیر کرانے کے لیئے لے جاتی تھی۔ وہ راستہ شیخ مخدوم کے کوچہ سے ہوکر گذرتا تھا۔ ناگاہ شیخ مخدوم کی نظر بیج گاڑی پر پڑی ہنس کر فرمایا'' آفتاب مٹی (دھول) سے آلودہ اور آسمان امیر سے پوشیدہ نہیں کیا جاسکتا''۔ یہ آواز جب دایہ کے کان تک پہونچی وہ بہت خوش ہوئی۔ اذکار ابرار۔ص۔۲۰۵-۲۰۴۔

۴۲ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۳۴-۳۳۔

۴۳ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۳۳۔

۴۴ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۳۳۔

۴۵ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۳۳۔

۴۶ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۳۴۔

۴۷ تاریخ مراۃ احمدی ص۔ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۳۴۔

۴۸ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۵۶۔

۴۹ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۵۶۔

۵۰ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۵۸۔ اولیاء گجرات از مولوی سید ابوظفر ندوی ص۔۹۷۔ آپ کا سن وصال نہیں دیا ہے۔ تذکرۂ اولیاء دکن محبوب التواریخ از مولوی ابوتراب محمد عبدالجبار خاں۔ جلد اول ص۔۳۳۔ آپ کا سن وصال ۲۶ تاریخ جمال الثانی ۹۶۵ھ درج ہے۔

۵۱ ''خزانۂ رحمت'' خزانۂ اول مناقب اول ص۔۶۵

۵۲ ''خزانۂ رحمت'' ص۔۶۴، ۶۳، ۶۲، ۱۰۸، ۱۰۷۔

۲۳

صوفیائے گجرات کی علمی خدمات

- پروفیسر اختر شاہ دیوان
(ایف ڈی کالج، احمد آباد)

۱۵۷۲ء میں گجرات میں اکبری فتح کے علم لہرائے جاچکے تھے۔ اور اکبرِ اعظم نے گجرات کا الحاق اپنے ممالک محروسہ سے کرلیا۔ بادِ ایام میں مولانا حیؒ فرماتے ہیں کہ اس مبارک خاندان نے ایک سو چوراسی سال تک گجرات میں فرماں روائی کے ذریعہ اپنی اور اپنی حکمرانی کا ایسا بہترین نمونہ پیش کیا ہے جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں بمشکل مل سکتی ہے۔

۱۵۵۳ء میں اکبر کی فتح کے بعد گجرات میں اکبری دور میں نو صوبیدار آئے ان میں پہلا صوبیدار مرزا عزیز کوکا اور تیسرا خانِ خانان تھا۔ اس دور میں تقریباً بارہ سال مظفر شاہ اور مرزاوی شورشیں برپا ہوتی رہیں اور اس کے بعد مستحکم حکومت قائم ہوگئی۔ مرآتِ سکندری کے مصنف لکھتے ہیں کہ

"مدارس بہشت آئین ومساجد چوں خلد برس ساختہ ایں شہر راجنسِ قبول روی داد ورونق او بر جمیع بلاد ھفت اقلیم فائق افتاد ومسافران بر وبحر متفق علیہ کہ بد ایں دلکشا وزیبا شہرے بروئے زمین بنا نیافتہ"
(احمد آباد)

مرآتِ احمدی میں درج ہے کہ "در گجرات کہ زیب وزیست ہندوستان است اہلِ کسب وارباب ہنر ہمہ جہت می باشند"۔

مولانا عبدالحیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ

شاہانِ گجرات نے اپنی ڈیڑھ سو برس کے زمانۂ فرمان روائی میں جس قدر علوم وفنون کی سرپرستی کی ہے دہلی کی شش صد سالہ تاریخ اُس کی نظیر نہیں پیش کرسکتی۔ یہ صرف ان کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا شیراز ویمن ودیگر ممالکِ اسلامیہ کے چیدہ وبرگزیدہ علمانے گجرات میں آکر بود وباش اختیار فرمائی جن کے فیوض بابرکات سے چند دنوں میں گجرات مالامال ہوگیا اور خود گجرات میں اس پائے کے علما پیدا ہوئے جن کے علم وفن کی آبیاری سے اب تک ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہورہی ہیں۔ گجرات اگر علوم وفنونِ تحصیلہ کے اعتبار سے شیراز تھا تو حدیث شریف کی خدمات کے لحاظ سے یمن میمون سے مماثلت رکھتا تھا۔ مگر افسوس کہ ہم اپنے اسلاف کی علمی زندگی کی صحیح تاریخ سے بھی واقف نہیں ہیں وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی بے شمار تاریخیں لکھی گئیں اور مختلف عنوانوں سے لکھی گئیں مگر ان میں سے کوئی کتاب سے اُن کے نام ونسب، نشو ونما تعلیم وتربیت طریقۂ ماند بود اور علمی مشاغل کی نسبت تحقیق کرنا چاہیں تو ایک حرف نہ ملے گا۔ مصنف کا سارا زور ان کے کشف وکرامات بیان کرنے پر صرف ہوجاتا ہے۔ اِس سے بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ اب گجرات میں کوئی شخص ایسا نہیں رہا کہ جو اِن جواہر پاروں کی اہمیت اور غائت کو سمجھ سکے۔ ہم ممنون ہیں حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ کے اور محترم محی الدین بمبئی والا صاحب کے انہوں نے یہ علمی ورثہ جو مخطوطات کی شکل میں موجود ہے اُسے اس امید پر محفوظ رکھا ہے کہ شاید اس قحط الرّجال میں بھی کوئی ایسا شخص پیدا ہوجائے جو اس ورثہ کو اس امانت کو آئندہ آنے والی نسلوں تک پہنچا سکے۔ ورنہ اس دور میں تو مرحوم دیسائی صاحب اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے کہ بعد اب ایسا لائق اور فائق استاد ہی نہیں رہا جو آئندہ آنے والی نسلوں تک یہ گراں مایہ ورثہ پہنچا سکے۔ بمبئی والا صاحب ہمیشہ اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اس کی طرف نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ لیکن اب اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہم [illegible] فکر کریں اور کوئی ٹھوس کام شروع کریں جس سے اس علمی ورثے سے آئندہ آنے والی نسلیں [illegible] فیض یاب ہوسکیں۔

شیخ احمد کھٹو

گجرات کے سرمایۂ ناز علماء کرام میں سے شیخ احمد کھٹو کے فیوضِ باطنی وروحانی کا لائق مورخین نے اپنے مقالوں میں ذکرِ خیر کیا ہے۔ میں یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ سفرحج سے واپس ہوتے ہوئے سمرقند پہنچے تو دیکھا کہ اصولِ فقہ کے ایک ایسے مسئلہ پر علماء گفتگو کررہے ہیں اورحل نہیں ہو پاتا۔آپ اِس مسئلہ پر تقریر فرماتے ہیں تو غل مچ جاتا ہے اورلوگ ان کی طرف دوڑتے ہیں اوران کوصدرمجلس میں جگہ دیتے ہیں مگر جب یہی بزرگ ہندوستان کی زمین پرقدم رکھتے ہیں گویا توفضل وکمال سے ان کا کوئی سروکار باقی نہیں رہتا۔

شیخ علی مہائمی

دوسری مایۂ نازشخصیت شیخ علاء الدین مخدوم شاہ علی بن احمد المہائمی کی ہے۔ جنہیں ابن عربی ثانی بھی کہا جاتا۔آپ نے تفسیر لکھی جو دوضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے جس کا نام تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان ہے۔تفسیریں تو سینکڑوں لکھی جا چکی ہیں مگر جس کے لئے سے ان کی تفسیر کوامتیاز وخصوصیت حاصل ہے وہ یہ کہ اُس میں التزام سے قرآن پاک کی آیات کریمہ کے باہم دگر مربوط ہونے کوایسے دل نشین طریقہ سے بیان کیا ہے جس کو پڑھ کرانسان وجد میں آجاتا ہے۔اُن کی دوسری کتاب انعام الملک العلام اسرارِشریعت کے علم میں ہے اوراس فن کی یہ پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔اسی فن میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی حجتہ اللہ والبالغہ نامی کتاب لکھی۔مہائمی کی دیگرتصنیفات میں استجلا دالبصر فی الروعلی استفسار النظر لابن مطہر العلی۔النور الاظہر فی کشف القضاء، والقدراور اُس کی شرح الضوء الازہر فی شرح النور الاظہرشرح الخصوص فی شرح الفصوص لابن العربی الزوازف فی شرح العوارف السہر وردی۔اجلۃ التائید فی شرح اولہ التوحیدان کے سِوا اوربھی ان کی تصانیف ہیں ۸۳۵ھ میں وفات پائی مہائم میں ان کی قبرزیارت گاہِ خلائق ہے۔

مفتی رکن الدین

تیسری گراں قدر شخصیت مفتی رکن الدین بن حسام الدین ناگوری نہروالہ کے مفتی تھے فقہ واصولِ فقہ میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ قاضی القضاۃ جمال الدین بن محمد اکرم گجراتی کی فرمائش سے فتاوی حمادیہ تصنیف کی جو فقہ حنفی کی بہت مشہور کتاب ہے۔ فتاوے عالمگیر وغیرہ میں اس کے حوالے جا بجا موجود ہیں۔ ایسے جلیل القدر مصنف کی تاریخ وفات اور حالاتِ زندگی سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔

مولانا راجح بن داؤد[1]

چوتھی جلیل القدر شخصیت مولانا راجح بن داؤد گجراتی بڑے زبردست عالم تھے۔ علامہ سخاوی نے الضوء اللامع میں ان کا ذکر کیا ہے اور اُن کے جودۃ الفہم کی تعریف لکھی ہے، آپ رقم طراز ہیں کہ ۸۹۴ھ میں علماءِ گجرات سے علوم وفنون حاصل کرنے کے بعد آپ مکہ معظمہ آئے جہاں آپ نے اکمال اساتذۂ فن حدیث سے تلمیذ کا شرف حاصل کیا۔ ایسے باکمال شخص کی تصنیفات سے ہم محروم ہیں اور کتاب اُن کی اب دستیاب نہیں ۹۰۴ھ میں وفات پائی اور احمد آباد میں دفن ہوئے۔

قاضی جگن

قاضی جگن بھی گجرات کے بڑے عالموں میں شمار کئے جاتے تھے۔ فاضل چلپی نے کشف الظنون میں لکھا ہے قاضی جگن گجرات کے قصبہ میں رہتے تھے۔ ہماری بدمذاقی دیکھئے کہ ایک شخص قسطنطنیہ میں بیٹھ کر یہ کہہ رہا ہے کہ قاضی گجرات میں کہاں رہتے تھے اور خود گجرات والے اس سے بے خبر رہے اور ہیں۔ ان کی کتاب خزانۃ الروایات بہت مشہور ومقبول ہے۔ ۹۲۰ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔

مولانا علاء الدین

مولانا علاء الدین بڑے جلیل القدر محدث تھے۔ علامۂ خیر الدین عبد العزیز بن فہد اور حافظ نور الدین ابو الفتح شیرازی وغیرہ ائمہ حدیث سے ان کو اجازت تھی۔ آپ نے تا حیات اوقات عزیز کو درس و استفادہ میں مصروف رکھا۔ ۹۴۹ھ میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

مولانا عبد الملک

مولانا عبد الملک عباسی اپنے وقت کے بڑے محدث تھے۔ آپ نے اپنی ساری عمر فن حدیث شریف کی خدمت میں صرف کی۔ آپ نے حدیث اپنے بھائی مولانا قطب الدین سے پڑھی تھی۔ علامہ سخاوی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ صحیح بخاری آپ کو لفظا و معنی کے ساتھ یاد تھی، تقریباً ۹۷۰ھ میں وفات پائی۔

شیخ حسن محمد

ابو صالح حسن بن محمد گجراتی مولانا کمال الدین کی اولاد میں تھے۔ چالیس برس تک علم کی خدمت کی اور اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے لوگوں کو مستفیض کیا۔ آپ کی تصانیف میں قرآنِ کریم کی تفسیر ہے جس میں ربطِ آیات کی طرف زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ دوسری تفسیر بیضاوی کا حاشیہ ہے تیسری نزہتہ الارواح کی شرح۔ آپ نے ۹۸۲ھ میں اس جہان بے ثبات سے کوچ کی۔

مولانا محمد بن طاہر پٹنی

علامہ مجد الدین محمد بن طاہر پٹنی بڑے بلند پایہ محدث تھے جن کے فضل و کمال کی شہرت دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کی تصنیفات سے علماءِ حجاز و یمن اسی طرح فائدہ

اٹھاتے ہیں جیسے ہندوستان کے علماء۔ آپ نے شیخ ناگوری مولانا ید اللہ اور مولانا برہان الدین سے علم حاصل کرنے کے بعد مکہ معظمہ جا کر شیخ ابوالحسن، علامہ ابن حجر مکی شیخ علی بن العراق شیخ جاراللہ بن فہد ودیگر محدثین سے حدیث پڑھی اور عرصہ تک شیخ علی متقی کی صحبت میں رہے۔ وہاں سے واپس آنے پر بجز تصنیف ودرس وتدریس کے اور کوئی شغل اختیار نہیں کیا۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف لغتِ حدیث میں بحرالانوار ہے۔ دیگر اہم تصانیف میں المغنی فی اسماء الرجال اور تذکرۃ الموضوعات بے مثال کتابیں ہیں ۹۸۶ھ میں آپ کو مرتبۂ شہادت حاصل ہوا۔

مفتی قطب الدین

مفتی قطب الدین محمد گجرات کے اُن علماء کرام میں سے تھے جن پر ہم سب فاخر ہیں۔ آپ بڑے محدث وادیب تھے۔ اپنے والد جناب مولانا علاء الدین احمد سے علم حاصل کر کے مکہ معظمہ گئے اور شیخ احمد بن محمد العقیلی النویری ومحدث یمن عبدالرحمٰن بن عصی وبیع سے حدیث پڑھی۔ آپ کو نورالدین شیرازی سے بھی صحیح بخاری کی سند حاصل تھی۔ آپ کو حرم شریف میں درس دینے کا شرف حاصل ہوا اور ہندی ہونے کے باوجود شرفۂ مکہ کے میر منشی قرار دئے گئے۔ آپ نے البرق الیمانی ایک کتاب تصنیف کی جس میں دولت عثمانیہ کے تسخیر یمن کی تاریخ ہے سب سے زیادہ مقبول تصنیف الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام ہے اِن دونوں کتابوں کے سِوا دیگر کتابوں کا ذکر لغات العربیہ میں جرجی زیدان نے کیا ہے۔

آپ نے ۹۹۹ھ میں وفات پائی۔

علامہ وجیہ الدین علوی

علامہ وجیہ الدین بن نصر اللہ علوی گجراتی اُن بزرگ علماءِ دین میں ہیں کہ اہل ہند تاحیات ان کے احسان مند رہیں گے۔ تقریباً بیس سال کی عمر سے انہوں نے درس وتدریس کا آغاز کیا۔ آپ علامہ عماد الدین محمد طارمی کے شاگردِ عزیز تھے۔ سرسٹھ سال تک

احمد آباد میں معقولات منقولات کا درس دیتے رہے۔ شرح جامی سے لے کر تفسیر بیضاوی تک متعدد کتابوں کے حواشی و شروح لکھے۔ آپ کی حیات طیبہ میں ہی آپ کے شاگرد احمد آباد سے لاہور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اور علمی غدمات انجام دے رہے تھے۔ آپ کی مشہور اور معروف تصانیف میں حاشیۂ تفسیر بیضاوی، حاشیہ کشف الاصول یزدوی، حاشیہ تلویح، حاشیہ ہدایہ، حاشیہ شرح تجرید، حاشیہ بر حاشیہ قدیمہ، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ شرح مقاصد، حاشیہ شرح وَقایہ، حاشیہ قطبی، حاشیہ شرح عقائد، حاشیہ عضدیہ، حاشیہ شرح حکمۃ الدین، حاشیہ مطول، حاشیہ مختصر، حاشیہ شرح ملاء، شرح ارشاد، شرح نخبۃ الفکر، شرح ادبیات تسہیل، شرح لوائح، شرح جام جہاں نما۔ ۹۹۸ھ میں آپ نے رحلت فرمائی۔

قاضی علاء الدین

قاضی علاء الدین عیسیٰ گجراتی بھی علامہ عماد الدین محمد طارمی کے شاگرد تھے۔ اور کثرت سے درس و افادہ میں مشغول رہتے۔ آپ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کے معاصر اور بڑی جلیل القدر شخصیت کے مالک تھے۔

قاضی برہان الدین

قاضی برہان الدین، امام شہاب الدین احمد گجراتی کی اولاد سے ہیں۔ باعتبار کثرت درس و استفادہ نکتائے روزگار تھے۔ ظفر الوالہ میں محمد بن عمر آصفی رقمطراز ہیں کہ ابتداء میں گجرات میں علم انہیں کی ذاتِ گرامی کی وجہ سے پھیلا۔

مولانا صبغۃ اللہ

مولانا صبغۃ اللہ بن روح اللہ الحسینی بھروچ کے باشندے تھے۔ آپ علامہ وجیہ الدین گجراتی کے شاگردِ رشید تھے۔ کچھ عرصے تک احمد نگر بیجاپور میں بھی علوم وفنون کی اشاعت کرتے رہے۔ اُس کے بعد حج وزیارت سے فارغ ہوکر جبلِ اُحد پر قیام فرمایا اور

ساری زندگی اسی پہاڑی پر بسر کردی۔ آپ نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا جو بلادِ روم تک پہنچا اور علماء نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اس کے علاوہ ان کی اور بھی کئی تصانیف ہیں جو انہوں نے علماءِ عرب کی فرمائش پر لکھیں۔ آپ نے ۱۰۱۵ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

شیخ عبدالقادر

شیخ عبدالقادر بن سید شیخ حضرمی گجراتی مشہور عالم اور صاحبِ تصنیف بزرگ تھے۔ آپ کا کتب خانہ بڑا عالی شان تھا۔ آپ کی تصنیفات میں الحدائق الحضرہ سیرت النبی ﷺ پر مبسوط کتاب ہے النور السافر فی اعیان القرن العاشر تاریخ میں بڑی مفید تصنیف ہے۔ الروض الاریض ان کے عربی دیوان کا نام ہے۔ ۱۰۳۸ھ میں آپ نے وفات پائی اور اپنی مسقط الراس احمد آباد میں مدفون ہوئے۔

محمد بن عمر آصفی

عبداللہ محمد بن آصفی الف خانی گجرات کے نامور علماء میں سے تھے۔ مکہ معظمہ میں تحصیل علوم وفنون کیا۔ وہاں سے آنے کے بعد الف خاں کی سرکار میں ان کا تعلق پیدا ہوا اور آپ میر منشی ہوے۔ الف خاں کی موت کے بعد جھجھار خاں نے ان کو اپنی سرکار میں اسی خدمت پر لے لیا ان کی ایک کتاب تاریخ میں فرائح الاقبال ونوائح الاتقال ہے جو الف خاں کے واسطے لکھی تھی۔ دوسری کتاب ظفر الوالہ بمظفر وآلہ جو بزبان عربی لکھی گئی گجرات کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ ہے۔

مولانا احمد کردی

مولانا احمد بن سلیمان کردی گجرات کے علماء میں باعتبار مہارت علم وکثرت درس وافادہ کے بہت ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ حدیث اپنے والد سے پڑھی۔ دیگر علوم وفنون

علامہ محمد شریف اور مولانا علی محمد سے حاصل کئے تھے۔ لقبِ سیہ کے پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنی پوری توجہ درس وافادہ کی طرف مبذول کی اور تمام عمر اس کے سوا کوئی اور کام نہیں کیا۔ اُن کے حلقۂ درس سے ایسے ایسے علماء نکلے جن کی شہرت ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچی۔ آپ صاحب تصنیف بھی تھے۔ فن کلام پر فیوض القدس ان کی مشہور کتاب ہے۔ آپ نے ۱۰۸۷ء میں وفات پائی۔

مولانا فرید

مولانا محمد فرید علامہ محمد شریف کے خلف الرشید تھے۔ آپ نے اپنے والد بزرگوار سے کتابیں پڑھیں۔ آپ صاحبِ تصنیف بھی تھے۔ مطول پر خطائی کا مشہور حاشیہ ہے انہوں نے اُس پر حاشیہ چڑھایا ہے۔

سید محمد رضوی

سید محمد جعفر بن جلال بن محمد الحسینی الرضوی مخدوم جہانیاں کی اولاد میں تھے۔ اپنی ساری عمر تالیف وتصنیف میں صرف کی۔ قرآن شریف کی دو تفسیریں لکھیں ایک عربی میں جلالین کی طرز پر اور دوسری فارسی میں جو اس اعتبار سے اہم ہے کہ اُس میں اہل بیت علیہم السلام کی روایت سے تفسیر کی ہے۔ آپ نے مشکوۃ المصابیح کی شرح بھی لکھی ہے۔ جس کا نام زینۃ النکاح فی شرح المشکوۃ ہے۔ آپ نے ۱۱۱۱ھ میں رحلت فرمائی۔

شیخ جمال الدین

شیخ جمال الدین بن رکن الدین چشتی کمال الدین علامہ کی اولاد میں تھے۔ آپ اپنے وقت کے باکمال استاد تھے۔ تقریباً تمام کتب درسیہ پر شرح وحواشی لکھے۔ تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک تلویح حاشیہ خیالی، شرح عقائد، مطول، مختصر، قطبی، منہل شرح ملاّ وغیرہ پر مستقل حواشی لکھے، فصوص عوارف تعرف مثنوی معنوی وغیرہ کتب تصوف کی شرحیں لکھیں۔

آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد کم وبیش ۱۴۲ بیان کی جاتی ہے۔ انہوں نے ۱۱۲۴ھ میں رحلت فرمائی اور احمد آباد میں مدفون ہیں۔

مولانا نورالدین

مولانا نور الدین بن محمد صالح احمد آبادی کا شمار فنا فی العلم علماء میں ہوتا ہے۔ گجرات میں علامہ وجیہ الدین علوی کے بعد درس وتدریس وکثرتِ تصنیفات کے اعتبار سے آپ سے بڑھ کر کوئی دوسرا عالم نہیں ملتا۔ آپ نے بھی علامہ وجیہ الدین علوی کی طرح تمام کتب درسیہ کی شروح وحواشی لکھے ہیں۔ اکرام الدین خان صدر گجرات نے آپ کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے کی لاگت سے ایک عالی شان مدرسہ تیار کیا تھا اور مصارف مدرسہ کے لئے دیہات وقف کئے تھے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو بیان کی جاتی ہے۔ جس میں سے تفسیر القرآن پوری قرآن مجید کی تفسیر تفسیر النوانی السبع المثانی، سورۂ فاتحہ کی تفسیر، سورۂ بقر کی تفسیر، حاشیہ بیضاوی ایز درس، نور القاری شرح صحیح بخاری الحاشیہ القویمہ علی الحاشیہ القدیمہ، حاشیہ شرح مواقف، حل المعاقد، حاشیہ شرح مقاصد، حاشیہ شرح مطالع، حاشیہ تلویح، حاشیہ عضدیہ المعول، حاشیہ مطول، حاشیہ شرح وقایہ، شرح ملا، حاشیہ قطبی، شرح تہذیب المنطق، شرح فصوص الحکم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی اور مدرسہ میں مدفون ہوئے۔

مولانا خیرالدین

مولانا خیر الدین محمد زاہد سورتی دورِ آخر کے ان لوگوں میں تھے جو فضل وکمال میں اپنے اسلاف کی سچی یادگار سمجھے جاتے تھے۔ مولانا محمد بن عبد الرزاق سورتی سے تحصیل علم کے بعد حج وزیارت کا شرف حاصل کیا اور مدینہ طیبہ میں عرصہ تک قیام کیا۔ وہاں محمد حیاۃ سندی سے حدیث پڑھی، وہاں سے لوٹ کر فن شریف میں عمر صرف کر دی۔ پچاس سال تک تعلیم دیتے رہے۔ ایک کتاب شواہد التجدید جو تصوف وسلوک کے موضوع پر ہے۔ ۱۲۰۶ھ

میں آپ نے رحلت فرمائی۔ آپ کا مزار سورت میں ہے۔

مولانا ولی اللہ

مولانا ولی اللہ سورتی اپنے بزرگوار مولانا غلام محمد گجراتی کے شاگرد تھے۔ کتب درسیہ پڑھنے کے بعد آپ حجاز چلے گئے۔ وہاں شیخ ابوالحسن سندی سے حدیث پڑھی۔ واپس آکر سورت میں قیام فرمایا اور حدیث شریف کی درس وتدریس میں مصروف ہوگئے۔ آپ نے ایک چھوٹا سا جہاز بنوایا تھا جس کا نام سفینۃ الرسول رکھا۔ غلبۂ شوق میں اسی پر سفر کرتے اور حج وزیارت سے مشرف ہوتے۔ مولانا رفیع الدین مرادآبادی نے اپنے سفرنامہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ آپ کی ایک کتاب حدیث کے موضوع پر انتبہات النبویۃ فی سلوک الطریقہ المصطفویہ ہے جس میں سلوک اور راہ نبوت کا بیان ہے۔ آپ نے ۱۲۰۷ھ میں وفات پائی اور سورت میں دفن ہوئے۔

۲۴

دستور ملّا فیروز بن کاؤس جلال

-پروفیسر محی الدین بمبئی والا

سرزمینِ گجرات سے تعلق رکھنے والے فارسی کے عظیم شاعر دستور ملاّ فیروز، دستور ملاّ کاؤس بن جلال کے سعادت مند فرزند تھے۔قدمی یا قدیمی پنتھ یا مسلک سے ان کا تعلق تھا۔ وہ نہ صرف پارسی سماج کے بلکہ اپنے زمانے کے ایک قابلِ ذکر عالم قادرُ الکلام شاعر ماہرِ فلسفہ اور ایک حق پرست انسان تھے۔ بیحد خلیق، منکسُر المزاج اور حلقہ بگوش ہونے کی وجہ سے اطراف کے سماج میں بڑی قدر و منزلت رکھتے تھے۔ ان کا اصل نام ''پیشتن'' یا ''پیشتِن'' تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سن ۱۷۶۸ء میں جب اِن کے والد ایران کے سفر پر گئے تھے تب ان کے علم و فضل سے متاثر ہو کر خلیفۂ بغداد[۱] نے انہیں تعظیمی کلمات سے نوازا اور ''ملاّ'' کا خطاب عنایت کیا۔ یہ خطاب تب سے اِس خاندان میں رائج ہوا جو ان کے نام کا جزو قرار پایا۔ نتیجہ میں کاؤس جلال کے ہونہار فرزند پیشتن نے بھی اِس خطاب کو اپنے نام کے ساتھ جاری رکھا۔ شعر گوئی کی طرف طبیعت پہلے سے مائل تھی، باقاعدہ شعر کہنے لگے تو فیروز تخلص اختیار کیا لہٰذا پارسی ادب کی تاریخ میں انہیں دستور ملاّ فیروز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اپنی دینی روایت کے مطابق ۱۷۹۴ء میں وہ بحیثیت دستور مسند نشین ہوئے۔ اگرچہ اس سے قبل ہی ان کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ''ذہنِ خرد منظومہ'' یا ''منظومۂ ذہنِ خرد'' کے عنوان سے ان کا پہلا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آچکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملا فیروز جیسے ماہرِ رموزِ فن اور باصلاحیت ادیب اِس مجموعۂ کلام سے پہلے بھی ادبی اور

---

[۱] مِس پیلاں مکانی (گجراتی)

مذہبی موضوعات پر متعدد مقالات سپردِ قلم کر چکے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دینِ زردشت کے بعض دینی اور تاریخی رسائل موضوع بحث بنے ہوئے تھے اِس علمی ماحول نے مُلاّ فیروز کے تخلیقی مزاج کے لئے تازیانہ کا کام کیا۔

فارسی زبان پر انہیں قدرت حاصل تھی۔ ''تاریخِ ایران'' کی مقبولیت ان کے ایک اعلیٰ ادیب ہونے کی شہادت پیش کرتی ہے۔ ان کی ایک ابتدائی شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو جس میں تعلّی کی بو بھی ہے ؎

چوں شد انجام آں اعلیٰ عمارت
دلِ خُلدِ بریں زیں شد بغارت
بہ اِستصوابِ بہدینان دیندار
چہ اندر ممبئی بودند سردار

ظاہر ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر اور ادیب تھے، ان کی تاریخِ ایران اور دیگر نگارشات ملاحظہ کرنے کے بعد ممبئی کے گورنر جوناتھن ڈنکن نے عظیم شاعر فردوسی کے شاہنامہ کے تتبع میں انگریزی حاکموں کے ہندوستان میں سیاسی وسماجی کارناموں کی ترجمانی کی غرض سے ایک عظیم شعری کارنامہ انجام دینے کو دعوت پیش کی۔ کام تو مشکل تھا مگر ملاّ فیروز نے بیڑہ اٹھالیا۔ تاہم انہیں اِس کام کو انجام تک پہنچانے میں پیش آنے والی دقتوں کا بھی احساس تھا اور خرچ کا بھی!! ان کی اِس گومگو کی حالت کو محسوس کر کے گورنر ڈنکن نے مُلاّ فیروز کو تاحیات سالانہ چار سو روپیہ بطورِ وظیفہ ملتا رہے ایسا انتظام کیا، ملاّ فیروز نے ہر طرح اطمینان ہوجانے کے بعد اِس شعری سفر کا آغاز کیا اور اپنی اس شعری کاوش کا نام ''جار جنامہ'' قرار دیا۔ ابھی اس کے صرف چھ ہزار اشعار ہی لکھ پائے تھے کہ گورنر ڈنکن کا انتقال ہوگیا اور یہ قابلِ تعریف کام پایۂ تکمیل کو پہنچنے سے رہا۔ مُلاّ فیروز نے حوصلہ نہیں کھویا اور Board of Directors کے صدر جوہن یمسڈین کے حضور جار جنامہ کو مکمل کرنے کی غرض سے وظیفہ جاری کرنے کے واسطے ایک درخواست پیش کی۔ اگرچہ ان تمام کوششوں اور عنایتوں کے باوجود ملا فیروز یہ عظیم کارنامہ مکمل نہ کر سکے۔ اس لئے کہ مالی

پریشانیاں، ذہنی پشیمانیاں نیز علالت اور ضعف حائلِ طباعی ہوئے اور ملا اِس شعری کارنامہ کو انجام تک نہ پہنچا سکے جسے ان کی وفات کے بعد ان کے برادر زادہ دستور رستم جی کیقباد نے جارجنامہ کو مکمل کیا اور تین جلدوں میں شائع کر کے ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کو عنایت کیا۔

پارسیوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جبکہ کسی پارسی ادیب کو حکومتِ انگلشیہ کی جانب سے سالانہ چار سو روپیہ کا وظیفہ عطا ہوا ہو۔ باجودیکہ این جملہ ادبی اوصاف ملا فیروز کا ناقابلِ فراموش کارنامہ تو یہ تصور کیا جائے گا کہ جب اس طرف مطبع اور چھاپہ خانہ تو دور کی بات رہی، نشر واشاعت کا نام بھی کم آشنا تھا، تب مُلاّ فیروز نے سو (۱۰۰) کے قریب قیمتی اور نایاب مخطوطات کو شائع کر کے اپنے ادبی استقلال اور علم دوستی کا ناقابلِ فراموش ثبوت پیش کیا۔ گویا یہ ایک قابلِ رشک کوشش تھی ادبیاتِ فارسی کو محفوظ رکھ کر گجرات میں ایرانی تہذیب وثقافت کو حتی الامکان رائج کرنے کی۔ ملا فیروز اور بعد ازاں جنوبی گجرات میں ان کے ارشد تلامذہ اِس رجحان کی ترجمانی کرنے میں کامیاب بھی ہوئے۔

مُلاّ فیروز صفِ اول کے بلند پایہ فنکار تھے۔ مِس پیلاں مکاٹی لکھتی ہیں کہ آج کا ایرانی ادب دیرپا ثابت نہیں ہو پایا۔

اِن حالات میں سالہاسال گزرنے کے بعد بھی ملا فیروز اور ان کی ادبیات عہدِ حاضر کے اسکالرز اور دینی، علمی اور تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھنے والے اُدبا کے لئے مشعلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔

اِس عظیم فنکار کی تصنیفات وتالیفات کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے چند قابلِ ذکر حسبِ ذیل ہیں:

'جارجنامہ' کے علاوہ 'بہدین' احوال داوراں، تاریخ ابتداء ایرانیان، احوالِ دستوران وموبدان، مناجات، مطابعِ منظومہ، دیباچۂ خرد منظومہ، تعارف زردُشت، گزارشات گناہ وتقصیر، دساتیر، لغت نامہ، غزلیات ملا فیروز، رسالۂ ادبِ قوی، رسالۂ در صفتِ یزدان، ہند نامہ، وغیرہ۔ ان کے علاوہ ادبِ لطیف جیسی چیزیں بھی لکھی گئی ہیں۔ یہ تمام تر تصانیف بزبانِ فارسی تحریر کی گئی ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں گجراتی زبان میں منتقل

ہوئی ہیں۔

ملاّ فیروز کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی۔ ''دی بومبے منتھلی میگیزین'' ایک ماہنامہ کی اشاعت کے لئے ''بومبے گیزیٹ'' کے 1820-3-4 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا تھا۔ ایک اور اخبار ''فارسی پرکاش'' میں متذکرہ میگیزین کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ ''ایک معروف قلم کار کی زیرِ نگرانی شائع ہوگا'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس تحریک میں ملا فیروز برابر شریک رہے ہوں گے۔ فارسی عربی اور دیگر زبانوں میں یہ ماہنامہ شائع ہونے والا تھا۔ اس کا سالانہ (؟) چندہ چالیس روپیہ تھا جو کافی گراں ہونے کے باعث یہ اخبار اشاعت کی منزل تک نہیں پہنچ پایا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے 'راہنمای زردشتی' نامی ایک جریدہ کے مدیر کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دی تھیں اس طرح ملا فیروز نے طویل عرصۂ حیات تک ادب و زبان کے مختلف محاذ پر ستیزہ کار رہتے ہوئے ۱۸۳۰ء میں جان جہان آفرین کے سپرد کر دی۔

ان کے مرنے پر پارسی سماج میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ متعدد تعزیتی پیغامات موصول ہوئے۔ اس موقع پر بمبئی ہائی کورٹ کے جج اور گورنر مجلسِ عاملہ کے رکن James Southerland نے اپنے دوست دادا بھائی پیستنجی واڈیہ کے نام ایک خط میں بڑے ہی پرسوز انداز میں جس طرح اظہار خیال کیا اسے یہاں پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا:

"I am much grieved to hear of the death of the learned and venerable Mulla Firoz bin Kaoos and many will be sorry on the occassion. For he was needed most deservedly in high estimation by the literary community. To the parsees of whom he was, so was brighten ornament. His lost must be served for I fear was left darkness behind as he had not his equal as an original scholar and there is no one so well qualified to throw light on any difficulties on your relegion and literature as he was. For my own part I never met a more gentlemently person possessed of such amiable feelings as he had among any of the natives of India."

ملا فیروز کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ژند، پاژند، اوستا، پہلوی زبانوں کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی زبانیں بھی جانتے تھے۔ ان کے زرخیز کتب خانہ میں اِن تمام زبانوں کی کتابیں موجود تھیں جو متفرق علوم وفنون پر مشتمل تھیں۔

ملاّ فیروز نے اپنی زندگی ہی میں اس قیمتی کتب خانہ کو عام مطالعہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے عزیز واقربا اور رشتہ داروں کو یہ ہدایت دی تھی کہ اس کتب خانہ پر ہمارے وارِثوں اور خاندان کے لوگوں کا مالکی حق نہ رہ کر یہ کتب خانہ تمام علم دوست حضرات کے لئے وقف رہے گا۔ اِسی کے ساتھ اِس کتب خانہ کو مزید متمول کرنے کی غرض سے ان کے بھتیجے دستور رستم جی کیقباد نے اپنی کتابیں بھی نجی کتب خانہ میں داخل کردیں۔ ۱۸۲۶ء میں سیٹھ سہراب جی پیشتن جی فرام جی نے انگریزی زبان کے پانچ ہزار روپیوں کی کتابیں اِس لائبریری کو دیں۔ اس طرح یہ قیمتی کتب خانہ برسوں بمقام نوساری رہنے کے بعد بمبئی میں کاما انسٹی ٹیوٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

ملاّ فیروز کی بدولت جنوبی گجرات کا علاقہ ایران اور زرد شتی علوم وفنون کا بڑا مرکز شمار ہوتا تھا۔ بلساڑ، نوساری، اُدواڑا، پارڈی، دھرم پور، سنجان، وغیرہ پارسیوں کے با اثر علاقے تھے جہاں آج بھی پارسی ادب کے قیمتی ادب پارے محفوظ ہونے کا امکان ہے۔

ملاّ فیروز اور دساتیر

کہا جاتا ہے کہ گورنر ڈنکن کے ایما پر ملا فیروز نے دساتیر کا انگریزی ترجمہ کرنا اپنے ذمہ لیا تھا اور اُس کام کو شروع بھی کر دیا تھا۔ دساتیر کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں کہ ایران کے سفر کے دوران شہر اصفہان سے دساتیر کا ایک قدیم نسخہ اُنہیں دستیاب ہوا تھا۔ اِسی کا ترجمہ کرنا منظور ہوا تھا۔ مگر یہ ترجمہ بھی نامکمل رہا اور گورنر ڈنکن کا انتقال ہوجانے کے باعث اِس کام کو دوبارہ ولیم ارسکین کے ساتھ مل کر ترجمہ کیا جو سن ۱۸۱۸ء میں شائع ہوا۔

مگر دساتیر اور اس کے انگریزی ترجمہ کے شائع ہوتے ہی مباحثے اور مناظرے کا بازار گرم ہوا تھا اور ہر طرف سے اس کے ردّ وقبول میں کئی کتابیں اور مقالے شائع ہوئے۔

حتی کہ بعض انگریز علماؤں نے اِسے جعلی اور تخیلی تک قرار دیا۔ اول تو ملاّ فیروز نے خاموشی اختیار کی اور جونہی ماحول سازگار پایا ملا فیروز نے محققانہ اور عالمانہ دلائل سے نسخے کی صحت اور تاریخی حیثیت کی تصدیق کی۔ بمبئی گیزیٹ 1819-3-24 کے شمارے میں اس کے خلاف جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بہت ہی مدلل جواب ملا فیروز نے 1819-4-7 کے شمارے میں شائع کیا۔

سیٹھ فرامجی مانکجی واڈیا کے پاس اصل نقل کی کئی نقلیں ہونے کا اندازہ ہے۔ وٹیکس نے ایک اور نقل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملا فیروز سے متعلق دیگر قیمتی معلومات اور ان کی تصانیف وغیرہ کی تفصیلات کاما انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔

گوشہ

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی

۲۵

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم

چند یادیں

-ڈاکٹر سید عبدالرحیم ۔ ناگپور

رفتید ولے نہ از دلِ ما

میں اس وقت مرحوم ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب کے علمی کمالات اور ادبی خدمات پر روشنی نہیں ڈالوں گا بلکہ میرے اور ڈاکٹر صاحب کے جو چالیس سالہ روابط وتعلقات رہے ہیں ان کو اختصار کے ساتھ بیان کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس تذکرے سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا لیکن ایک جامع اور اہم شخصیت کے سمجھنے اور معلوم کرنے کے لئے سب ہی جزوی اور غیر اہم گوشے بھی اہم ثابت ہوجاتے ہیں۔ میرا تو حال غالب کے اس شعر کے مصداق رہا ہے کہ ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ڈاکٹر صاحب نے مجھ پر جو نوازشیں اور احسانات کئے ہیں ان کا تذکرہ بھی اس وقت مقصود نہیں ہے اس جگہ صرف چند حالات بیان کئے جائیں گے۔

مجھے محکمہ آثار قدیمہ ناگپور میں ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۸ء تک یعنی ۹ سال ڈاکٹر صاحب کے ماتحت کام کرنے کا موقعہ ملا اپنی ملازمت کی ابتداء میں میں نے انھیں اپی گرافی برانچ کے Assistant suprintendent کی حیثیت سے دیکھا کہ وہ سائیکل پر سوار ہوکر

ٹھیک ۱۰ بجے دفتر میں آجاتے دس منٹ کے بعد چپراسی کے ذریعہ حاضری کا رجسٹر ہیڈ کلرک کے ٹیبل سے اپنے پاس منگوا لیتے۔ دیر سے آنے والے ملازمین ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں جا کر حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرتے اس وقت ان کے نام کے سامنے لال نشانات لگا دئے جاتے۔ اس زمانے میں اپی گرافی برانچ میں ٹیکنیکل اسٹاف میں وہ اکیلے کام کررہے تھے ۱۹۵۹ء میں تین اسامیاں بیک وقت پُر کی گئیں۔ Senior Epigraphical Assistant کی پوسٹ پر ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کا تقرر ہوا اور Epigraphical Assistant کی پوسٹ پر ڈاکٹر عبد الشکور قادری اور راقم السطور کا۔ ایک دو سال کے اندر دو Junior Technical کا اور بھی اضافہ ہوا اسی عرصے میں کئی مسلمان چپراسی، کلرک اور میکانک ملازم ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب جب تک دفتر میں رہتے ان کا قلم برابر چلتا رہتا۔ دفتر کی لائبریری کی کتابیں وہ گھر پر بھی پڑھتے تھے روزانہ چپراسی اپنی سائیکل پر کتابوں کا بنڈل باندھ کر ڈاکٹر صاحب کے گھر لے جاتا اور صبح دفتر آتے وقت ساتھ لاتا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں بہت زیادہ سگریٹ پیا کرتے تھے لیکن جب اپنے دوست مقصود صاحب حیدر آبادی کو سگریٹ نوشی کی وجہ سے کینسر کے مرض میں مبتلا دیکھا تو اسی وقت سگریٹ پینا ترک کر دیا۔ ہم لوگ دفتر کے اوقات میں ظہر کی نماز کے لئے مسجد میں جاتے تو وہ بھی ہمارے ساتھ مسجد جاتے اور بڑی پابندی کے ساتھ نماز پڑھتے نماز پڑھ کر لوٹتے ہوئے کچھ دیر پری ہسٹری برانچ کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بینرجی کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے اور انگریزی اخبار کے معمے حل کرتے آج سے تقریباً ۱۵ سال قبل کی بات ہے ڈاکٹر بینرجی بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو وہ کہہ رہے تھے کہ اگر بھگوان مجھ سے مرنے کے بعد پوچھے گا کہ دنیا میں کیا دیکھ کر آیا ہے تو میں یہی کہوں گا کہ ڈاکٹر دیسائی جیسے قابل شخص کو دیکھ کر آیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا سرکاری بنگلہ مسلم آبادی سے دور سول لائن میں تھا وہ بہت کم کسی سے ملتے تھے کسی تقریب میں شرکت کرنا بھی تضیع اوقات سمجھتے تھے اس لئے بہت کم لوگ ان سے واقف تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ پڑھنے اور لکھنے میں گزرتا۔ نام و نمود سے کوسوں

دور کام کو ہی اپنا انعام سمجھتے تھے کئی ملکوں میں وہ حکومت کے نمائندے بن کر گئے کبھی کسی اخبار میں ان کے بیرون ہند جانے اور وہاں سے آنے کی خبر شایع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے وقت بھی ملک کے حالات ہی کچھ ایسے رہے کہ ان کے انتقال کی خبر کسی اخبار میں نہیں چھپی۔ اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا تھا۔

ثبت اَست بَر جریدۂ عالم دَوامِ ما

ڈاکٹر صاحب جس طرح خود کام کرتے اسی طرح کام کرنے والوں کو پسند فرماتے اور دوسروں سے بھی اسی بات کی توقع کرتے اکثر ایسا ہوتا کہ ان کے ماتحتین ان کی توقعات پر پورے نہیں اترتے چونکہ وہ مزاجاً بہت سخت گیر اور سخت گو واقع ہوئے تھے اس وجہ سے دفتر کی فضا اکثر مکدر رہتی۔ میرے ایک دوست کا تو یہ معمول تھا کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب انھیں بلاتے وہ کئی آیتیں اپنے اوپر دم کرتے اور پھر چیمبر میں داخل ہوتے۔ وہ کسی جگہ بھی اور کسی موقعہ پر غلط بات برداشت نہیں کرتے تھے ہمارے ساتھ نماز کے لئے مسجد جاتے جمعہ کے دن امام صاحب خطبے سے قبل تقریر کرتے کبھی امام صاحب کسی تقریر میں اختلافی مسئلہ بیان کرنے لگتے تو ڈاکٹر صاحب فوراً کھڑے ہوکر امام صاحب کو ٹوک دیتے اور کہتے کہ امام صاحب یہ اختلافی مسئلہ ہے آپ خدارا عوام میں اختلافات پیدا نہ کریں۔ حق بات کہنے میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے غیرتِ اسلامی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ناگپور میں ایک وقت اوک نے تاج محل کا مسئلہ اٹھایا تھا ڈاکٹر صاحب اس کی تقریر سنتے ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھتے اور اس کا جواب دیتے اخبار میں بھی ان کا جواب شایع ہوتا۔ آخر ڈاکٹر بیگلے کے ساتھ تاج محل پر کتاب لکھ کر اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے دفع کردیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مسلم دوست سے اس لئے اپنے تعلقات ختم کر لئے کہ وہ بابری مسجد کے خلاف مضامین لکھنے لگے تھے۔ وظیفہ یاب ہوکر جب وہ احمد آباد پہنچے اور وہاں کا فرقہ وارانہ فساد دیکھا تو بے چین ہو گئے مجھے ایک خط میں لکھا کہ میرا وقت ہمیشہ لکھنے پڑھنے میں گزرا ہے لیکن اس فساد سے میں اتنا متاثر ہوں کہ دو ماہ سے نہ کچھ

لکھا نہ پڑھا۔ مجھے ہر وقت یہ خیال گزرتا ہے کہ ہماری زندگی تو گزر گئی آئندہ آنے والی ہماری نسلوں کا کیا ہوگا۔

جس وقت ڈاکٹر صاحب نے اپی گرافی برانچ کا چارج لیا اس وقت وہ اکیلے تھے لیکن ان کی محنت لگن اور جدوجہد سے اس برانچ میں توسیع ہوتی گئی کئی کلاس ٹو اور کلاس ون اسامیاں پُر کی گئیں خود ڈاکٹر صاحب ڈائرکٹر کی پوسٹ تک پہنچے۔ کتنے ہی مسلمان برسر روزگار ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ اگر ہم کام نہ کریں تو کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہمیں خود اسلامی تاریخ، اسلامی علوم، اسلامی تہذیب اور اسلامی ادب کے لئے کام کرنا ہے ورنہ ہمارا یہ قیمتی سرمایہ جو کتبات، سکوں اور خطاطی کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے گوشئہ گم نامی میں پڑا رہے گا۔ کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کی ملازمت کے دوران انھیں دو ہی اسٹے نوگرافر شری کمارن اور جناردھن ملے۔ یہ دونوں کیرالا سے تعلق رکھتے تھے ان دونوں نے ڈاکٹر صاحب کی بڑی خدمت کی جس کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ جناردھن تو آخری عمر تک ڈاکٹر صاحب کی خدمت کرتا رہا۔

راقم السطور نے ۹ سال ڈاکٹر صاحب کے ماتحت رہ کر کام کیا، میں اسے اپنی بدقسمتی سمجھتا ہوں کہ میں ڈاکٹر صاحب کی رفاقت چھوڑ کر کالج کی ملازمت کی طرف چلا گیا، مجھے اس بات پر بہت فخر ہے کہ ہمارے تعلقات دن بدن بڑھتے ہی رہے۔ مجھے محکمہ آثار قدیمہ سے رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تمہارا دل نئی ملازمت میں نہ لگے یا وہاں حالات اچھے نہ رہیں تو تم اپنی سابقہ ملازمت میں آسکتے ہو میں آثار قدیمہ میں پانچ سال تک تمہارا Lien رکھتا ہوں۔ چنانچہ پانچ سال کا Lien میرے لئے رکھا گیا پانچ سال کے بعد میں نے اپنی سابقہ ملازمت سے استعفیٰ دیا۔ کالج میں لکچرر بن جانے کے بعد بھی میرا یہ معمول رہا کہ میں ایک دو گھنٹے آثار قدیمہ کے دفتر میں ضرور حاضری دیتا۔

میرا .Ph.D کا موضوع ''ارادت خان واضح۔ حیات اور شخصیت'' تھا اس

موضوع پر کتابیں آثار قدیمہ کی لائبریری میں دستیاب تھیں۔ اس کے علاوہ ارادت خان واضح کی خود نوشتہ کتب کا بڑا ذخیرہ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں تھا میوزیم کے ڈائرکٹر کے نام ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے ایک سفارشی مراسلہ دے دیا تھا جس کی وجہ سے مجھے بہت سہولت ہوگئی تھی میں نے وہاں کئی کتابیں نقل کیں۔ واپس ناگپور آکر میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی وہ Ph.D. کے سلسلے میں میری رہبری فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تمہیں ناگپور یونیورسٹی کے لئے مقالہ لکھنا ہے۔ کوئی بہت بڑا کام تو انجام دینا نہیں جو کچھ تم لکھوئے اچھا ہی لکھو گے مجھے تم تاریخ ارادت خان پڑھنے کے لئے دے دو جو تم نے وہاں سے نقل کی ہے۔ اُس وقت تک تاریخ ارادت خان شائع نہیں ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب نے تین دن میں وہ کتاب پڑھ کر مجھے واپس کردی۔ پنسل سے جگہ جگہ اہم مقامات پر نشانات اور تحریروں سے میرے لئے .Ph.D کا مقالہ تیار کرنا آسان ہوگیا۔ میں نے ان حواشی اور نوٹس کی مدد سے دو مضامین رسالہ معارف میں شائع کئے اور اپنا Ph.D کا مقالہ تیار کرلیا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے اپنے ساتھ رکھ کر میری تربیت اور رہبری کرنا چاہتے تھے مجھے ڈاکٹر عبد العلی صاحب صدر شعبہ عربی حمیدیہ کالج بھوپال نے ایک سیمینار میں مدعو کیا تھا ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا تو فرمایا کہ ہم بھی سرکاری دورہ نکال کر تمہارے ساتھ بھوپال چلتے ہیں۔ تم وہاں مقالہ پڑھنا۔ میری زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا جس میں مجھے مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کی رہبری میں مقالہ تیار کیا جس کا عنوان تھا ”مسلم سکوں اور کتبوں پر ہندو اثرات“ بعد میں یہ مقالہ جامعہ نئی دہلی میں شائع ہوا۔ ”تذکرہ مشاہیر برار“ کی اشاعت میں ڈاکٹر صاحب نے میری بڑی ہمت افزائی فرمائی فرماتے تھے کہ تم علاقۂ برار کو اپنی تحقیق کا موضوع بناؤ۔ علاقائی ادب پر کام کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ اس کے بعد سے میری اکثر کوششیں اسی سمت میں رہیں۔ اس کتاب کی رسم اجراء میں ڈاکٹر صاحب نے خود شرکت فرمائی بلکہ کتاب کی افادیت اور اہمیت پر تقریر بھی کی۔ ایک موقعہ پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی وہ ہمارے ساتھ بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں شرکت فرمائیں وہ فوراً راضی ہوگئے مگر اس شرط پر کہ اجتماع گاہ میں قیام

وطعام رہے گا لیکن ضرورت کے لئے اور نہانے دھونے کے لئے قریب ہی کسی لاج میں ایک کمرہ بک کرنا ہوگا تاکہ ہمیں سہولت ہو چنانچہ ویسا ہی کیا گیا ڈاکٹر صاحب نے تین دن اجتماع گاہ تاج المساجد بھوپال میں قیام کیا تین دن کے بعد فرمایا تبلیغی نصاب کا درس دیتے ہوئے عام طور پر پڑھنے والے عبارت صحیح نہیں پڑھتے میں پوری کتاب پڑھ کر ان تمام الفاظ پر اعراب لگا دوں گا جن کو پڑھنے میں غلطیوں کا احتمال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دونوں جلدوں پر مشکل الفاظ پر اعراب لگا دئے اس سے ڈاکٹر صاحب کے علمی اور ادبی شغف اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک روز ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل شام ہم لوگ ایک بہت بڑے عالم دین مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب سے ملنے جائیں گے جو مئوناتھ بھنجن سے ناگپور تشریف لائیں ہیں اور جن کا قیام دارالعلوم مومن پورہ میں ہے میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دار العلوم پہنچا۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی صاحب دیسائی صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے حدیث کی نادر کتب اور مخطوطات کا تذکرہ نکل آیا عصر کی نماز سے مغرب اور مغرب کی نماز سے عشاء کی نماز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مولانا سے ملنے والے حیران تھے کہ یہ شخص کون ہے جو عالم اسلامی کے کتب خانوں کے مخطوطات کی اتنی خبر رکھتا ہے اور ہر جگہ کے احادیث کے ذخیرے سے واقف ہے۔ مولانا سے میرا بھی تعارف ہو گیا پھر ایک موقعہ پر میں نے مولانا کے ساتھ بالاپور کا سفر کیا مولانا نے وہاں کا کتب خانہ دیکھا۔ اس سے قبل دو مرتبہ مجھے قبلہ دیسائی صاحب کے ہمراہ بالاپور کے کتب خانے کو دیکھنے اور وہاں کی قلمی کتابوں سے استفادہ کا موقعہ ملا تھا اُس وقت بالاپور کی خانقاہ نقشبندیہ میں بجلی بھی نہیں تھی ڈاکٹر صاحب قندیل کی روشنی میں مخطوطات دیکھتے رہے اور ان کے نوٹس تیار کرتے رہے۔ ایک دفعہ مجھے تبلیغی جماعت کے ساتھ حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا تو فرمایا کہ وہاں مولانا ابو الوفا افغانی صاحب سے ضرور ملنا علم حدیث میں ان کا بہت اونچا مقام ہے۔ یہ تھا ڈاکٹر صاحب کا علمی مذہبی اور ادبی ذوق ۔ فرماتے تھے کہ ایک وقت میرا معمول ۱۸ گھنٹے لکھنے اور پڑھنے کا تھا جب طبیعت زیادہ خراب ہوگئی اور بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تو بہت افسوس کرتے

ایسے ہی موقعہ پر ایک مرتبہ خط میں لکھا کہ کمر میں درد کی تکلیف کی وجہ سے صرف چار گھنٹے روزانہ لکھتا ہوں زیادہ بیٹھ نہیں سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کی مجھ پر بے شمار نوازشیں رہیں اس وقت ان کا اعادہ مقصود نہیں۔ ان کا ہر ہفتہ کم از کم ایک خط مجھے ضرور ملتا رہا۔ کسی ہفتے دو اور کسی ہفتے تین خطوط بھی ملتے رہے ان خطوط میں آثار قدیمہ کی لائبریری سے کسی کتاب کے اقتباس کی نقل کا مطالبہ کیا یا اس کا زیروکس طلب کیا۔ کسی کتاب پر مختصر تبصرہ کیا یا کسی ادیب یا شاعر کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ان کے یہ خطوط ادبی اور علمی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

راقم السطور ۱۹۹۲ء میں کالج سے جسے انسٹی ٹیوٹ کا درجہ حاصل ہو چکا تھا ڈائرکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوا اس کے فوراً بعد مجھے ڈاکٹر صاحب کی سفارش سے انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ نئی دہلی کی فیلوشپ مل گئی دو سال تک مجھے یہ فیلوشپ ملتی رہی دو سال کے بعد اسی پروجیکٹ کو کتابی شکل میں Topographical List of Arabic, Persian and Urdu Inscriptions of Central India کے عنوان سے دہلی سے شائع کیا گیا۔

کالج کی ملازمت کے دوران اور وظیفہ پانے کے بعد چھ سات سال تک میں مسلسل ایک ماہ اور کم و بیش اوقات کے لئے درگاہ شریف احمد آباد آتا رہا۔ جہاں ڈاکٹر صاحب کے ماتحت عربی، فارسی اور اردو مخطوطات پڑھنے اور ان کی فہرست مرتب کرنے کا موقعہ ملا۔ درگاہ شریف ٹرسٹ کے احباب اور اراکین نے میری جو عزت افزائی کی اس کے لئے بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح تیری مہربانی

ڈاکٹر صاحب انگریزی زبان پر کامل قدرت رکھتے تھے اردو بولنے اور لکھنے میں انھیں قدرے تکلف محسوس ہوتا لیکن ان کے اردو مضامین اور خطوط کو پڑھنے سے اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا وہ اردو زبان و ادب کی قابلیت میں کسی سے کم نہیں تھے فرماتے تھے کہ مجھے

علامہ اقبال کی پیام مشرق اور دیگر کتابیں زبانی یاد ہیں انگریزی زبان پر قدرت مجھے جاسوسی ناولوں کے پڑھنے سے حاصل ہوئی میں نے انگریزی جاسوسی ناولیں بہت پڑھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض ادبی خطوط تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔

ناگپور میں Anthropology کے ڈائریکٹر ڈاکٹر حسین احمد صاحب جوان کے گہرے دوست تھے انھیں ڈاکٹر صاحب اردو میں خط لکھتے ان خطوط میں بعض فارسی کے اشعار بے ساختہ ان کے قلم سے نکل آتے ڈاکٹر حسین احمد صاحب وہ خطوط مجھے دکھاتے فارسی اشعار کا مطلب دریافت کرتے اور بہت خوش ہوتے۔ ڈاکٹر حسین احمد صاحب دیسائی صاحب کے خطوط کے جواب دینے میں تساہل سے کام لیتے اس پر یہ شعر لکھا جوان کے حسب حال تھا۔

چشم اَزیں بُپُرس دپُرسی واہل کو گویند خستہ زحمت خود زیں دیار بُرد

(اس سے پہلے ہمارا حال دریافت کرلیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ہمارا حال دریافت کریں اور گلی اور محلہ والے بتائیں کہ وہ خستہ حال تکلیفیں اٹھاتے اٹھاتے اس دنیا سے رخصت ہوگیا)

اس شعر کے علاوہ جو اشعار حسین احمد صاحب کو لکھے ان میں چند اشعار یہ ہیں۔

بد نامیٔ حیات دُو روزی نہ بُود بیش
آن ہم کلیم باتُو بگویم چساں گذشت
یک روز صَرف بَستنِ دل شُد بایں وآں
رازِی دیگر بکندنِ دل زیں وزاں گذشت

یہ بات بڑے افسوس کی ہے کہ اپنوں کے مقابلے میں غیروں نے ان کی قدر ومنزلت کی غیروں نے ان کے محاسن ومحامد کی داد دی جب وہ وظیفہ پاکر ۲۴ سال ناگپور میں گذار کر اس شہر کو خیر باد کہہ رہے تھے تو اس وقت راقم السطور نے دیکھا کہ دفتر کے چند غیر مسلم اشخاص ہی انھیں الوداع کہنے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود ہیں۔ ڈاکٹر صاحب پر فارسی کے یہ دو شعر صادق آتے ہیں۔

کَس نیا مُوخت علم تیر اَز مَن　　　که مَرا عاقبت نشانه نه کرد

با وفا خود نه بُود در عالَم　　　یا که کَس اَندریں زمانه نه کرد

آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم کے لئے دعاگو ہوں کہ باری تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

۲۶

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد دیسائی

تاثرات اور یادیں

- مولانا ضیاء الدین اصلاحی
(اعظم گڑھ)

گجرات شروع سے علم وفن کا مرکز رہا ہے، مسلمان حکمرانوں کے دور میں اس زرخیز سرزمین میں کبار علماء ومشایخ مشہور اصحاب فضل وکمال اور نامور شعرا وسخن ور پیدا ہوئے، مسلمانوں کے جاہ وجلال اور ان کی حکومتوں کے خاتمے کے بعد بھی یہاں علم وادب کی رونق قایم رہی، ہمارے اس زمانے میں بھی یہاں ایک بہت مایہ ناز عالم ومحقق، تاریخ وآثار قدیمہ اور کتبات کا ماہر پیدا ہوا جس نے اپنی کتبہ شناسی، سکہ شناسی، عہد اسلامی کے فن تعمیر کی رمز شناسی، تاریخ وتحقیق میں مہارت، فارسی زبان وادب میں تبحر، مخطوطات میں بالغ نظری کا سکہ پورے ملک میں بیٹھا دیا اور کتبات کے ماہر کی حیثیت سے اس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور ایسی عالمانہ ومحققانہ تصنیفات یادگار چھوڑیں جو حوالے اور مراجع کا کام دیں گے اور علما ومحققین یہ ابران سے فایدہ اٹھائیں گے۔

دیسائی صاحب سیمینار میں بہت کم دکھائی دیتے تھے ایک روز میں نے پوچھا آپ کہاں چلے جاتے ہیں فرمانے لگے کہ میرا زیادہ وقت انڈین نیشنل اسٹڈیز لائبریری میں گزرتا ہے، میں نے کہا اس کے ڈائرکٹر تو سیمینار کے میز پر ہیں وہ (اوصاف علی) ہم لوگوں کو گھیر گھار کر لے جاتے ہیں فرمایا کہ میرے لیے چھوٹ دے رکھی ہے۔

میری مراد ڈاکٹر ضیاء الدین احمد دیسائی مرحوم سے ہے جو ابھی دو برس پہلے

ہمارے درمیان موجود تھے، ۲۰۰۲ء کے شروع میں جب پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی وبدنامی کا موجب بننے والے فسادات کی آگ گجرات میں بھڑکی ہوئی تھی اور سیکڑوں اشخاص اور گھر جلائے جارہے تھے، اسی قیامت صغریٰ کے زمانے میں علم وتحقیق کا یہ آفتاب بھی ۲۴؍مارچ کو ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور اس زین البلاد احمد آباد ہی نہیں پوری علمی وتحقیقی دنیا کو سوگوار اور اداس چھوڑ گیا۔

چاندنی بے نور، گل بے رنگ و بو نغمہ اداس
اک ترے جانے سے کیا کیا ہوگیا

یہ یاد نہیں کہ ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم کے نام سے کب سے آشنا ہوں لیکن دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی سے جب میرا تعلق ہوا اور ان کے عالمانہ ومحققانہ مضامین پڑھے تب ہی سے ان کی علمی عظمت وفضیلت کا نقش دل پر ثبت ہے۔ میرے ایک بزرگ اور دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ان کا تذکرہ مدح وستایش کے ساتھ کیا کرتے تھے اس سے بھی میرے دل میں ان کی عظمت جاگزیں ہوگئی تھی۔

دسمبر ۱۹۸۲ء میں جامعہ ہمدرد نئی دہلی کے زیر اہتمام ہمدرد نگر تغلق آباد میں بین الاقوامی قرآن کانگریس کا ۴ روزہ اجلاس منعقد ہوا تھا، اس میں شرکت کے لیے محترمی سید صباح الدین صاحب کے ساتھ گیا تو ان ہی کے کمرے میں قیام پذیر ہوا، اتفاق سے مرحوم دیسائی صاحب بھی اس میں شرکت کے لیے آئے ہوئے تھے گر وہ کچھ بعد میں پہنچے تھے. غالباً اس کی وجہ سے ان کو کمرہ نہیں مل رہا تھا یا جومل رہا تھا اس میں وہ جانا نہیں چاہتے تھے اس لیے مرحوم صباح الدین صاحب نے فرط تعلق کی بنا پر ان کے لیے اپنے ہی کمرے میں ایک پلنگ لگوادی اور کہا آپ کہیں نہ جائیے اور میرے ساتھ رہیے، ان سے میری پہلی ملاقات یہیں ہوئی اور چند روز تک شب وروز ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے گھل مل گیا، خوب علمی باتیں ہوتیں جن سے مجھے بڑا فایدہ ہوا، جب تک انھیں دیکھا نہیں تھا اس وقت تک تو صرف ان کی علمی قابلیت ہی کا سکہ دل پر بیٹھا ہوا تھا مگر اب ملاقات کے بعد ان کی شرافت ومروت، حسن اخلاق اور کردار کی بلندی نے بھی مجھے ان کا گرویدہ بنادیا۔

اس کے بعد کب کب ملاقات ہوئی یاد نہیں، البتہ کبھی کبھی خط وکتابت رہتی تھی، ۱۹۹۲ء میں بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے مولانا شبلی پر ایک دو روزہ سیمنار ہوا جس کے داعی اس وقت کے شعبہ اردو کے سربراہ پروفیسر عبدالستار دلوی تھے، ان کے اصرار پر میں اس میں شریک ہوا، اسی دوران ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی بھی بمبئی تشریف لائے اور دلوی صاحب کے مہمان ہوئے، سیمنار ختم ہونے کے بعد میں وہیں رکا تھا کہ ایک روز مولانا مستقیم احسن اعظمی کا فون آیا محترم دیسائی صاحب آئے ہوئے ہیں اور تم سے ملنے کے خواہش مند ہیں، دلوی صاحب نے مجھے فون کیا ہے کہ کل صبح آپ کو لے کر ان کے گھر پہنچوں اور ان کے ساتھ آپ ناشتہ کریں، میرے لیے دیسائی صاحب سے ملنا ملاقات مسیحا وخضر سے بڑھ کر تھا اس لیے بصد شوق گیا اور دیر تک ان کے عالمانہ خیالات اور نصائح سے مستفید ہوتا رہا۔

۱۹۹۵ء میں حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف ٹرسٹ کے سیمنار کا دعوت نامہ مرحوم دیسائی صاحب کی تحریک پر مجھے ملا، اس میں پروفیسر محی الدین بمبئی والا ڈائریکٹر سیمینار کا یہ خط بھی تھا کہ دیسائی صاحب ہی اس سیمنار کے روح رواں ہیں، ان کی خواہش ہے کہ تم ضرور آؤ، انھیں تمہارا انتظار رہے گا، ان کا یہ لکھنا میرے لیے مہمیز بن گیا اور میں فوراً آنے کے لیے آمادہ ہو گیا اور جب پہنچا تو بہت خوش ہوئے اور اپنے گھر آنے کی دعوت دی، ایک صاحب کو مقرر کر دیا کہ وہ فرصت کے وقت مجھے ان کے گھر پہنچائیں، وہ لے گئے تو بڑی محبت سے پیش آئے اور خاص طور پر اپنا کتب خانہ دکھایا اور متعدد علمی باتیں کرتے رہے، اسی سفر میں جناب محی الدین صاحب کے ہمراہ بھی ان کے گھر گیا تھا۔

دوسری بار جب سیمنار میں یہاں آتا تو ان کی طبیعت اچھی نہیں تھی مگر دو ایک سشن میں آئے لیکن اوپر جانے میں دشواری تھی، اس لیے دفتر ہی میں ملاقات ہوئی اور خورشید پارک جا کر بھی شرف ملاقات حاصل کیا، اور اب یہ تیسری یا چوتھی بار آیا ہوں تو بڑی حسرت سے یہ کہنا پڑ رہا ہے ؎

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　　روے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

ڈاکٹر ضیاء الدین احمد دیسائی مرحوم احمد آباد کے ایک قصبہ دھندوکا میں ۷ا رمئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے تھے، وہ بڑے ذہین تھے اور شروع ہی سے پڑھنے لکھنے میں بڑی محنت کرتے تھے اس لیے اسکول اور کالج میں ہمیشہ اول نمبر سے کامیاب ہوتے تھے، گورنمنٹ میرٹ اسکالرشپ ان کو ملتی تھی۔ اعلا تعلیم بمبئ میں حاصل کی تھی۔

۱۹۴۷ء میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوئے اور احمد آباد، اسماعیل یوسف کالج بمبئ اور دھرمندر سنگھ جی کالج راج کوٹ میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ ۱۹۵۳ء میں آرکیالوجیکل سوسائٹی آف انڈیا دہلی فارسی عربی کتبہ شناسی کے شعبہ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، ۱۹۵۸ء میں اس کا دفتر ناگ پور منتقل ہوا تو یہاں چلے آئے، ۱۹۶۱ء میں وہ سپرنٹنڈنٹ ہوئے، ۱۹۷۷ء میں وہ اس شعبہ کے ڈائریکٹر ہوگئے اور اسی عہدہ سے ۱۹۸۳ء میں سبک دوش ہوئے۔

اپنی محنت وقابلیت کی بنا پر وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی وہ مختلف ذمہ داریاں انجام دیتے رہے، ۱۹۹۲ء تک انڈین کونسل فار ہستاریکل ریسرچ نئی دہلی کے ریسرچ فیلو، پھر ۱۹۹۸ء تک امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹڈیز نئی دہلی کے جوائنٹ کارپوریٹر رہے۔

ڈاکٹر صاحب فنافی العلم تھے، علم وفن سے برابر ان کا اشتغال رہتا تھا۔ ملازمت کی ذمہ داریاں تصنیف وتالیف میں حایل نہیں ہوئیں حسرت کی طرح چکّی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہتی تھی۔ لکچرر ہونے کے بعد ۱۹۴۸ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا، ۱۹۵۷ء میں حکومت نے انہیں ایران بھیجا، وہاں ایک سال قیام رہا اور فیضی کی نل دمن پر تحقیقی مقالہ لکھ کر تہران یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی، حکومت ہند کی جانب سے اس کے نمایندے کی حیثیت سے وہ روس امریکہ، عراق، افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش بھی گئے، ہندوستان اور بیرونی ممالک کی کئی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔

ڈاکٹر ضیا الدین مرحوم کا علم ومطالعہ وسیع تھا، ان کی علمی خدمات کا دایرہ بھی وسیع تھا، ڈاکٹر صاحب کی اصل تصنیفی زبان انگریزی تھی۔ اس میں ان کے بہ کثرت مضامین اور

کتابیں شایع ہوئیں، وہ محکمہ آثار قدیمہ ہند کے سرکاری انگریزی مجلّہ کے ایڈیٹر بھی رہے، ان کی ادارت میں ان کے اکیس (۲۱) شمارے شایع ہوئے جن میں خود ان کے مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ ہندوستان کے باہر کے ملکوں کے رسایل میں بھی ان کے مضامین چھپتے تھے۔

انگریزی کے علاوہ اردو، ہندی، گجراتی اور فارسی کے رسایل وجراید میں بھی وہ مضامین لکھتے تھے، ذیل میں ہم صرف ان کے اردو مضامین کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں اور جن رسالوں میں وہ چھپے ان کا نام لکھتے ہیں، ان سے ان کی علمی کدوکاوش اور تحقیق وجستجو کا کسی قدر اندازہ ہوگا۔

نمبر شمار	نام رسالہ بقید سنہ	نام مضمون
۱۔	نوائے ادب بمبئ اپریل ۱۹۵۵ء	گفتار ملک محمود گجراتی
۲۔	نوائے ادب بمبئ اکتوبر ۱۹۵۵ء	شغل طوبی
۳۔	مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۶۳ء	کچھ دیوان قاسم منیجا کے متعلق
۴۔	مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۶۳ء	خان خانان اور عرفی کی مکاتیب کا ایک صفحہ
۵۔	تحریر دہلی ۱۹۶۷ء	دسویں صدی ہجری کا ایک اردو کتبہ
۶۔	تحریر دہلی ۱۹۶۷ء	بارہویں صدی ہجری کا ایک اردو کتبہ
۷۔	تحریر دہلی ۱۹۷۲ء	ہندوستانی آثار قدیمہ
۸۔	تحریر دہلی جنوری مارچ ۷۲ء	ہندوستان کے عہد اسلامی کے سکے
۹۔	تحریر دہلی ۱۹۷۷ء	شعرا کے سنین وفات: استدراک
۱۰۔	غالب نامہ دہلی ۱۹۸۴ء	غالب کے دو معاصر
۱۱۔	غالب نامہ دہلی ۱۹۸۶ء	غالب کے منظوم کتبے

۱۲۔	سابرنامہ احمد آباد ۱۹۹۰ء	دبستان شیرانی کا ایک محقق
۱۳۔	معارف اعظم گڈھ ۱۹۹۱ء	سترہویں صدی کے آگرہ کے ایک عارف وخطاط شاعر میر عبداللہ مشکین
۱۴۔	خدابخش لائبریری جرنل ۱۹۹۸ء	مہریں ترقیمے عرض دیدے اور یادداشتیں
۱۵۔	تذکرہ مشاہیر برار حیدرآباد ۱۹۸۲ء	وودربھ کی تاریخی عمارتیں
۱۶۔	نذر مختار نئی دہلی ۱۹۸۸ء	اکبر کا بعد از مرگ لقب عرش آشیانی یا عرش آستانی
۱۷۔	خلیق احمد نظامی میموریل والیوم علی گڈھ	خیر المجالس اور گجرات

ڈاکٹر صاحب نے اے گوش کی ایک انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ''آثار اقدیمہ ہند'' کے نام سے کیا۔

انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی کے زیر اہتمام شایع ہونے والی تقویم ہجری وعیسوی میں ڈاکٹر صاحب کا اشتراک شامل تھا۔ حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف احمد آباد کے کتب خانے کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست کی چھ جلدیں ڈاکٹر صاحب کی رہنمائی اور سرپرستی میں شایع ہوئیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم کی بعض انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے ہوئے جیسے:

۱۔ ہند اسلامی طرز تعمیر ۔ مترجم پروفیسر اختر الواسع

۲۔ ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز ۔ مترجم جناب بہار برنی

۳۔ ہندوستانی مسجدیں

موخر الذکر کتاب کو پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات ونشریات حکومت ہند نے گورنمنٹ آف انڈیا پریس فرید آباد سے جون ۱۹۲۷ء میں شایع کیا ہے، اس پر مترجم کا نام نہیں ہے، ممکن ہے مصنف ہی نے ترجمہ کیا ہو، یہ ۵۴ صفحات اور متعدد مساجد کی تصویروں پر

مشتمل ہے۔اس کے محتویات ومباحث پر یہاں مختصر گفتگو کی جاتی ہے۔

یہ مختصر کتاب بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر کا مصداق ہے جو چار ابواب میں ہیں، پہلے باب میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اسلام میں مسجد کا درجہ ومرتبہ بیان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ آغاز اسلام سے کئی صدیوں تک مسجد خدا کی عبادت اور نماز پڑھنے کی جگہ ہونے کے ساتھ مسلمانوں کی پوری زندگی کی ہمہ جہتی اعلا قدروں کا مرکز ہوتی تھی، ان کی روز مرہ زندگی کے تمام کام بشرطیکہ ان میں کوئی بات اسلام کی کسی بنیادی تعلیم کے خلاف نہ ہوتی، اسی مسجد کے کسی نہ کسے حصے میں سرانجام پاتے تھے۔اسلام کے ابتدائی دور میں قوم کی سیاسی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کا محور تھی، جماعت سے نماز پڑھنا اور مسجد میں اسے ادا کرنا عبادت الہی کے علاوہ قومی یک جہتی کے جذبے کو ترقی دینے کا ذریعہ بھی تھا۔مختلف نسلی گروہوں اور تہذیبی وتمدنی جماعتوں کو یک جا اور متحد کرنے سے ایک ملت کی تشکیل کے لیے شیرازہ مہیا کرنا مقصود ہوتا ہے۔

یہ اور اسی طرح کے بعض اور مفید پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد آخر میں لکھا ہے ''اسلام کے آغاز سے صدیوں بعد تک مسجد عبادت گاہ بھی رہی، قومی مسایل کی بحث وتمحیص کی جگہ بھی اور مدرسہ بھی اور کبھی کبھی مسافر خانہ اور اقامت گاہ بھی''۔

دوسرے باب میں نماز اور اس کے لوازم وضو، اذان اور قبلہ وغیرہ کو بتا کر مسجد کے اہم حصوں اور ضروری اجزا وعناصر کا بیان ہے، اس کے بعد مسجد کی عمارت سے بحث کی ہے اور دکھایا ہے کہ اس کا ابتدائی تصور وتخیل کیا تھا اور پھر عہد بہ عہد اس میں کیا ارتقا واضافہ اور تبدیلیاں ہوئیں، آخر میں مختلف اسلامی ملکوں کی مشہور مسجدوں کے ناموں کا ذکر ہے۔

تیسرے باب میں ہندوستان میں مسجد کی تعمیر کی کیفیت اور تفصیل درج ہے۔ یہ [illegible] بتایا ہے کہ کس زمانے کی مسجدیں اب تک یہاں باقی رہ گئی ہیں، اور ان کی تعمیر میں کیا طریقہ [illegible] کس طرح کے اسباب وسامان استعمال ہوئے ہیں، ایک دلچسپ نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ تعمیر مسجد میں مسلمان کاریگروں کو کیا دقتیں پیش آئی ہوں گی کیونکہ مسجد کے لیے درکار ضرورتیں یہاں مفقود تھیں، یہاں کے عمارتی مسالے کی ضرورت مسجدوں کو نہیں تھی۔ ایسی

صورت میں ملک اور غیر ملک کے طریقوں کا اختلاف جن قدیم ترین مسجدوں میں زیادہ نمایاں ہے وہ قطب الدین ایبک کی تعمیر کردہ مسجد قوت الاسلام اور اسی کی بنیاد پر رکھی ہوئی اجمیر کی اڑھائی دن کا جھونپڑا ہے، جن پر ایک نظر ڈالنے ہی سے روشن ہو جاتا ہے کہ ابھی تک یہاں کے متعدد تعمیری اصول اسلامی خیالات، نقشے اور اسلوب سے میل نہیں کھا سکے ہیں، ان کی وضع قطع اور نقشے سے یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ اسلامی نہیں، ہندو عمارتیں ہوں، گو ان میں گنبد اور محراب موجود ہیں لیکن یہ خالص اسلامی اجزا بھی مقامی انداز میں توڑے کی مدد سے بنائے گئے ہیں۔

پھر وہ تیرہویں صدی کے آغاز میں اسلامی فن تعمیر کے نئے ماحول میں پہنچ جانے اور مسجد کی تعمیر اور اس کی ساخت میں اہم ردوبدل ہونے کا ذکر کرتے ہیں اور اس کا نمونہ دلی کے علائی دروازے اور دلی ہی کی جماعت خانہ مسجد میں دکھایا ہے کہ یہ کاملاً اسلامی اصولوں پر پوری اترتی ہے۔

خاندان تغلق کے دور میں مسجد کی ساخت میں تبدیلیاں ہونے کا ذکر کیا ہے اور سیدوں، لودیوں اور سوریوں کے زمانے کی اس کوشش کو دکھایا ہے کہ مسجد کے تعمیری تخیل اور نقشے میں کچھ اور تنوع پیدا ہو۔ مغلوں کے دور کو گو تعمیری اعتبار سے عدیم المثال قرار دیا ہے مگر کہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر میں اہم تبدیلی شاہجہاں کے زمانے میں ہوئی اور اس کی ظاہری وضع مزید نفیس، نازک اور دل کش ہو گئی، اس کے اسباب بھی بتائے ہیں، اس کے بعد کے زمانوں میں انھیں مسجد کی تعمیر میں زوال کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔

اس باب کے آخر میں صوبائی مسجدوں اور ان کے طرز تعمیر پر بحث کی ہے چنانچہ بنگال، دکن، جون پور، مالوہ، گجرات اور کشمیر وغیرہ آزاد مسلم ریاستوں کی مسجدوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں دلی کے تعمیری نمونوں کے ساتھ مقامی طرز کی آمیزش سے ایک نیا طرز تعمیر وجود میں آ گیا پھر ہر جگہ مسجدوں کے طرز تعمیر کی خصوصیات دکھائی ہیں۔

چوتھا اور آخری باب ہندوستان کی ۳۴ اہم اور ممتاز مسجدوں کے ذکر کے لیے مخصوص ہے، جن شہروں کی خاص خاص مسجدوں کا ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں:

دہلی، اجمیر، پنڈوہ (ضلع مالدہ، بنگال)، گوڑ (بنگال)، جون پور، منگرول، احمد آباد، چانپانیر، مانڈو (مالوہ)، گلبرگہ، بیجاپور، حیدر آباد، سری نگر اور سرنگا پٹن۔

بعض شہروں کی کئی کئی مسجدوں کا ذکر ہے ان کی تفصیل اس طرح ہے:

دہلی-۱۱، گوڑ-۴، جون پور-۳، احمد آباد-۲، مانڈو-۲، بیجاپور-۳، حیدر آباد-۲۔

ہر ہر مسجد کے متعلق بتایا ہے کہ اس کی وسعت ورقبہ کیا ہے، ساخت اور نقشہ کیا ہے، کس نے تعمیر کرایا ہے، مسجد کے اجزا اور اہم حصوں کے بارے میں مفید معلومات اور طرز تعمیر کی خصوصیات، حسن ودل فریبی وغیرہ کی تفصیل دی ہے، تعمیر کا نقص اور اس میں پائی جانے والی کور کسر بھی واضح کی ہے۔

منفرد نوعیت کی حامل مسجدوں کے نقشے بھی دیے ہیں جن سے مصنف کی بیان کردہ خصوصیات واطلاعات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

مصنف کی تمام تصنیفات بڑی دقت نظر، کثرت مطالعہ، تلاش، تحقیق اور کد وکاوش کا نتیجہ ہیں، یہ کتاب بھی ان کی وسعت علم ونظر اور تحقیق ومحنت کا [illegible] ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین کی علمی خدمات وکمالات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اہم اعزازات سے بھی نوازا گیا، جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

۱۔ اپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے انھیں ۱۹۸۲ء میں سرٹی فیکٹ آف آنر ''تامر پتر'' دیا گیا۔

۲۔ حکومت ہند نے فارسی کی مسلمہ قابلیت اور خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۳ء میں صدارتی ایوارڈ دیا۔

۳۔ ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر آئی بی تیسی ٹوری گولڈ میڈل ملا۔

۴۔ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے ۱۹۹۳ء میں سرجدوناتھ سرکار گولڈ میڈل انھیں دیا۔

۵۔ اسی سال وڈودرہ سے انہیں سنسکار ایوارڈ ملا۔

۶۔ گجرات اردو اکادمی کا ایوارڈ ۱۹۹۵ء میں ملا۔

۷۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی، تحقیقی، خدمات اور کارنامے گوناگوں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور وہ ان سے بھی بڑے اعزاز واکرام کے مستحق تھے۔ یہ دنیاوی اعزاز تو ہیچ ہوتے ہیں، اصلی تو آخرت کا ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ عالم آخرت میں ان کے درجات ومراتب بلند کرے۔ آمین۔

۲۷

استاد دانشمند ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی

فارسی زبان وادب کے ایک منفرد عالم

- ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

(دہلی یونیورسٹی)

پھیلا ہے دھواں ہر سو، پر اُن کے تصور سے
کھنچ جاتی ہیں آنکھوں میں تصویر اجالوں کی

اس ناچیز کو ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب مرحوم کا شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ فارسی میں ایم۔اے۔ کرنے کے بعد، مجھے آثار قدیمہ میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما کرنے کا موقع ملا۔ یہ دو سال کا کورس تھا۔ دسائی صاحب اس وقت آثار قدیمہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے، ان کا مرکزی دفتر ناگپور میں تھا۔ آپ نے دو سال کے اس عرصے میں ہماری کلاس کو ہندوستان میں مسلم طرز تعمیر اور کتبہ شناسی کا درس دیا۔ اسی زمانے میں آپ کے ساتھ آگرے جانے کا اتفاق بھی ہوا جہاں آپ نے تاج محل، قلعہ اور پھر فتح پور سیکری کی عمارات دکھائیں اور ہندوستان میں مسلم طرز تعمیر کی باریکیاں، نزاکتیں، خصوصیات اور ان کی عظمت وشوکت پر اس طرح علمی وفنی گفتگو کی جیسے ایک ماہر ہی سے اس کی توقع کی جاسکتی ہے۔

اس کے بعد یہ تعلق ہمشیہ برقرار رہا اور ان سے کسب فیض کا سلسلہ ان کی وفات سے چند ہفتے قبل تک جاری رہا۔ ڈاکٹر صاحب سے دہلی میں، ملک کے دیگر علاقوں میں سیمناروں میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں اور وہ میری علمی وتحقیقی راہنمائی کرتے رہے۔ ڈاکٹر

صاحب مجھے ہی کیا اپنے تمام ہی وابستگان کو خطوط بہت لکھتے تھے جو ان کے خلوص کے غماز تھے۔ یہ خطوط محض ذاتی نوعیت کے کم، علمی نوعیت کے زیادہ ہوتے تھے۔

علمی معاملات میں جناب دسائی صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی تہ دار تھی۔ وہ بہ یک وقت فارسی زبان وادب کے عالم وفاضل، صاحب نظر مورخ، فارسی اور اردو سے انگریزی میں ترجمے کے ماہر، مخطوطہ شناس، کتبہ شناس، صاحب استعداد محقق، یہ سب امتیازات ان کی ذات میں جمع تھے۔

Archaeological Survey میں Epigraphy کے شعبے سے وابستگی کی وجہ سے وہ ہندوستان کی صرف قرون وسطی کی تاریخ ہی سے بخوبی واقف نہیں تھے، بلکہ ہمارے عظیم وقدیم ملک کی قدیم تاریخ سے بھی کما حقہ آشنا تھے۔ اسی وجہ سے تاریخ کے معاملے میں ان کی نظر نہایت وسیع تھی۔ یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں کہ قرون وسطی کی سیاسی، سماجی اور ادبی تاریخ کی عظمت، مناسبت اور ہر میدان میں اس میں تنوع کی افہام وتفہیم بغیر قدیم ہندوستانی تاریخ کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہو سکے اور دسائی صاحب کو ہمارے موجودہ مورخین میں یہ امتیاز حاصل تھا۔ ایک مورخ کی حیثیت سے ان کی شخصیت میں یہ دونوں روایتیں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھیں اور انہی روایات کی بنیاد پر وہ قرون وسطی کے ہندوستان کی مجموعی تاریخ کی قدر وقیمت بیان کرتے تھے۔

معلوم ہے کہ دسائی صاحب مرحوم فارسی، عربی کتبہ شناسی کے شعبے سے وابستہ تھے اور یہ وابستگی کافی عرصے تک برقرار رہی۔ اسی وابستگی نے انہیں کتبوں کی تلاش میں ملک کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ آپ نے بے شمار عربی، فارسی کتبے تلاش کیے اور ایک علمی وتحقیقی انداز سے ان کی وضاحت کی اور انہیں اپنے ہی شعبے کے مجلّے میں شائع کیا۔ دسائی صاحب کو کتبے پڑھنے میں ملکہ حاصل تھا کہ یہی ان کا خاص میدان عمل تھا۔ جو حضرات کتبوں کے بارے میں معمولی واقفیت بھی رکھتے ہیں، انہیں یہ بھی علم ہے کہ بعض کتبے مکمل اور اپنی اصلی حالت میں دستیاب ہوتے ہیں، لیکن ایک بڑی تعداد ہے ایسے کتبوں کی بھی جو کئی لحاظ سے ناقص ہیں۔ ان ناقص کتبوں کی شناخت، قرأت اور توضیح وتشریح نہایت مشکل کام

ہے۔ دسائی صاحب نے چوں کہ بے شمار کتبے پڑھے تھے، ان کی توضیح و وضاحت کی تھی، اور رات دن ان کا یہی مشغلہ تھا، اس لیے وہ اپنے اس تجر اور ریاض کی وجہ سے ناقص کتبوں کو نسبتاً آسانی سے صحیح پڑھ لیتے تھے۔ دسائی صاحب کی اس نوعیت کی کوششوں کو ان کے معاصر ھم پیشہ فضلا اور محققین نے بڑی اہمیت دی ہے اور سراہا ہے۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ فارسی اور عربی کتبے مختلف خطوط میں لکھے گئے ہیں۔ عام طور پر کوفی، نسخ، ثلث، نستعلیق وغیرہ خطوط کتبوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ دسائی صاحب کا یہ امتیاز بھی تھا کہ وہ ان تمام خطوط میں یکساں مہارت سے کتبوں کو بہ آسانی پڑھ لیتے تھے اور ان میں حتی الامکان بعض نواقص بھی دور کردیتے تھے۔

دسائی صاحب کی فارسی ادب پر بھی گہری نظر تھی وہ اس کی نزاکتوں سے واقف تھے۔ اسی کے طالب علم رہے تھے اور کچھ مدت فارسی زبان ادب کے استاد کی حیثیت سے خدمات بھی انجام دی تھیں۔ اس وجہ سے وہ دیگر کتبہ شناسوں کی طرح ایک کتبے کا محض تاریخی زاویے ہی سے مطالعہ نہیں کرتے تھے، بلکہ وہ اس کے ادبی محاسن پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ آپ نے متعدد ایسے منظوم کتبے تلاش کیے تھے جو ہندوستانی فارسی ادب کی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کی تحقیقی نگاہ نے یہ پتا لگالیا تھا کہ بعض منظوم کتبے ایسے بھی ہیں جن کے شاعروں کے احوال کہیں دستیاب نہیں ہوتے اور یہ صرف منظوم کتبے ہی ہیں جن میں ان شعرا کا نام وکلام ملتا ہے۔ اس موضوع پر دسائی صاحب نے الگ سے ایک گراں قدر مضمون بھی لکھا ہے جو ہندوستانی فارسی ادب کی تاریخ کو مکمل کرنے میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

دسائی صاحب کو، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، مختلف خطوط پڑھنے میں مہارت حاصل تھی جس کی وجہ سے آپ فارسی مخطوطات نسبتاً آسانی اور روانی سے پڑھ لیتے تھے اور چوں کہ بے شمار خطی نسخے اِن کی نظر سے گذر چکے تھے، اس لیے وہ حتی ایسے خفی نسخے بھی بہ آسانی اور صحیح پڑھ لیا کرتے تھے جو کاتبوں کی لاپرواہی کا شکار ہوتے ہیں۔

راقم حروف کو ان کے ہمراہ دہلی میں آرکائیوز اور نیشنل میوزیم میں محفوظ فارسی

مخطوطات دیکھنے اور مطالعہ کرنے کا موقعہ ملا۔ وہ کسی بھی نسخے کے صرف مشتملات سے دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ خود نسخہ بھی ان کی نظر میں اہم ہوتا تھا۔ یہ نسخہ کس سال کتابت ہوا، اس پر کوئی مہر ہے تو کس کی ہے، اسی طرح نسخے پر دیگر نوعیت کی تحریریں وغیرہ ان کی توجہ کا مرکز قرار پائی تھیں۔ میں نے بارہا یہ محسوس کیا، کہ وہ ہر اس تحریر میں دلچسپی لیتے جس کا پڑھنا بعض وجوہات کی بنا پر مشکل ہوتا اور اسی وجہ سے اس نسخے کے دیگر قاریوں نے اسے نظر انداز کر دیا ہوتا۔ وہ اس نوعیت کی گنجلک تحریروں یا ناقص مہروں وغیرہ کو پڑھ لیتے تھے اور اس طرح اس نسخے کی تاریخی اہمیت کو اجاگر کر پاتے تھے۔

دسائی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انہوں نے بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں اور خطی نسخے پڑھے تھے۔ وہ ہندوستان میں ہوں یا ہندوستان سے باہر، ان کا بیشتر وقت کتابخانوں میں گزرتا تھا۔ آنکھوں کے ڈاکٹروں کی ہدایت تھی کہ وہ کم سے کم پڑھیں لکھیں، لیکن علمی ذوق وشوق کی وجہ سے وہ ڈاکٹروں کی اس ہدایت سے چشم پوشی کرتے رہے۔ ان کے مطالعے کا ایک خاص انداز تھا۔ کوئی قلمی نسخہ یا مطبوعہ کتاب پڑھ رہے ہیں، اُن میں اُن کی دلچسپی کا کوئی جملہ یا حوالہ آیا یا کوئی ایسی اطلاع ان کے مطالعے میں آئی جو ان کی نظر میں اہم ہے، وہ ایسی تمام تحریروں کو نقل کر لیتے تھے اور بعد میں اپنے تحقیقی کاموں میں ان یادداشتوں سے استفادہ کرتے تھے۔ اس نوعیت کی ہزاروں یادداشتیں ان کے بیسیوں فائلوں (اسکریپ بکس) میں محفوظ ہیں۔ یہ فائل اب پیر محمد شاہ درگاہ لائبریری کی زینت ہیں۔ ایران کے معروف محقق علامہ قزینی اور لاہور کے نامور دانشور پروفیسر محمد شفیع کی اسی طرح کی یادداشتیں کئی کئی جلدوں میں شائع کردی گئی ہیں۔ امید کرنی چاہیے کہ درگاہ لائبریری بھی دسائی صاحب کی یہ یادداشتیں کسی وقت منظر عام پر لانے کا فیصلہ کرے گی تاکہ فارسی زبان وادب اور ہندوستان کے قرونِ وسطی کی تاریخ پر تحقیقی وعلمی کام کرنے والے ان تحریروں سے اپنے اپنے کاموں میں فائدہ اٹھا سکیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی بیان کردی جائے کہ دسائی صاحب کی یہ یادداشتیں بعض ایسے خطی نسخوں اور مطبوعہ کتابوں سے مأخوذ ہیں جو کسی نہ کسی لحاظ سے اور معتبر مآخذ میں شمار ہوتی ہیں۔ ان میں بعض نسخے، جیسا

کہ مجھے علم ہے، منحصر بہ فرد ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں جو ایران، امریکا، برطانیا، روس وغیرہ کے کتب خانوں کی زینت ہیں اور ہندوستان میں موجود نہیں۔

راقم نے عرض کیا ہے کہ مجھے دسائی صاحب مرحوم کے ساتھ مہینوں علمی و تحقیقی کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ یہ میرے لیے کسی علمی و تحقیقی نعمت سے کم نہیں تھا۔ یہاں موجود متعدد حضرات کو علم ہے کہ شاہجہاں کے دور خلافت کی تاریخ شاہجہاں نامے کے انگریزی ترجمے کا پروجیکٹ، دسائی صاحب مرحوم کی سرپرستی اور نگرانی میں مکمل کیا گیا ہے۔ راقم بھی اس پروجیکٹ سے وابستہ تھا۔ دسائی صاحب دہلی تشریف لاتے تھے اور ایک دو ہفتے قیام کرتے۔ مجھے تقریباً ہر روز ان کے ساتھ شاہجہاں نامے کے ایک حصے کے خود اپنے انگریزی ترجمے یا دیگر اساتذہ کے دوسرے حصوں کے تراجم پر نظر ثانی کرنی ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ دسائی صاحب کو فارسی کے حتی غیر مانوس الفاظ کے انگریزی ترجمے میں بھی کوئی تأمل نہیں ہوتا تھا اسی طرح وہ سیاق وسباق کو ذہن میں رکھ کر انگریزی ترجمے کو مکمل صورت دینے کی کوشش کرتے تھے۔ ترجمے کے سلسلے میں ان کی بیشتر تجاویز حق بجانب ہوتی تھیں۔

اسی ترجمے کے پروجیکٹ کے دوران ایک دوسری حقیقت کا بھی علم ہوا۔ سب ہی جانتے ہیں کہ دسائی صاحب نے اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے کے لیے ہندوستان کے کونے کونے کی خاک چھانی تھی۔ بے شمار شہروں، قصبوں اور دیہاتوں سے ان کا گزر ہوا تھا چوں کہ یادداشت غضب کی تھی، اس لیے ان شہروں وغیرہ کے بارے میں ان کے مشاھدات ان کے ذھن میں تازہ رہتے تھے۔ عبدالحمید لاہوری کے مطبوعہ شاہجہاں نامے میں ایک جگہ تحریر ہے کہ شاہجہاں نے روتہاس میں ایک شکار گاہ تعمیر کرائی تھی۔ جب دسائی صاحب نے یہ پڑھا تو کھٹکے اور کہا کہ میں روہتاس گیا ہوں۔ یہ بہار میں ہے اور وہاں غالباً کوئی شکار گاہ نہیں جسے شاہجہاں نے بنوایا ہو۔ ظاہر ہے اب ترجمے کو آخری شکل وصورت دینے میں تأمل ہوا۔ شاہجہاں نامے کے مختلف خطی نسخے دیکھے گئے اور بالآخر پتا یہ چلا کہ حضرت کاتب کی لاپرواہی اور خود فارسی رسم الخط کی کمزوریوں کی وجہ سے روپباس جو پنجاب

میں واقع ہے، روتھاس ہو گیا ہے۔ شاہجہاں نامے میں اس طرح کی متعدد اصلاحات دسائی صاحب کے مشاہدات کی مرہون منت ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ترجمے کے اس پروجیکٹ کے اصل ذمہ دار امریکن پروفیسر بیگلے صاحب روپباس گئے اور یہ شکارگاہ خود دیکھی۔ عبدالحمید لاہوری کا شاہجہاں نامہ شاہجہاں کی تاریخ کا ایک اہم مأخذ ہے۔ قرونِ وسطیٰ اور خاص طور پر مغلوں کی تاریخ پر متعدد معروف مورخین نے کام کیا ہے اور تحقیقی شاہجہاں نامہ پڑھا ہے، لیکن روتھاس اور روپباس میں التباس کسی کو متوجہ نہیں کر سکا۔ اور یہ بنیادی اور تاریخی تصحیح دسائی صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اسی طرح کی بہت سی دیگر مثالیں دی جا سکتی ہیں جن سے پتا چلے گا کہ دسائی صاحب نے اپنے وسیع مطالعے، گہرے مشاہدے اور منطقی استدلال کی صلاحیت کی بنا پر دوسرے علما و محققین کی فروگذاشتوں کی تصحیح کی ہے۔

دسائی صاحب سنجیدہ شخص تھے۔ ہنستے کم تھے۔ ہر کام سنجیدگی اور ذمے داری سے انجام دینا ان کا وطیرہ تھا۔ چوں کہ خود ہر کام سنجیدگی اور احساسِ ذمہ داری سے انجام دیتے تھے، اس لیے وہ بجا طور پر یہ توقع بھی کرتے تھے کہ ان سے وابستہ حضرات بھی ان کی طرح اپنے اپنے تحقیقی و علمی کاموں کی نوک پلک درست کریں اور جہاں تک ہو سکے اپنے کام کو ہر لحاظ سے مکمل شکل وصورت میں پیش کریں۔ اس سلسلے میں اس ناچیز نے ان سے خاصی ڈانٹ کھائی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ان سے وابستہ دوسرے حضرات بھی علمی و تحقیقی معاملات میں تساہل پر ان کے غیض وغضب سے محفوظ نہیں رہے۔ اپنے علمی متعلقین کے ساتھ یہ سختی ان کے خلوص اور حسن نیت کی وجہ سے تھی ورنہ کون کس کے بھلے کی سوچتا ہے۔

دسائی صاحب کی متعدد کتابیں اور بے شمار مقالات شائع ہو چکے ہیں، راقم نے ان کی کتابیں تو تقریباً سب ہی پڑھی ہیں، ہاں ان کے تمام مضامین کا مطالعہ نہیں کر سکا اس لیے کہ وہ مختلف ہندوستانی اور دیگر ممالک کے مجلات میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کے علمی کام جو مرے مطالعے میں آئے ہیں، ان کے محاسن پر مفصل گفتگو کی جا سکتی ہے، لیکن ظاہر ہے اس وقت اس کا موقع نہیں، پھر بھی میں ان کے ایک مضمون کا اجمالی تعارف کرانا چاہتا ہوں جس سے ان کی تحقیقی رویے اور علمی دانش وبینش کا ایک حد تک اندازہ ہو سکے گا۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنا میں ''ترقیمے، مہریں، عرض دیدے'' کے موضوع پر ایک سیمنار تھا۔ راقم بھی اس میں شریک تھا۔ دسائی صاحب نے اس سیمنار کے لیے مہریں، ترقیمے، عرض دیدے، یادداشتیں'' کے عنوان سے اپنا علمی و تحقیقی مقالہ تیار کیا تھا۔ یہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ آپ نے اس کا صرف ایک حصہ جو ''خطی نسخوں پر مہریں'' کے بارے میں پیش کیا۔

آپ نے مقالے کے اس حصے میں دنیا میں مہریں لگانے کا رواج، مہریں لگانے کا مقصد، مہروں کی شکل وصورت، مہروں کی منظوم ومنثور تحریریں اوران کی نوعیت، ہندوستان میں کن بادشاہوں کی مہریں ہیں، شاہی خاندان کے دیگر افراد کی مہریں، امرا ووزراء کی مہریں، کاتبوں اور دیگر عام حضرات کی مہریں، مہروں میں استعمال ہونے والے خطوط، مہروں کو پڑھنے کا طریقہ، بعض تاریخی نوعیت کی اہم مہریں، وغیرہ وہ ذیلی عنوانات ہیں جن پر آپ نے اس مقالے میں بنیادی اور مدلل اطلاعات فراہم کی ہیں۔

اس مقالے سے ایک مختصر اقتباس دسائی صاحب کے انداز بیان اور روشن تحقیق ونتیجہ گری کی وضاحت کے لیے پیش خدمت ہے:

''تحقیق کے کسی شعبے کی طرح مہروں کے معاملے میں بھی محنت اور جان فشانی ضروری ہے۔ ان کا پڑھنا نہایت دقّت طلب اور مشکل کام ہے۔ خاص طور پر اس لیے کہ جگہ کی بہ نسبت عبارت بڑی ہونے کی وجہ سے حروف طغرہ کی طرح آگے پیچھے اور ایک دوسرے پر لکھے جاتے ہیں۔ اس کو صحیح طور پر پڑھنے کے لیے اوّل تو زبان کی استعداد اچھی خاصہ ہونی چاہیے اس کے ساتھ ساتھ تاریخ اور تاریخ سے متعلق علوم سے بھی اچھی واقفیت ہونی چاہیے۔ سہل انگاری سے کام نہیں چلتا۔ ایک دو مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ہمارے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر فرخ جلالی صاحب نے اپنے مقالے میں عبدالرحیم خان خانان کا ذکر کرتے ہوئے اس کے والد کا نام بیرم علی لکھا ہے (تقسیم شدہ مقالہ ص ۱۱)۔ اس مہر کے عکس میں بیرم کے بعد دعائیہ کلمہ عنہما ہے نہ کہ علی.... یہ کلمہ بالکل صاف ہے اس لیے جلالی

صاحب جیسے مخطوطات کے ماہر سے یہ لہو سہل نگاری کے سوا کسی چیز سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ڈاکٹر انوار الحق صاحب نے اپنے مقالے میں خدا بخش لائبریری کی فہرست مرأۃ العلوم جلد سوم کے حوالے سے کچھ مخطوطات کی مہروں کا ذکر کرتے ہوئے تین مخطوطات پر ایک ہی شخص کے بارے میں مالک مہر کا نام ''یوسف آل محمد'' بتایا ہے۔ یہ بادی النظر میں صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر پروفیسر صاحب تصحیح قیاسی سے کام لے کر اس شخص کا صحیح نام قائم کرنے کی کوشش کرتے یا کم از کم ان مہروں کو غور سے دیکھنے کی فرصت نکالتے تو اس بہ ظاہر صحیح ذاتی عبارت کو صحیح پڑھنے میں زیادہ وقت نہ لگتا اور وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ عبارت ''بندۂ آلِ محمد یوسف'' ہے اور مالک مہر کے محمد یوسف نام کا سجع ہے۔ غرض ان معاملات میں احتیاط برتنے کی اشد ضرورت ہے''

ڈاکٹر دسائی صاحب مرحوم کے بارے میں راقم اپنا یہ مختصر مضمون ایک واقعہ بیان کرنے پر ختم کرنا چاہتا ہے۔ یہ بلا تشبیہ ہے۔

غلام رسول مہر صاحب نے اپنی کتاب ''غالب'' کی تقریب میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''آج سے بیس سال بیشتر، ایک مجلس عزا میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ جناب امام اور ان کے رفقائے عالی تمام کے مناقب بیان کیے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک گوشے سے کوئی خوش عقیدہ مسلمان پکار اٹھا ''یلیتنی کنت معھم معا'' خیال آیا نفس بشری کا یہ لازمی خاصہ ہے، بڑے آدمیوں کے محاسن اور ان کے کارناموں کا حال سن کر بے اختیار تمنا پیدا ہوتی ہے: کاش ہم اُن کے زمانے میں ہوتے۔

انسان دوسرے انسان کے کارناموں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے، مرعوب و متاثر ہوتا ہے، لیکن چوں کہ انسان ہے، اس لیے ''حسِ انسانی'' چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے کہ وہ بڑا آدمی کہاں رہتا تھا، کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا، اس کے عام مشاغل کیا تھے، طبیعت کی کیفیت کیا تھی، زندگی کے واقعات سے کیوں کر متاثر ہوتا تھا، کیا کھاتا تھا، کیا

پیتا تھا، کیا پہنتا تھا، اس کی شکل صورت کیسی تھی، قد وقامت کا کیا حال تھا۔''

یہاں موجود ہم لوگ ان خوش قسمتوں میں شامل ہیں جنہوں نے ڈاکٹر ضیاء الدین دسائی صاحب کو دیکھا تھا۔ اور جب بھی ان کے محاسن اور علمی کارنامے بیان کیے جائیں گے اور ہم خوش ہوں گے، فخر سے سر اونچا کریں گے تو حسرت سے یہ نہیں کہیں گے: کاش ہم اُن کے زمانے میں ہوتے۔

۲۸

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم

-ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن
(ناگپور)

صبح تک یہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی سے میرا تعارف استاد محترم ڈاکٹر سید عبد الرحیم صاحب نے کرایا۔ پہلی نظر کی محبت تو مشہور ہے اسی کے مصداق پہلی ہی ملاقات میں، میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔ ان کا انداز گفتگو جس میں بے تکلفی اور بے ساختہ پن تھا مجھے بہت اچھا لگا۔ ان سے ملنے کے مواقع میں نکالتا رہا۔ اکثر ڈاکٹر رحیم کے ساتھ جاتا وہ لوگ باتیں کرتے اور میں محظوظ ہوتا۔ رفتہ رفتہ ان سے تعلقات بڑھنے لگے۔ وہ اپنے چھوٹے موٹے کام بھی مجھے بتاتے۔ اور تعلیم کے تعلق سے بھی مشہورے دیتے۔ سفر میں ساتھ رکھتے۔ اکثر برابر کے اسفار میں میں ان کے ساتھ رہا۔ ادبی جلسوں اور سمیناروں میں مقالے پڑھنے کی ترغیب دیتے اور بڑی ہمت افزائی فرماتے تھے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد انھیں احمد آباد آنا پڑا۔ لیکن ناگپور سے انھیں ایسا قلبی تعلق تھا کہ اگر حالات سازگار ہوتے تو شاید وہ ناگپور ہی میں بس جاتے۔ پھر بھی ناگپور میں چند احباب سے ان کا گہرا تعلق تھا اس لئے احمد آباد سے ان کے ساتھ مراسلت اور خط وکتابت جاری رہتی۔ آخر دم تک ان کے خطوط احباب کے پاس آتے رہے جب وہ خط لکھنے کے قابل نہ رہے تب پروفیسر عباسی سے خط لکھواتے۔ ان کے خطوط کتابوں، مخطوطوں

کے متعلق ہوتے ان میں اور کوئی بات نہ ہوتی الا یہ کہ مزاج پرسی کا ایک آدھ جملہ ہوجاتا۔ ڈاکٹر صاحب دوسروں کے آئے ہوئے خطوط کے جوابات اور ان میں دریافت کی گئی معلومات مہیا کر کے ان کو اطمینان بخش جواب بھی دیتے۔ احباب کی طرف جواب نہ آنے پر بہت رنجیدہ اور ان کے شاکی ہوتے۔

ڈاکٹر دیسائی بہت مخلص انسان تھے، دوست نواز محبّی اور مشفق تھے۔ وہ بہت دیانت دار محنتی اور ایماندار شخصیت کے مالک تھے، پاس نفس، پارکبازی، بے خوفی اور حق گوئی ان کے کردار کا حصہ تھے۔ اسی کے ساتھ خدا کا خوف، بے نفسی ان کی شخصیت کے صفاتی اور کمالاتی جوہر تھے۔ دراصل وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔

وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر جانتے تھے اسی لئے کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دینا چاہتے تھے، دوسروں سے بھی وہ یہی توقع رکھتے تھے۔

مجھے خواجہ محمد دہدار فانؔی کے متعلق تحقیقی کام کرنا تھا۔ یہاں احمد آباد میں حضرت پیر محمد شاہ لائبریری میں فانؔی کے چند مخطوطات ہیں، ڈاکٹر صاحب نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی، کرایہ بھی آنے جانے کا خود ہی دیا۔ مجھے اپنا مہمان رکھا، لائبریری میں اپنے ساتھ لائے وہاں وہ اپنے احباب اور لائبریری کے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے لگے میں بھی ان کی گفتگو سنتا رہا۔ دس منٹ تک وہ برداشت کر گئے۔ آخر مجھے مخاطب کر کے کہا آپ جس کام سے آئے ہیں پہلے وہ کیجئے۔ گفتگو بعد میں سنتے رہئے۔

ان کے نزدیک کام کا انعام واعزاز صرف کام تھا۔ صلہ وستائش اضافی چیزیں تھیں۔ مقیم ہوں یا مسافر جو کام آپ کو کرنا ہے وہ بہر حال کرنا ہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب جب کبھی ناگپور آتے پہلے اپنے دوستوں کو فون سے اطلاع دیدیتے۔ اور پھر دن بھر محکمۂ آثار قدیمہ کی لائبریری میں جا بیٹھتے۔ کام ختم ہونے تک کسی سے ملنا پسند نہ کرتے کسی کی دعوت بھی اس دوران قبول نہ کرتے مطالعہ ہی ان کی روح کی غذا تھی۔ ان کے شوق مطالعہ کا ایک واقعہ پروفیسر رحیم صاحب نے لکھا ہے کہ" ایک بار ڈاکٹر صاحب پاکستان گئے وہاں کے ایک متبحر عالم پیر حسام الدین راشدی سے ملاقات کی اور کچھ

وقت ان کی صحبت میں گزارا۔ پاکستان سے راشدی صاحب نے مالک رام کو اپنی اس ملاقات کا حال لکھا اور ڈاکٹر دیسائی کے متعلق کہا کہ ایک عرصہ کے بعد ایک فنافی العلم شخص سے ملاقات ہوئی۔"

محنت اور کام کی لگن ڈاکٹر صاحب کے کردار کا ایک اہم وصف تھا دوسروں میں بھی وہ یہی خوبیاں دیکھنا چاہتے اور جب وہ یہ دیکھتے یہ آدمی اس کام کا ذمہ دار ہے اور نہیں کر رہا ہے۔ تو پھر وہ اسے ناپسند کرنے لگتے اور سختی کے ساتھ اسے ٹوکے بغیر ان سے رہا نہیں جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ناگپور تشریف لائے۔ آثار قدیمہ کے ایک نوجوان شخص جو دیسائی کے ساتھ چند دن اسی آفس میں گزار چکے تھے ان سے ملنے آئے۔ دیسائی صاحب نے پوچھا آج کل کیا کر رہے ہو۔ کچھ توقف کے بعد انھوں نے ایک موضوع بتادیا۔ دیسائی صاحب نے پھر دریافت کیا اس موضوع پر کون کون سی کتابیں دیکھی ہیں۔ وہ خاموش رہے اور جواب دیا کہ اس پر مواد نہیں مل رہا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ دیسائی صاحب کے تیور بدل گئے اور انھوں نے پانچ، چھ کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام گنوادیئے اور ہر بار کہتے رہے اور ان کا غصہ چڑھتا رہا کہ یہ دیکھا ہے اس کی کتاب دیکھی ہے۔ یہ کیا۔ یہ کیا۔ یہ دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھے ان کا غصہ برداشت کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب کو پورے ملک میں کتبہ خوانی اور کتبہ شناسی میں خصوصیت حاصل تھی۔ پتھروں کی تحریریں پڑھ کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا اور پھر انھیں تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دینا آپ کی مساعیٔ جمیلہ کا ایک روشن حصہ ہے۔ عربی فارسی اور اردو کتبوں کو پڑھنے میں موصوف نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اس کام میں کسی کو کوئی مشکل پیش آتی تو وہ ڈاکٹر صاحب سے ہی رجوع ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ۱۹۵۱ء سے محکمہ کتبہ شناسی کے مؤقر مجلّہ Epigraphic Indica Persian and Arabic Supplement کے آخر تک ایڈیٹر رہے اس جریدہ میں زیادہ تر آپ ہی کے مضامین شائع ہوتے۔ ان مضامین کی تعداد سو سے زیادہ ہوگی۔ اس

کے علاوہ کتبات کے موضوع پر آپ کی کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فن تعمیر اور آثار قدیمہ کے باب میں بھی بڑی فن شناس نگاہ پائی تھی۔ خصوصاً مغل فن تعمیر پر آپ کی گہری نظر تھی۔ اس موضوع پر بھی آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

Mosques of India کا اردو ترجمہ ''ہندوستان کی مسجدیں'' شائع ہو چکا ہے۔

سکہ شناسی میں بھی ڈاکٹر صاحب عمیق اور گہری نظر رکھتے تھے۔ سکوں کی تحریریں پڑھ کر ان کی تاریخ اور اہمیت اور ماہیت پر آپ نے کئی مضامین تحریر کئے۔ ''ہندوستان کے عہد اسلامی کے سکے'' اس عنوان سے آپ کا مقالہ شائع ہو چکا ہے اور اس موضوع پر انگریزی میں بھی آپ کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

ڈاکٹر صاحب فن خطاطی کے بھی رمز شناس تھے، اس موضوع پر آپ کے کئی مضامین اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فارسی اور انگریزی کتب کے تراجم بھی کئے۔ ذخیرۃ الخوانین کا دو جلدوں میں ترجمہ کیا۔ عبد المجید لاہوری کا شاہجہاں نامہ کا ترجمہ کیا۔ اور اے گھوش کی انگریزی کتاب India Archology کا ترجمہ ''اثار قدیمہ ہند'' کے نام سے کیا۔

دیسائی صاحب نے کتب خانوں کے مخطوطات کی فہرست تیار کروانے کے سلسلہ میں بھی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس خود بھی مختلف کتب خانوں کی فہرست موجود ہے راقم السطور نے گذشتہ سیمینار ۲۰۰۱ء کے مقالے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی خود کی تیار کردہ فہرست اور ان کی بیاض سے استفادہ کیا تھا۔

درگاہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اور ریسرچ سینٹر احمد آباد کے عربی، فارسی اور اردو کے مخطوطات کی فہرست آپ ہی کی سرپرستی اور نگرانی میں شائع ہوتی رہی جس کی ساتویں جلد کا افتتاح اور کتابوں کے ساتھ سیمینار کا پہلے دن ہو چکا ہے۔

انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے زیر اہتمام شائع شدہ ''تقویم ہجری عیسوی'' کی

تالیفات میں بھی آپ نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ چنانچہ مرتبین ابوالنصر خالدی اور مولوی محمود خاں کے نام کے ساتھ آپ کا نام بھی شامل ہے۔

آپ نے کئی تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی تحریر کئے اور ہندوستان کے مراکز دینیہ کی تاریخ بھی مرتب کی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو کئی انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ جب آپ طالب علم تھے اس وقت بھی انھیں گورنمنٹ اسکالرشپ ملتی رہی۔ اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی سے فارسی میں بی۔اے۔آنرس کی ڈگری حاصل کی اس امتحان میں بمبئی یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر آر۔ایچ مودی پرائز دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں آپ نے فارسی میں ایم۔اے کیا اور چانسلر میڈل اور جعفر قاسم میڈل حاصل کیا۔

ملازمت کے دوران اپی گرافیکل سوسائٹی نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۲ء میں آپ کو ایک سند "تامر پتر" سے نوازا جو ایک بڑا اعزاز ہے۔ صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے ۱۹۸۳ء میں پریسیڈنٹ ایوارڈ آپ کو تفویض کیا گیا۔ فارسی زبان وادب کی خدمت کے لئے ۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر ایل۔پی ٹیسیٹوری گولڈ میڈل دیا۔ ۱۹۹۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے سرجدوناتھ سرکار میڈل سے نوازا۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے پہلے تقرر گورنمنٹ کالج احمد آباد، اس کے بعد اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی اور گورنمنٹ کالج راجکوٹ میں ہوا۔ جہاں ۱۹۵۲ء تک آپ فارسی کے لیکچرر رہے اس کے بعد آپ نے محکمۂ آثار قدیمہ ہند کتبہ شناسی شعبۂ عربی وفارسی میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۶۱ء میں آپ سپرنٹنڈنٹ اور ۱۹۷۷ء میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز کئے گئے اور تیس سال محکمۂ آثار قدیمہ میں ملازمت کے بعد ۱۹۸۳ء میں آپ وظیفہ یاب ہوئے اور احمد آباد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

دوران ملازمت حکومت کی جانب سے ایران بھیجے گئے۔ جہاں آپ نے ایک سال قیام کیا اور فیضی کی نل ودمن پر تحقیقی مالہ پیش کر کے تہران یونیورسٹی سے فارسی میں

ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ دیسائی صاحب حکومت کی طرف سے روس، شام، عراق، افغانستان، بنگلہ دیش، پاکستان اور دیگر ممالک میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں نمائندگی کرتے رہے۔ آپ کو حج بیت اللہ کا شرف بھی حاصل ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کو کثرت مطالعہ نے کم آمیز بنادیا تھا جو ان لوگوں سے گفتگو کرنا پسند کرتے تھے انہیں سے گفتگو کرتے۔ غیر علمی لوگوں سے دور ہی دور رہتے گویا صحبت ناجنس سے گریز ہی ان کے کردار میں شامل تھا۔

مراسلت اور خطوط نگاری ڈاکٹر صاحب کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا ان کے خطوط کی زبان بہت سادہ اور بے تکلف ہوا کرتی تھی۔ اور اسلوب تحریر بناوٹ اور تصنع سے دور تھا۔ ان کا خط پختہ تھا اس میں آخر تک تبدیلی نہیں آئی خط شکستہ مین لکھتے لیکن اسے پڑھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ جو بات ان کو کہنی ہوتی اسے من وعن بیان کر دیتے ان کے خطوط کو پڑھنے پر یہ احساس ہوتا کہ دیسائی صاحب بذات خود بات کر رہے ہوں اور ہم سن رہے ہوں۔

علمی اور تحقیقی کاموں کے انہماک نے انھیں بالکلیہ یکسو کر رکھا تھا۔ ان کے مزاج کو ایک مشن بنادیا تھا۔ ان کا دماغ ہمیشہ جاگتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود ناگپور میں چند دوست ایسے تھے جن سے وہ بے تکلف گفتگو کرتے ان کے ساتھ ہنستے مسکراتے اور بہت شگفتہ مزاج نظر آتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ عالی ظرفی تھی کہ انھوں نے اپنے رفقائے کار کو کبھی نظر انداز نہی کیا۔ ان لوگوں کو بھی خط لکھتے۔ یا دوسرے خطوط میں ان کو یاد کرتے اور ان کو سلام لکھتے۔

انتقال سے چند دن قبل جبکہ حالت زیادہ خراب ہوچکی نقاہت بڑھ گئی تب بھی خط وکتابت جاری رہی۔ پروفیسر عباسی سے خط لکھواتے۔

ایک واقعہ بیان کرتا ہوں اور اسی پر اپنے مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔ جس زمانہ میں دیسائی صاحب کی بیماری بڑھ چکی تھی اسی دوران مجھے حج کے لئے سفر کرنا تھا۔ میں نے بڑی

ہمت کر کے دیسائی صاحب کو اس کی اطلاع دیدی۔ انھوں نے فوراً اس کا جواب بھی دے دیا۔ ادھر حج سے واپسی ہوئی چند ہی دنوں بعد فون کے ذریعہ ان کے انتقال کی خبر ملی اس کے دو تین دن کے بعد دیسائی صاحب کا خط بقلم عباسی صاحب خاکسار کو ملا۔ اس میں ان کی بیماری کا ذکر پھر چند ہدایتیں لکھی تھیں اور آخری جملہ خط کا یہ لکھا تھا کہ دیسائی صاحب نے کہا کہ غیاث الرحمٰن کو میری طرف سے مبارک باد کہہ دینا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی

شیرانی دبستان تحقیق کا ماہ درخشاں

-ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی
(لاہور)

احمد آباد سے ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی صاحب کا خیریت نامہ ملے چھ ماہ اوپر ہوگئے تھے۔ جب گجرات میں مسلم کش فسادات شروع ہوئے تو یہ جاں کاہ خبریں پڑھ کر بار باران کا خیال آتا تھا لیکن رابطے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ معارف (اعظم گڑھ) کا ماہ مئی ۲۰۰۲ء کا شمارہ کراچی پہنچا تو اس میں بذیل وفیات، دیسائی صاحب پر ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا سوا تین صفحات پر مبنی مضمون شامل تھا۔ عزیزی محمد راشد شیخ نے اسے بڑھ کر اپنے ۱۳ جون کے مکتوب میں مجھے اس سانحے سے مطلع کیا۔ یوں تو وہ ایک عرصے سے علیل اور صاحب فراش تھے لیکن قلم فرسائی کا کام برابر جاری تھا۔ ان کے علمی تبحر، تحقیقی خدمات اور تحریری منصوبوں کے پیش نظر دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کو سلامت باکرامت رکھے۔ تاہم قدرت کے اپنے قوانین ہوتے ہیں جن کے آگے انسان بے بس ہوکر رہ جاتا ہے:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ   گر بمیریم عذر ما بپذیر

ڈاکٹر دیسائی مرحوم کی رحلت کا صدمہ کئی اعتبار سے اندوہناک ہے۔ ایک تو میرے لیے یہ ذاتی محرومی کا باعث ہے کہ ان جیسے بے لوث محبت اور شفقت کرنے والے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ دوسرے ہند اسلامی تاریخ وتہذیب پر اس جاں فشانی سے کام کرنے

والا شخص دور دور تک نظر نہیں آتا اور کام بھی کیسا؟ انتہائی معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت وسیع اور ہمہ گیر۔ اس تخصص پرستی کے دور میں ان کے علمی دائرہ ہائے کار کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے منتصف دوم میں کم از کم ہند و پاکستان کی حد تک ایسا کثیر الجہت اور اتنا وافر تحریری کام انجام دینے والا فاضل ڈھونڈے نہیں ملتا۔ ایک سانحہ یہ ہے کہ پاکستان کے علمی حلقوں میں ایک بڑی اکثریت تو شاید مرحوم کے نام سے بھی واقف نہ ہوگی اور یہاں جو لوگ ان کے کام اور اس کی اہمیت سے بتمام وکمال آشنا ہیں ان کی تعداد یقیناً ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

پھر ان کی وفات جن دردناک حالات میں ہوئی اس کے تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انھوں نے ۲۴ مارچ ۲۰۰۲ء (مطابق ۹ رمحرم الحرام ۱۴۲۳ھ) کو داعی اجل کو لبیک کہا اور اسی روز عصر کے وقت انھیں جوہاپورہ کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ بقول ''معارف'':

''وہ کئی ماہ سے علیل اور احمد آباد کے ایک ہسپتال میں داخل تھے۔ ان کی وفات کی اطلاع اس لیے تاخیر سے ملی کہ ان دنوں احمد آباد بلکہ گجرات میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی جس میں ہزاروں انسان زندہ جلادیے گئے اور لاکھوں بے خانماں اور برباد ہوکر اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوکر رہ گئے۔ خود دیسائی مرحوم کے صاحب زادے کی دواؤں کی دکان بھی شرپسندوں نے جلادی تھی۔ چنانچہ اس ہول ناک قتل عام کی وجہ سے اور خبریں دب گئیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی کے حادثۂ انتقال کی خبر بھی نہ لگ سکی اور وہ کرفیو کے دوران سپرد خاک کردیے گئے''۔

مرتے ہیں میر سب پہ نہ اس بے کسی کے ساتھ میت پہ تیری کوئی نہ رویا پکار کے

سنہ ۶۱۷ھ کے اوائل میں جب چنگیز خان نے بخارا کو فتح کیا تو تاتاری گھڑ سواروں نے جامع مسجد میں داخل ہوکر وہاں پناہ لینے والے مرد وزن واطفال کا قتل عام

شروع کر دیا۔ یہ نظارہ دیکھ کر امام فقیہہ مولانا رکن الدین مسعود نے بے قراری کے عالم میں مقدم و مقتدای سادات ماوراء النہر امام جلال الدین علی بن ابی الحسن الرندی سے مخاطب ہو کر پوچھا: ''ایں چہ حالتست؟'' جواب ملا: ''خاموش باش! باد بے نیازی خداوند است کہ می وزد، سامان سخن گفتن نیست''۔

میں نے دیسائی صاحب کا نام سب سے پہلے ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی مرحوم کے مضامین کے حواشی میں دیکھا تھا۔ چغتائی صاحب اپنے مختصر حواشی میں ان کا ذکر محض ڈاکٹر دیسائی صاحب کے الفاظ سے کرتے تھے اور ان کی کسی تالیف یا مضمون کا حوالہ مطلق نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ میں ایک عرصے تک دیسائی صاحب کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ وہ آل انڈیا آرکیالوجیکل سروے میں کسی اہم عہدے پر متمکن ہیں اور انھوں نے طہران سے فارسی میں ڈاکٹریٹ کیا ہوا ہے۔ سچ پوچھیے تو میں انھیں بھی محکمہ آثار قدیمہ کا ایک روایتی افسر سمجھتا تھا۔ ۱۹۸۰ء میں جب حافظ محمود شیرانی کی صد سالہ تقریبات ولادت کے انعقاد کی تیاریاں شروع ہوئیں تو اس موقع پر پڑھے جانے کے لیے پاک و ہند کے اہل علم حضرات سے حصول مضامین کی غرض سے رابطہ کیا گیا۔ علی گڑھ سے محبی پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے ۲۰/اگست ۱۹۸۰ء کے خط میں مجھے لکھا:

''معلوم نہ ہو سکا کہ آپ نے مقالے کے لیے شیرانی صاحب کے شاگرد پروفیسر ذار لی کے عزیز ترین شاگرد و ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی کو، جو محکمہ آثار قدیمہ کے بڑے عہدے پر ہیں، لکھا یا نہیں۔ ان کا پتہ درج ذیل ہے۔ اگر نہ لکھا ہو تو اب بھی لکھیں۔ ویسے میں نے اپنی طرف سے مقالہ لکھنے کی فرمائش کر دی ہے، گو ان کی صحت خراب ہے۔ وہ موٹر کے ایک حادثے سے دوچار ہو گئے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بڑا فضل کیا''۔

پتہ ناگ پور کی سرکاری قیام گاہ کا تھا۔ چنانچہ میں نے انھیں مقالہ لکھنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں انھوں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۸۰ء کو مجھے لکھا:

''میں اس تقریب میں اپنے آپ کو کسی نہ کسی صورت میں شامل کرنا فخر کی بات سمجھتا ہوں، گو (محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے حسن ظن کے باوجود) اس کا اہل نہیں۔

حافظ صاحب سے ذاتی طور پر نیاز کا شرف حاصل نہیں رہا لیکن اپنے آپ کو ان کے شاگرد کا شاگرد کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔ ان کے عزیز شاگرد پروفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب مرحوم سے، جو میرے استاد تھے، حافظ صاحب کی فوق العادت علمی استعداد کا چرچا سنتا ہی رہتا تھا اور بعد میں خود حافظ صاحب کی کتابیں اور مقالے پڑھ کر اسے اس سے بھی زیادہ پایا۔ میرے نزدیک ہندوستان میں فارسی زبان وادب کا عالم، اس پائے کا آج تک پیدا نہیں ہوا''۔

مقالہ لکھنے کی بابت ان کا کہنا تھا:

''بہر حال عرض یہ کرنا تھا کہ میں ضرور اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی دلی خواہش رکھتا تھا اور رکھتا ہوں، لیکن ابھی میرے جسمانی قویٰ معمول پر نہیں ہیں۔ دوسرے ایک اور کمزوری یہ ہے کہ میں انگریزی میں لکھنے کا عادی ہوں اور (یہ ندامت کی بات ہے کہ) اردو حتیٰ کہ میری مادری زبان گجراتی میں لکھنے کے مقابلے میں، عادت کی وجہ سے انگریزی میں لکھنا میرے لیے زیادہ آسان ہے۔ کیا اس جشن میں انگریزی میں لکھے ہوئے مقالوں کی گنجائش ہے؟''

میری درخواست پر ان کا ارادہ شیرانی صاحب کی ''تنقید پرتھی راج راسا'' پر توسیعی مضمون تیار کرنے کا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''پیر کا فریکچر ہو جانے کی وجہ سے کچھ دن پہلے تک فراش تھا اور کہنا مشکل تھا کہ کب تک نقل وحرکت چہ جائے کہ نوشت وخواند کے قابل ہو پاؤں گا۔ نیز ایسا وعدہ بھی کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے عہدہ برآ نہ ہوسکوں ورنہ حسب ارشاد کتب خانے سے پرتھی راج راسا منگوا کے رکھی تھی۔''

ان کے اسی پہلے خط سے مجھے یہ اطلاع بھی ملی کہ وہ پروفیسر ڈار مرحوم کے داماد بھی ہیں اور یہ شادی ڈار صاحب کی وفات کے کئی سال بعد ہوئی تھی۔

مقالہ تو وہ نہ لکھ پائے لیکن اس تقریب کی وساطت سے ہمارے درمیان خط کتابت کا مستقل سلسلہ شروع ہوگیا جو کم وبیش اکیس برس تک جاری رہا۔ افسوس کہ ان کے سارے خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔ ان کی وفات کی اطلاع پا کر جب میں نے ان کی یادیں تازہ

کرنے کے لیے یہ خط تلاش کیے تو سردست سترہ مکاتیب دستیاب ہوسکے جو اس وقت میرے سامنے ہیں۔ ان خطوں کو پڑھ کر مرحوم کی دینی حمیت، اخلاقی عظمت، علمی جستجو، کتاب دوستی اور استاد پرستی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی زبان بھی معیاری اور بے عیب ہے جیسا کہ ان کے بعض اقتباسات سے اندازہ ہوگا اور کہنا پڑتا ہے کہ اپنے نتائج فکر اردو میں پیش کرنے سے گریز دراصل ان کے انکسار کا شاخسانہ تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان کا ماحول، وہاں کی حکومت کی پالیسی کے باعث ایک اعلیٰ سرکاری ملازم کی اردو میں تصنیف وتالیف کے حق میں سازگار نہیں تھا اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کہ انھوں نے انگریزی کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا جس کی بدولت انھیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔

میری ان سے دو مختصر ملاقاتیں بھی ہوئیں ایک لاہور میں اور دوسری دہلی میں اور سچی بات یہ ہے کہ ان کے خطوط سے میں نے ان کی شخصیت کا جو معیار قائم کیا تھا وہ اس پر بدرجہ احسن پورے اترے۔ وہ مجھ سے عمر، علم، عہدہ اور عمدہ اخلاق غرض ہر اعتبار سے بڑے تھے۔ مجھے ان سے دوستی کا دعویٰ بھی نہیں۔ میری حیثیت ان کی متنوع خوبیوں کے باعث محض ایک عقیدت مند کی سی ہے۔ اوران سطور کی تحریر کا مقصد بھی اپنے جذبات کا اظہار ہی ہے۔ البتہ اس مضمون کے ذریعے پاکستان کے علمی حلقوں سے ایک بڑی شخصیت کا تعارف ہوسکے گا اور طالبان علم کے لیے ایک مثال فراہم ہوسکے گی۔

ضیاء الدین دیسائی صاحب ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور دینی فرائض کے معاملے میں کسی غفلت کے روادار نہ تھے۔[2] اپنے ہر مکتوب کا آغاز وہ ''باسمہ سبحانہ'' کے الفاظ سے کرتے تھے اور مکتوب الیہ کے نام کے بعد ''سلام مسنون'' لکھنا کبھی نہ بھولتے تھے۔ وہ طرح طرح کے عوارض اور حادثات کا شکار رہے لیکن اللہ پر ان کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ ہمیشہ اس کے فضل وکرم پر اعتماد کرتے تھے۔

عالمانہ انکسار کی یہ کیفیت تھی کہ مجھ جیسے ہیچ مدان کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرتے کہ میں شرم سار ہو جاتا۔ میں نے ایک دو بار احتجاج بھی کیا لیکن وہ اپنی عادت مستمرہ پر قائم

رہے۔ اکثر خطوں کی ابتدا محترم ومکرم بندہ، مشفق ومکرم بندہ، کرم فرمائے بندہ اور مشفقی ومحبی کے القاب سے کرتے۔ اختتام کے معاملے میں مخلص یا اخلاص کیش تو خیر اظہار حقیقت تھا لیکن دعا کا طالب اور دعائے خوشنودی کا طالب، میری شرمندگی کا باعث ہوتا تھا۔ جب دہلی کے محمود شیرانی سیمینار میں عندالملاقات انھوں نے ''مضامین ڈار'' کا پرانا ایڈیشن مجھے عطا کیا تو اس پر اپنے قلم سے یہ الفاظ لکھے:

''محبی و مشفقی مظہر محمود خان صاحب شیرانی بہ تقریب حافظ محمود خان صاحب شیرانی سیمینار ملاقات پر شیرانی صاحب کے شاگرد کا شاگرد ضیاء الدین دیسائی

دہلی نو، ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء''

دراصل وہ اگلی وضع کے مطابق اپنے استاد پروفیسر ابراہیم ڈار اور ان کے استاد پروفیسر شیرانی سے بے انتہا محبت کرتے اور عقیدت رکھتے تھے۔ مجھ پر ان کی نوازشات کا اصل سبب بھی میرا حافظ صاحب سے نسبی تعلق تھا۔

میں ایک عرصے سے حافظ صاحب کے مکاتیب بغرض اشاعت جمع کر رہا تھا۔ پروفیسر ابراہیم ڈار صاحب کے نام ان کے صرف دو خط مجھے مل سکے تھے جو ''نوائے ادب'' (بمبئی) میں چھپے تھے۔ میں نے دیسائی صاحب سے اس معاملے میں اعانت کی درخواست کی۔ انھوں نے ڈار صاحب کے باقی ماندہ کاغذات کو کھنگالا، لیکن کوئی مکتوب دستیاب نہ ہو سکا۔ البتہ جب وہ مارچ ۱۹۸۱ء کی ابتدا میں پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی تقریبات میں شرکت کے لیے پشاور اور اسلام آباد آئے تو ۱۰ مارچ کو اسلام آباد ہوٹل کے لیٹر پیڈ پر مجھے خط لکھا کہ وہ مختصر وقت کے لیے لاہور آئیں گے اور پھر عازم کراچی ہوں گے۔ اسی خط کے ساتھ انھوں نے حافظ صاحب کی پروفیسر ابراہیم ڈار کے نام ایک تحریر روانہ کی جو قصائد انوری کے بعض مشکل اشعار کی تشریح پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ حافظ صاحب کا منسلک خط تو نہ ملا تاہم یہ تحریر میں نے ''مکاتیب حافظ محمود شیرانی'' میں شامل کر دی۔[۳]

لاہور میں ان کا مختصر قیام پروفیسر ڈار مرحوم کی بھتیجی مس اقبال ڈار، پرنسپل لاہور

کالج برائے خواتین کے ہاں تھا۔ میں نے مرحوم خورشید یوسفی صاحب کے ہمراہ وہاں جاکر ان سے ملاقات کی۔ ان کی شخصیت سلاست و اعتدال کا نمونہ تھی۔ قد، جثہ، رنگت ہر اعتبار سے موزوں اور معتدل۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ، کلین شیو، انگریزی لباس میں ملبوس، بہرحال تہذیب و اخلاق مجسم تھے۔ بڑی چاہت اور اپنائیت سے ملے۔ مسرت ان کے انگ انگ اور بات بات سے پھوٹ رہی تھی۔ اثنائے ملاقات میں میں نے ان سے دو چیزوں کا بطور خاص ذکر کیا۔ ایک تو سلاطین کے عہد کا ایک شکستہ کتبہ[۴] جو حافظ صاحب کو کھاٹو کے نواح میں کسی غیر آباد مسجد کے فرش پر پڑا ملا تھا اور انھوں نے تحفظ کی خاطر اسے اٹھوا کر اپنے گاؤں والی حویلی میں دفن کروا دیا تھا۔ دوسرے مہاراجہ بوندی کی ایک پرانی توڑے دار بندوق جو غیر معمولی طور پر طویل تھی۔ اس کی فولادی نال پر چاندی منڈھی ہوئی تھی، جس پر طلائی کوفت کا نہایت نفیس کام تھا۔ دستہ آبنوس کا تھا جس پر ہاتھی دانت سے بیل بوٹے کندہ کئے گئے تھے۔ جب ہم لوگ ۱۹۴۸ء میں ٹونک سے روانہ ہوئے تو بہت سا سامان ایک کمرے میں مقفل کر دیا تھا لیکن یہ بندوق بعض پرانے ہتھیاروں، یعنی زرہ بکتر، خود وخفتان اور جوشن و چار آئینہ وغیرہ کے ساتھ ایک مہربان کے ہاں امانت رکھ دی گئی تھی۔ بعد میں انھوں نے خصوصی حفاظت کی غرض سے شہر سے دور اپنی زرعی اراضی پر بنے ہوئے مکان میں اس بندوق کو ضروری احتیاطی تدابیر کے ساتھ زمین میں دبا دیا۔ دیسائی صاحب سے ان دونوں چیزوں کا تذکرہ اس لیے کیا گیا تھا کہ ان کی وساطت سے انھیں کسی پبلک ادارے یا عجائب گھر میں منتقل کیا جا سکے۔

اس ضمن میں انھوں نے ناگ پور سے ۲ راگست ۱۹۸۱ء کو خط میں مجھے لکھا:

''آپ نے وطن مالوف کے جس کتبے کا ذکر کیا ہے اس بارے میں عرض یہ ہے کہ اس سلسلے میں آپ جو چاہتے ہیں وہ ان شاء اللہ با آسانی ہو جائے گا۔ ایسی قوی امید ہے۔ وطن سے مراد آپ کی ڈھانی ہے[۵] یا ٹونک؟ پھر یہ کتبہ وہ تو نہیں جو کھاٹو کے ہی (اب مرحوم) حافظ محمد صدیق[۶] صاحب کے گھر میں رکھا گیا تھا؟ بہرحال تفصیلات سے مطلع فرمائیں۔ وہ جودھ پور میوزیم میں بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ دوسری چیز کے بارے میں بھی

کچھ نہ کچھ کارروائی کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔ یہ چیز نیشنل میوزیم وغیرہ کے لائق ہے۔ بہرحال اس بارے میں دہلی جاکر دریافت کروں گا اور آپ نے جن چیزوں کے خدشے کا اظہار کیا ہے ان کے بارے میں تبادلہ خیالات کروں گا''۔

خدشہ یہ تھا کہ یہ گراں بہا بندوق اس کے امانت دار سے برآمد ہونے کی صورت میں کہیں ان پر اسلحہ ایکٹ وغیرہ کے تحت کوئی مقدمہ نہ قائم ہو جائے اور نیکی برباد گناہ لازم والا معاملہ ہو۔ ۸

اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی ہے کہ ۲۴ راگست (۱۹۸۱ء) کو ناگپور ریڈیو اسٹیشن کے اردو پروگرام میں بسلسلہ عظیم شخصیات دیسائی صاحب کی ایک تقریر بعنوان'' حافظ محمود شیرانی'' نشر ہوگی۔ ۹

لاہور کا قیام انتہائی مختصر ہونے پر اپنے ملال کا اظہار وہ کئی خطوں میں کرتے رہے۔ انھیں یہاں کے اہل علم سے نہ مل سکنے اور بالخصوص پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں شیرانی صاحب کا ذخیرہ کتب نہ دیکھ سکنے کا افسوس تھا۔ البتہ کراچی میں وہ کچھ زیادہ وقت کے لیے ٹھہرے اور پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ پیر صاحب نے ایک پورا دن صرف کر کے دیسائی صاحب کو مکلی کا شاہی قبرستان دکھایا اور بعد میں مالک رام جی کے نام ایک خط میں ان کے بارے میں لکھا کہ ''ایک عرصے کے بعد ایک فنا فی العلم شخص سے ملاقات ہوئی''۔ ۱۰

اتفاق سے اسی سال ۱۹۸۱ء میں مجھے دہلی میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ۲۴ تا ۲۷ دسمبر منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں اپنے محکمے سے نو اُبجیکشن سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی غرض سے سکریٹریٹ پہنچا۔ تو وہاں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ آپ اپنی درخواست میں بجائے سیمینار میں شرکت کا ذکر کرنے کے محض عزیزوں سے ملنے کا مقصد ظاہر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں خطاب وعتاب کے جھمیلے سے گزرنا پڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ٹونک اور شیرانی آباد کا ویزا تو مل گیا لیکن دہلی کا ویزا نہ مل سکا۔ میں نے دہلی پہنچ کر غالب سے متعلق اپنا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کے

حوالے کیا اور ان کے روکنے کے باوجود ٹونک روانہ ہوگیا جہاں حافظ محمود شیرانی سیمینار منعقد ہو رہا تھا۔ دیسائی صاحب کمال مہربانی سے ۲۳ دسمبر کو ناگ پور سے دہلی پہنچے۔ صورت حال کا علم ہونے پر ۲۴ دسمبر کو میرے نام ایک خط لکھ کر صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات عربی وفارسی راجستھان، ٹونک کی معرفت ارسال کیا جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''میری مایوسی کا اندازہ کیجیے جب کل غالب انسٹی ٹیوٹ پہنچنے پر مکرمی ڈاکٹر نذیر احمد نے آپ کا تحفہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ آپ ٹونک تشریف لے گئے ہیں۔ خدا کرے آپ سیمینار کے لیے تشریف لائیں اور ملاقات ہو''۔

اس کے بعد اپنے آئندہ ایک ماہ کی پروگرام کی تفصیل لکھی تھی اور آخر میں یہ کہ ''آپ کا قیام کب تک رہے گا..... اگر آپ کی آمد کی تاریخوں کا پہلے پتہ ہوتا تو میں ٹونک آجاتا.....''

میں ایک ہفتہ ٹونک اور ایک ہفتہ شیرانی آباد قیام کر کے واپس چلا آیا لیکن دیسائی صاحب بعد کے کئی خطوں میں ملاقات نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ مثلاً تیسرے یا چوتھے خط میں، جو ۵/اپریل ۱۹۸۲ء کو لکھا گیا ہے، فرماتے ہیں: ''مجھے بڑا قلق ہے کہ آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔ زیادہ اس لیے کہ میں خود پہنچ سکتا تھا لیکن آپ کا پروگرام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مجبوری تھی''۔

اسی اثنا میں ادارہ تحقیقات عربی وفارسی راجستھان، ٹونک نے ''راجستھان میں تصوف'' کے عنوان سے ایک سہ روزہ سیمینار (۲۰/مارچ تا ۲۳ مارچ ۱۹۸۲ء) کا انعقاد کیا۔ اس میں دیسائی صاحب بطور خاص شریک ہوئے اور اپنا مقالہ پڑھا۔ اس موقع پر انھوں نے بڑے اشتیاق اور عقیدت سے حافظ محمود شیرانی مرحوم کے مزار پر حاضری دی۔ اسی ۵/اپریل ۱۹۸۲ء والے خط میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ زندگی کی ایک تمنا ماہ گزشتہ میں پوری ہوئی۔ اپنے استاذ کے استاذ کو دیکھنا تو قسمت میں نہ تھا لیکن یہ بھی حسرت رہ جاتی کہ وہ مقام جہاں وہ

رہے اور بالآخر آسودۂ خواب ابدی ہوئے اس کی زیارت سے بھی کہیں محرومی نہ ہو اور یہ حسرت حسرت ہی رہ جائے۔ الحمدللہ مارچ کی بائیس کی صبح، خدا جناب مولانا عمران خان[11] صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کی معیت میں اور ان کی اور شوکت صاحب کی وساطت سے مہیا کی گئی سواری پر جا کر اس تمنا کو بھی پورا کیا اور مرحوم کے مزار پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے فرائض اپنی اور اپنے استاذ کی جانب سے ادا کر کے سعادت مندی حاصل کی۔ واللہ کیا پُر فضا مقام ہے۔ مرحوم کو دنیا ان کی تحریروں سے تو غالباً ایک خشک طبیعت انسان کی صورت میں جانتی ہوگی لیکن انھوں نے اپنی بود و باش اور آخری آرام کی جگہ کے لیے جو مقام پسند فرمایا وہ واقعی ایک نہایت ہی زندہ دل اور مناظر فطرت کے شیدائی کا ہی حصہ تھا۔ دریا کے کنارے اور باغات کے درمیان وہ آسودۂ خواب ابدی ہیں اور کس مزے سے۔ طبیعت کو وہاں حاضری دے کر جو سکون و اطمینان ہوا وہ بیان سے بالا ہے۔ فرحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ''۔

دیسائی صاحب ۱۹۸۳ء میں ڈائریکٹر اپی گرافی کے عہدے سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن احمد آباد میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ احمد آباد سے باہر سرکھیج[12] جانے والی شاہراہ پر ایک نئی بستی خورشید پارک میں انھوں نے اپنا مکان بنالیا تھا۔ ان کی علمی مصروفیات پہلے سے بھی بڑھ گئی تھیں۔ ملک اور بیرون ملک کے دورے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۸۶ء میں وہ پھر ایک حادثے کے نتیجے میں پیر کے فریکچر کا شکار ہوئے۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ میں آئندہ ہندوستان آنے کے موقع پر احمد آباد کا ویزا ضرور لے کر آؤں۔ اپنے خطوں میں تقاضا کرتے رہتے تھے۔ میں ویزا کے حصول میں دقتوں کا عذر کرتا۔ اس ضمن میں ۸ ستمبر ۱۹۸۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''اسلام آباد میں مسٹر اے۔ اے۔ منشی[13] حکومت پاکستان کے اٹارنی جنرل ہیں۔ وہ ہمارے رفیق اور ابراہیم صاحب ڈار مرحوم کے شاگرد پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی کے برادر نسبتی ہیں۔ ان سے اگر اس سلسلے میں مدد کی ضرورت ہو تو ضرور ہم دونوں کا حوالہ دیں۔ بہر حال آپ کی آمد ہم لوگوں کے لیے باعث مسرت تو ہوگی ہی لیکن اپنے دادا استاد

کے پوتے کی زیارت وضیافت کر سکنے کے موقع کی یافت بھی.....''

نومبر ۱۹۸۸ء میں دیسائی صاحب کو دل کا عارضہ لاحق ہوا۔ ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا لیکن ان کی زندگی تو لکھنے پڑھنے سے عبارت تھی۔ کہاں تک اس مشورے پر عمل کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی تالیفات اور علمی مقالات کا سنہ وار جائزہ لیا جائے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ بیماری دل میں مبتلا ہونے سے لے کر اس کے ہاتھوں کام تمام ہونے تک کے عرصے میں انھوں نے کوئی دس کتابیں اور سوا اور ڈیڑھ سو کے درمیان عالمانہ مقالات تحریر کیے جن میں سے بیشتر معیاری جرائد میں شائع ہوئے۔

۱۱رفروری ۱۹۹۰ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے تین نشستوں پر مشتمل حافظ محمود شیرانی سیمینار منعقد کیا۔ اس میں ہندوستان کے متعدد اہل علم نے شرکت کی۔ میں بھی حاضر ہوا تھا۔ دیسائی صاحب اپنی علالت اور معالجین کی تنبیہ کے باوجود نہ صرف بذریعہ ہوائی جہاز تشریف لائے بلکہ ''فارسی اردو تحقیق کا مکتب شیرانی'' کے عنوان سے ایک مضمون بھی پڑھا جو پروفیسر ابراہیم ڈار مرحوم سے متعلق تھا۔ اس کے آغاز میں وہ کہتے ہیں:

''آج میں آپ کے سامنے ایک ایسے فاضل وعالم محقق کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں جسے مکتب شیرانی کا نامور ترین فرد مانا گیا ہے۔ اس ناچیز کو بھی کم از کم طفل دبستاں کی حیثیت سے ہی سہی اس عظیم مکتب سے ایک گونہ وابستگی کا شرف حاصل ہے''۔

اور مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتے ہیں:

''شیرانی اسکول کے اس عظیم رکن کے شاگردوں نے بھی فارسی درس وتدریس اور تحقیق میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ ان میں سے دو ایک تو اپنے میدان میں بین الاقوامی شہرت کے بھی مالک ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے استاد کی گرد تک نہ پہنچ سکا''۔

ان دونوں اقتباسات کے آخری فقرے دیسائی صاحب کے طبعی انکسار کے آئینہ دار ہیں۔ یہ امر واقع ہے کہ دبستان شیرانی کے تحقیقی طریق کار سے قطع نظر اس کے وابستگان

میں اخلاقی اعتبار سے تین خصوصیات نمایاں طور پر پائی جاتی ہیں۔ یعنی انکسار، نام ونمود سے گریز اور اپنے اساتذہ بلکہ ان کے اخلاف کا دلی احترام جو محبت کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس سیمینار کے موقع پر بھی دیسائی صاحب نے میرے ساتھ وہی محبت آمیز اور مشفقانہ برتاؤ کیا جس کی ان سے توقع تھی۔ اس کا ایک دلچسپ اظہار یوں ہوا کہ مجھ سے کہنے لگے ''میں آپ کے ساتھ ایک فوٹو بنوانا چاہتا ہوں''۔ میں نے عرض کیا ''یہ تو میرے لیے فخر کا باعث ہوگا''۔ بولے ''نہیں بلکہ میرے لیے''۔ باوجود علالت اور نقاہت کے وہ سیمینار کی تینوں نشستوں میں برابر شریک رہے۔ بعد میں وہ احمد آباد لوٹ گئے اور میں ٹونک روانہ ہوگیا۔ جہاں ۱۶ فروری کو شیرانی صاحب کی چالیسویں برسی کی مناسبت سے ایک تقریب تھی۔ ٹونک سے شیرانی آباد ہوتا ہوا میں واپس آ گیا۔ ابھی تھکن بھی اتارنے نہ پایا تھا کہ ان کا گرامی نامہ موصول ہوا۔ لکھا تھا:

''امید ہے آپ بخیر وعافیت وطن کی زیارت کے بعد واپس پہنچ گئے ہوں گے۔ دہلی کی ملاقات تشنہ رہی، لیکن آپ سے ملاقات کر سکا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی عنایت اور مہربانی تھی۔ کیونکہ بڑی مشکل سے ڈاکٹر سے اجازت لے کر آنے کی ہمت کی تھی۔ سیمینار یہاں کے معیار کے مطابق نہایت اچھا رہا۔ کم از کم ہماری آئندہ نسل کے فارسی دان حضرات کو حافظ صاحب موحوم کے کام اور مقام کا اندازہ تو ہوا''۔

مکتوب کے آخر میں پھر اس ملاقات کی طرف بدیں الفاظ اشارہ تھا:

''بہر حال آپ سے مختصر ہی ملاقات کر کے حافظ صاحب مرحوم کے شاگرد کے اس شاگرد کو بے انتہا خوشی ہوئی بلکہ اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ کاش میری صحت اجازت دیتی تو ٹونک حاضر ہوتا''۔

دیسائی صاحب نے منجملہ علمی خدمات کے راجستھان کے عربی وفارسی کتبات پر بھی قابل قدر کام کیا ہے۔ حافظ صاحب کو ان کتبات کے تحفظ اور ان کا ریکارڈ تیار کرنے کی بڑی فکر رہتی تھی۔ ان کی تشویق پر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے اس موضوع پر خاصا کام

کیا تھا۱۴؎ لیکن ابھی بہت کچھ کرنے کی گنجائش باقی تھی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے ''ملاقات حافظ محمود شیرانی'' (جلد اول) کے آغاز میں حافظ صاحب کے حالات زندگی کے ذیل میں لکھا تھا۔

''اس علاقے پر اسلامی تاریخی نقطہ نظر سے بہت کام کرنے کی گنجائش ہے جس میں تقسیم ملک کے باعث دشواریاں حائل ہوگئی ہیں۔''

قسام ازل نے یہ خدمت ڈاکٹر دیسائی کی قسمت میں لکھی تھی جنھوں نے اس کام کا صحیح معنی میں حق ادا کروایا۔ انھوں نے نہ صرف چغتائی صاحب اور بعض دیگر کتبہ شناسوں کے کام میں در آنے والی اغلاط کی تصحیح کی بلکہ متعدد نئے کتبات دریافت کیے۔ میری اس موضوع پر ان کے ساتھ خطوط میں گفتگو رہتی تھی اور وہ از راہ کرم مجھے اس بارے میں اپنی تالیفات اور مضامین کے آف پرنٹ روانہ کرتے رہتے تھے۔ اس ضمن میں ۲۲ جون ۱۹۹۰ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''راجستھان کے میں نے کئی کتبے شائع کیے ہیں اور دریافت بھی ہوئے ہیں۔ انگریزی میں آج سے تقریباً پندرہ سال ۱۵؎ پہلے راجستھان کے شائع شدہ فارسی عربی کتبات پر ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں کتبوں کا متن نہیں لیکن خلاصہ تھا اور اس کا اشاریہ بہت ہی مفصل اور کارآمد تھا۔ اس کی شاید میرے پاس ایک نقل (ہو)۔ میں انشاءاللہ ارسال خدمت کردوں گا۔ کچھ کتبات مع عکس متنی اور تاریخی نوٹس کے ساتھ ہمارے رسالے اپی گرافی کا انڈیکا (عربیک اینڈ پرشین سپلیمنٹ) میں بھی شائع کیے تھے۔ ان میں جن کے آف پرنٹ ہیں وہ بھیجوں گا، انشاءاللہ ورنہ زیروکس.....''۔

اسی خط میں آگے چل کر لکھا ہے:

''چغتائی صاحب مرحوم کے شائع کردہ کتبوں کے مضامین میں کافی اغلاط ہیں۔ ان میں اچھی خاصی اغلاط والوں کو میں نے دوبارہ شائع کیا ہے۔ ویسے ناگور کے خان زادوں، لاڈنوں وغیرہ کے کتبوں کو شائع کیا ہے۔ لاڈنوں کے علاقے میں مسلمانوں کی ایک برادری موبل ہے..... اس پر میرا ایک مضمون ایک کتبے کی بنیاد پر میں نے لکھا تھا.....

وہ بھی تلاش کر کے بھیجوں گا''۔

راجستھان کے کتبوں کو شائع کرنے اور ان کی وساطت سے یہاں کی تاریخ کے بعض پہلوؤں پر نئی روشنی ڈالنے کی خدمت کے اعتراف میں جے پور کی ایک تقریب میں راجستھان کے وزیر اعلیٰ نے دیسائی صاحب کو طلائی تمغا بھی عطا کیا تھا۔

کتبوں سے قطع نظر وہ اپنی دوسری علمی سرگرمیوں سے بھی مطلع فرماتے رہتے تھے مثلاً: ''شیخ احمد کھٹو مغربی کے ملفوظ مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول پر میں نے پٹنہ میں، مرقاۃ الوصول سے دستیاب چودھویں پندرھویں صدی کے راجستھان اور گجرات کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تاریخ سے متعلق مواد پر جو لیکچر دیا تھا، وہ بھی ابھی شائع ہوا ہے..... آف پرنٹ آنے پر ایک ان شاء اللہ ضرور آپ کے لیے رکھوں گا''۔

ان کی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے شائع ہونے والی بعض تالیفات میں براہ راست اپنے ذرائع سے بھی حاصل کر لیتا تھا۔

دیسائی صاحب کی وسیع علمی دلچسپیوں کی بنا پر انھیں پاکستان میں شائع ہونے والی متعدد مطبوعات یا پھر مخطوطات کی عکسی نقول کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں کراچی میں ان کے بعض قدر دان اور علم دوست حضرات مثلاً ڈاکٹر ریاض الاسلام اور مشفق خواجہ [۱۶] صاحب ان کی معاونت کرتے تھے۔ مجھے اس بات پر طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ میں بھی اس معاملے میں کسی حد تک ان کے کام آتا رہا۔ ان کا ارشاد تھا کہ: ''ادھر جب بھی میرے کام کی..... فارسی ادب، ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ، فن تعمیر، خطاطی وغیرہ پر فارسی اردو کتب طبع ہوں تو ضرور مطلع فرماتے رہیں''۔

چنانچہ میں ان کے مطلب کی تازہ چھپنے والی کتابیں یا پرانی مطبوعات نہ ملنے کی صورت میں ان کے عکس بنوا کر ارسال کر دیتا تھا۔ بعض مخطوطات کے فوٹو اسٹیٹ یا مائیکرو فلمیں درکار ہوتی تھیں یا کسی قلمی کتاب کے مخصوص صفحات کے عکس۔ مثال کے طور پر غالباً ۱۹۸۶ء کے [۱۷] ایک گرامی نامے میں یہ سطور ملتی ہیں:

''مجھے خیال سا رہ گیا ہے کہ حافظ صاحب مرحوم نے کہیں لکھا ہے کہ دیوان قاضی

محمود دریائی ۱۸ کی نقل ان کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔ اگر وہاں یونیورسٹی یا کہیں موجود ہو تو کیا اس کی زیروکس مل سکتی ہیں؟''

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ..... دیوان جلالی ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کی مرتبہ فہرست کی جلد اول کے صفحہ ۳۷۷ شمارہ ۵۳۶ پر اس کا ذکر ہے (یہ فہرست یہاں تو ہے نہیں۔ میں نے امریکہ میں دیکھی تھی) اگر اس کی بھی زیروکس مل سکے تو عنایت ہوگی۔

اسی کے صفحہ ۱۹۲، شمارہ ۲۸۸ کے تحت نسخہ ناسخہ مثنوی از عبد اللطیف عباسی کا ذکر ہے۔ اس کے ورق ۱۴ پر مہریں اور عبارت ہے۔ اس صفحے کا عکس بھی اگر مہیا ہو سکے تو کرم ہوگا۔

اسی فہرست کے صفحہ ۱۳۹، شمارہ ۲۰۴ پر لطایف الحقائق حدیقۃ الحقائق، مصنفہ سنائی کی شرح ہے۔ اس کے صفحہ ۲۰ پر ایک نوٹ ہے..... اگر اس صفحے اور اس کے ترقیمے کے عکس مل جائیں تو عنایت ہوگی۔''

ابھی میں یہ چیزیں مہیا نہ کر پایا تھا کہ ان کا اگلا مکتوب آ گیا جس میں متذکرہ بالا اشیا کی فہرست میں ڈاکٹر سید عبد اللہ والی مطبوعہ فہرست مخطوطات کے حوالے سے ایک اور فرمائش تھی یعنی:

''مثنویات بیدل..... (ایضاً، صفحہ ۳۹۰) میں ہر مثنوی کی ابتدا میں غالب کی مہر اور اس کے اپنے خط میں نوشتہ ایک شعر..... ان صفحوں کا عکس''۔

آخر میں لکھتے ہیں: ''مندرجہ بالا چیزیں آپ اپنی سہولت سے مہیا فرما کر عنایت فرمائیں۔ میں تکلیف اور زحمت آپ کو بار بار دے رہا ہوں۔ کرم ہای تو مارا کرد گستاخ والا معاملہ ہے اور خاموشی ماگشت بدآموز بتان را آپ کا مسلک۔ بہر حال برگ سبز است تحفۂ درویش کے مصداق دست بدعا اور دعا بدہن ہوں، جزاک اللہ احسن الجزاء''۔

۱۹۹۱ء کے بعد دیسائی صاحب کی صحت بتدریج گرتی گئی لیکن ان کے علمی مشاغل میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ۲۰ راگست ۱۹۹۱ء کے خط میں رقم طراز ہیں: ''میں الحمد للہ یوں تو بخیریت ہوں، لیکن زیر علاج اور پابندی خصوصی نقل وحرکت پر۔ شہر کے باہر رہتا ہوں اس

لیے شہر میں جانا کم ہوتا ہے..... احمد آباد کے باہر بغیر ہمراہی کے اجازت نہیں۔ ٹرین یا بس کا سفر تقریباً ممنوع۔ صرف دہلی جاتا آتا رہتا ہوں، تین چار ماہ میں ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے۔ ہمارے ایک امریکن دوست ۱۹ نے بادشاہ نامہ لاہوری کے انگریزی ترجمے اور تاریخ شاہجہاں پر ایک پروجیکٹ لیا ہے۔ ان سے ملنے ملانے کے لیے جاتا ہوں۔ یہ پروجیکٹ بڑا کارآمد ہوگا۔ ان شاء اللہ تمام ہونے پر تاریخی حلقوں میں کافی دلچسپی کا باعث ہوگا۔ کیونکہ اس میں ترجمے کے علاوہ نوٹس ہوں گے۔''

علاوہ ازیں وہ ''مضامین ڈار'' کے نئے اور جامع ایڈیشن کی تیاری بھی کر رہے تھے نیز ''سیرت احمدیہ'' (اردو ترجمہ مرقاۃ الوصول از مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم) اور شیخ محمود بن سعید ایرجی کی ''تحفۃ المجالس'' کے اردو ترجمے (از سید ابوظفر ندوی) کی اغلاط سے پاک نئی اشاعتوں میں بھی دلچسپی لے رہے تھے۔ ''مضامین ڈار'' کی اشاعت ثانی کا کام مکتبہ جامعہ (دہلی) کے شاہد علی خاں نے اپنے ذمے لیا تھا لیکن وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے بلکہ دیسائی صاحب کے فراہم کردہ پروفیسر ڈار مرحوم کے بعض اضافی مضامین بھی گم کر بیٹھے۔ بالآخر یہ مجموعہ اردو ساہتیہ اکادمی، گاندھی نگر (گجرات) کی طرف سے شائع کیا گیا لیکن دیسائی صاحب کے حسب منشا اضافوں سے محروم رہا جس کا ان کو بڑا قلق تھا۔ اس کا اظہار وہ اپنے خطوں میں کرتے رہے۔ ''سیرت احمدیہ'' بھی اردو ساہتیہ اکادمی نے شائع کی جس کا صحت نامہ دیسائی صاحب نے ترتیب دیا۔ ''تحفۃ المجالس'' دیسائی صاحب کی نظر ثانی کے بعد حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، احمد آباد کے اہتمام سے اشاعت پذیر ہوئی۔

۱۹۹۶ء کے وسط سے دیسائی صاحب کو ہوائی جہاز کے ذریعہ سفر بھی ترک کرنا پڑا۔ یوں دہلی کے پھیرے ختم ہوئے لیکن فارسی محاورہ ''بالاے سیاھی کہ رنگی نیست'' کے مصداق علمی جستجو کے نشے سے بڑھ کر کوئی نشہ نہیں ہوتا اور وہ تو دود چراغ کے قدیم تریا کی تھے۲۰۔ چنانچہ اپنی مصروفیات کے بارے میں ۲۰ نومبر ۱۹۹۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''اپنا یہ حال ہے کہ کچھ نہ کچھ روزانہ لکھ لیتا ہوں۔ زیادہ تر مضامین لکھتا ہوں۔ یادناموں، پیش کش ناموں وغیرہ کی فرمائش کی تعمیل میں مقالے لکھتا ہوں۔ تاریخ شاہ جہاں

کا منصوبہ ابھی اشاعتی صورت اختیار نہیں کر پایا۔ معاصر فارسی تاریخوں پر مبنی تاریخ نویسوں کے الفاظ میں ہی شاہجہاں کی پوری زندگی کے حالات انگریزی میں تیار ہو چکے ہیں، ایک امریکن دوست کے ساتھ ..... اس کے بعد..... شاہجہاں کے منصب دار، اس کے کتبے، سکے اور فرامین وغیرہ کر کے مزید دو تین جلدوں کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں''۔

اسی خط میں انھوں نے محمد راشد شیخ صاحب کا مجھ سے بدیں الفاظ تعارف کرایا:

''ایک صاحب اصل گجرات کے لیکن وہیں کے پلے اور بڑھے ہوئے محمد راشد شیخ صاحب جو کسی بڑی فرم میں کام کرتے ہیں..... ان کو خطاطی کا شوق ہے اور تذکرہ خطاطین تالیف کی ہے جو طباعت کے لیے تقریباً تیار[۲۱] ہے۔''

حسن اتفاق سے راشد صاحب سے میری ملاقات اس سے قبل ہو چکی تھی۔

کتابوں وغیرہ کی فرمائش وہ اب بھی کرتے رہتے تھے۔ اسی محولہ بالا مکتوب میں انھوں نے ذخیرہ شیرانی میں موجود گلستان سعدی کے ایک اہم مخطوطے کے سرورق اور ترقیمے کے عکس روانہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نسخے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ شاہ جہاں کے صدر الصدور، احمد آباد کے مشہور سہروردی خاندان، مخدوم جہانیان جہاں گشت کے پوتے، حضرت برہان الدین عبد اللہ قطب عالم بخاری کے صاحبزادے حضرت شاہ عالم کے سجادہ (نشین) سید جلال الدین مقصود عالم رضا کا کتابت کردہ ہے اور اسے یاقوت مستعصمی کے کتابت کردہ نسخے سے، جو جہانگیر کی ملکیت میں تھا، نقل کیا گیا تھا۔''

جب میں نے مطلوبہ عکس ان کی خدمت میں روانہ کیے تو انھوں نے ۱۴ فروری ۱۹۹۸ء کے خط میں ان کی رسید سے مطلع کرتے ہوئے اس نسخے کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالی:

''گلستان سعدی نسخۂ شیرانی کا زیروکس ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ڈاکٹر چغتائی صاحب مرحوم نے بھی اپنی پاک و ہند میں اسلامی خطاطی[۲۲] میں اس کا عکس دیا ہے۔ اس نسخے کی اہمیت کی طرف فہرست نگار ڈاکٹر بشیر حسین نے اشارہ[۲۳] ضرور کیا ہے لیکن ان کا بیان نامکمل اور تشنہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایک مختصر مقالہ لکھوں۔ قلمی نسخوں کے سفر

کی یہ بھی ایک نہایت دلچسپ اور اہم مثال ہے۔ یہ نسخہ شیرانی، جیسا کہ اس پر ثبت شدہ مہر سے پتہ چلتا ہے، احمد آباد کے قاضی خاندان کی مِلک تھا۔ قاضی محمد نظام الدین خاں، گجرات کے اپنے زمانے کے جید عالم اور استاد مولانا نور الدین صاحب محمدی صدیقی، جن کے لیے اورنگ زیب عالمگیر کے قاضی لشکر شیخ عبد الوہاب کے بیٹے یا پوتے (اس وقت ذہن میں نہیں) قاضی محمد اکرام الدین خاں نے مدرسہ ہدایت بخش سوالاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرایا تھا اور جس کے لیے ولی گجراتی نے فارسی رسالہ نور المعرفت تصنیف کیا تھا، کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری دلچسپی کی بات یہ ہے کہ درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے کتاب خانے میں گلستان کا ایک نسخہ ہے جو تیرھویں صدی کے وسط میں نسخہ شیرانی سے اس وقت کے قاضی کے ہمشیرزادے نے نقل کیا ہے اور اس میں اس کی تفصیل بھی دی ہے۔ بہر حال آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے یہ زیروکس بہم پہنچائیں۔ جزاک اللہ''۔

اپریل ۱۹۹۸ء میں انھوں نے مجھے ''سیرت احمدیہ'' اور ''تحفۃ المجالس'' کی پہلی اشاعتوں کے نسخے بذریعہ ڈاک ارسال کیے۔ میں نے ان کی رسید کا اطلاعی عریضہ لکھا لیکن وہ انھیں نہ مل سکا۔

قسمت کی خرابی دیکھیے کہ ۸ جنوری ۲۰۰۰ء کی شام عین عید الفطر (۱۴۲۰ھ) کے دن گھر کے قریب سڑک عبور کرتے ہوئے ایک تیز رفتار موٹر سائیکل نے انھیں ٹکر مار دی اور تیسری بار ان کے پاؤں کا فریکچر ہوا۔ پانچ چھ ماہ صاحب فراش رہے۔ فریکچر تو جوں توں کر کے ٹھیک ہو گیا لیکن بیماری قلب میں شدت پیدا ہو گئی۔ ذیابیطس نے جو پہلے خوراک میں احتیاط کے ذریعہ قابو میں رہتا تھا اب دواؤں کا محتاج کر دیا۔ گھر سے باہر نکلنا بھی ممکن نہ رہا۔ اپریل ۲۰۰۱ء میں دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آنے کے باعث آپریشن ہوئے جو بحمد اللہ کامیاب رہے۔ ان عوارض و شدائد کے باوجود انھوں نے انھی دنوں گلستان (مخطوطہ شیرانی) پر انگریزی مضمون مکمل کیا اور بمبئی کے موقر جریدے ''مارگ'' میں اشاعت کے لیے دیا۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے اپنے ۱۲/ اگست ۲۰۰۱ء کے خط میں ایک بار پھر یہ موضوع چھیڑا ہے:

''یہ نسخہ نہایت اہم اس لیے ہے کہ سید جلال بخاری (احمد آبادی) نے وہ نسخہ اس

نسخے سے نقل کیا ہے جسے یاقوت المستعصمی نے خود شیخ سعدی کے نسخے سے لکھا تھا اور جب وہ جہانگیر کے پاس آیا تو اس میں سے کچھ اوراق غائب تھے۔ خود جہانگیر کا اس نسخے پر جو نوٹ ہے اور جسے سید جلال نے نقل کیا ہے (اس سے) یہ پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر نے صرف اچھے سے اچھے کاتب سے نسخے کو مکمل کرایا لیکن (کذا۔ بلکہ؟) اس میں چوالیس تصویریں اپنے تصویر خانے کے مصوروں سے بنوا کر لگوائیں..... ڈاکٹر چغتائی مرحوم نے..... اس کا ذکر اور عکس شائع کیا ہے لیکن انھوں نے جہانگیر والا نوٹ نظر انداز کر دیا ہے اور بھی کچھ چیزیں چھوڑ دی ہیں۔''

اس خط میں دیسائی صاحب اپنی فطری علمی جستجو کے اظہار سے باز نہ رہ سکے چنانچہ لکھتے ہیں:

''ہاں، ڈاکٹر چغتائی نے مجھے ایک بار لکھا تھا کہ ان کے پاس ڈار صاحب مرحوم کے آئے ہوئے کئی خطوط ہیں۔ میں نے ان کو لکھا تھا کہ مجھے بھیج دیں لیکن وہ نہیں بھیج سکے۔ آپ کبھی لاہور جا کر معلوم کریں۔ اگر ہوں تو خطوط یا زیروکس کا پیاں مل جائیں تو یہاں اردو اکادمی کا رسالہ سابرنامہ نکلتا ہے اس میں شائع کراؤں۔''

اسی خط میں یہ اطلاع بھی دی گئی تھی کہ سیرت احمدیہ، تحفۃ المجالس اور مضامین ڈار کی تازہ اشاعتوں کے نسخے وہ میرے لیے لاہور کے ایک صاحب کے ہاتھ، جن کا تعلق احمد آباد کے ''ٹوپی والا'' خاندان سے تھا، روانہ کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کے درج کردہ پتے پر جا کر یہ تینوں کتابیں لے آیا۔

اس خط کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا تھا: ''خط کافی طویل ہو گیا ہے۔ دعا فرماتے رہیں۔''

بس یہ ان کا آخری خط تھا۔ میں نے کتابوں کی وصولی کی اطلاع پر مبنی خط لکھا۔ بلکہ اس کے بعد دو ایک خطوط خیریت طلبی کی غرض سے بھی لکھے لیکن صدائے برنخاست۔ تشویش یوں تھی کہ یہ رویہ ان کے معمول اور وضعداری سے بہت بعید تھا۔ یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اتنے علیل ہیں کہ لکھ نہیں سکتے:

طبیب عشق ببرد طمع ز بیمارے   کہ شب براحت ازیں درد بے دوا خفتست

بس اس کے بعد ان کی کوئی خیر خبر نہیں آئی یہاں تک کہ ''معارف'' کے ذریعے سناؤنی آ گئی:

گلی میں اس کی گیا، سو گیا، نہ بولا پھر   میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی مرحوم ۱۷رمئی ۱۹۲۵ء کو احمد آباد کے ایک مضافاتی گاؤں دھندوکا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبد الحی دیسائی تھا۔ اسی لیے وہ اپنا نام زیڈ۔اے۔دیسائی لکھا کرتے تھے۔ میں ایک عرصے تک ان کا نام ضیاء الدین احمد سمجھتا رہا۲۴ پھر خیال آیا کہ ماضی کے احاطہ بمبئی (جس میں سندھ، گجرات اور کاٹھیاواڑ کے علاقے بھی شامل تھے) کے رواج کے مطابق ''اے'' احمد کا نہیں بلکہ ان کے والد کا نام عبد الحی کا مخفف ہے۔ ان کا تعلق گجرات کے ہندوؤں کی مشہور گوت دیسائی سے تھا اور چند پشتوں پہلے ان کے بزرگ مسلمان ہو گئے تھے۔

ضیاء الدین بڑے ہونہار طالب علم تھے اور ان کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں گجرات کالج، احمد آباد (ملحقہ بمبئی یونیورسٹی) سے بی۔اے۔ کیا اور یونورسٹی میں اول آنے کے سبب رستم جی ہرمزجی مودی پرائز اور گورنمنٹ سپیشل سکالر کا اعزاز ملا۔ ۱۹۴۸ء میں ایم۔اے۔ (فارسی) میں بھی بمبئی یونیورسٹی میں اول رہے اور چانسلرز میڈل اور جعفر قاسم موسیٰ گولڈ میڈل حاصل کیے۔ ایم۔اے۔ میں انھیں پروفیسر ابراہیم ڈار جیسے نابغہ استاد کی شاگردی میسر آئی۔ آگے چل کر ۱۹۵۹ء میں انھوں نے طہران یونیورسٹی سے ''احوال و آثار فیضی بحوالہ خصوصی مثنوی نل دمن'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری حاصل کی۔

دیسائی صاحب نے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک گجرات کالج، احمد آباد، اسماعیل یوسف کالج، بمبئی اور دھرمندر کالج، راجکوٹ میں بطور لیکچرار کام کیا۔ پھر آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے محکمے میں کتبہ شناسی (عربی و فارسی) کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۱ء میں ترقی پا کر سپرنٹنڈنٹ اور بالآخر ۱۹۷۷ء میں ڈائریکٹر اپی گرافی کے

عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھیں انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ (دہلی) کے سینئر فیلو کے عہدے پر متعین کیا گیا جہاں انہوں نے نو سال تک مفید خدمات انجام دیں۔ یہاں انھوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں پائے جانے والے عربی، فارسی اور اردو کتبوں کی پانچ جلدوں میں ایک جامع فہرست کی اشاعت کا منصوبہ بنایا۔ ان جلدوں کا تعلق بالترتیب جنوبی، مغربی، شمالی، مشرقی اور وسطی ہند کے کتبوں سے تھا۔ ان میں پہلی دو جلدیں دیسائی صاحب کی حین حیات شائع ہوئیں۔ ۱۹۹۲ء سے لے کر اپنی وفات تک وہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار انڈین سنڈیز (نئی دہلی) کے تاریخ شاہجہاں پروجیکٹ کے جائنٹ چیف کولبو ریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

کہنے کو تو دیسائی صاحب کا اصل میدان کتبہ شناسی تھا لیکن انھیں متعدد شعبہ ہائے علوم وفنون میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ ان میں فارسی زبان وادب بالخصوص، ہند فارسی ادبیات، تاریخ گجرات، ہند اسلامی ہنرمندی، فن تعمیر، علم مسکوکات اور فن خطاطی کے نام سر فہرست لیے جاسکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان جیسی علمی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے اور ان کی وفات دنیائے علم وفن کا ناقابل تلافی سانحہ ہے۔ اپنی ہمہ گیری کی بنا پر وہ اپنے بیک واسطہ استاد پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے بڑی مشابہت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبزادہ شوکت علی خاں نے عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل (ٹونک) کے شمارہ نمبر ۴ (سنہ ۸۵-۱۹۸۴ء) کے تعارف میں لکھا تھا کہ ''ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی..... اس دور کے پروفیسر شیرانی ہی ہیں۔''

اگر کسی صاحب علم کو توفیق ہو اور وہ ڈاکٹر دیسائی مرحوم کے تمام مقالات کو جمع کر کے اشاعت کی غرض سے مرتب کرے تو یہ کئی ضخیم جلدوں میں سمائیں گے۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہند اسلامی تاریخ وتہذیب اور بالخصوص کتبہ شناسی پر وہ مرحوم جیسا اور جتنا کام یادگار چھوڑ گئے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ان کے محاسن اخلاق کے بارے میں سب سے اہم شہادت پروفیسر سید عبدالرحیم کی ہے جنھیں چالیس برس تک دیسائی صاحب کی شاگردی اور رفاقت کا شرف حاصل رہا۔ وہ

اپنے مضمون ''ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی'' (مطبوعہ ''معارف'' بابت جون ۲۰۰۲ء میں لکھتے ہیں:

''ایمانداری، خلوص، خوف خدا، سچائی، پاس نفس، بے نفسی، پاکبازی، غیرت اسلامی، بے خوفی، حق گوئی، محنت، لگن اور نہ جانے کتنے صفاتی اور کمالاتی جواہر ڈاکٹر صاحب کی سیرت میں تابندہ نظر آتے تھے۔ صحبت ناجنس سے گریز، عملی اور تحقیقی کاموں میں انہماک، پے در پے اسفار اور کم آمیزی نے آپ کو بالکل یک سو کر کے رکھا تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ ان کے نزدیک کام کا انعام صرف کام ہے۔ قدر دانی، صلہ و ستائش محض اضافی چیزیں ہیں''۔

آخر میں دیسائی صاحب کی رحلت پر موزوں کردہ ایک قطعہ تاریخ وفات درج کیا جاتا ہے:

لو ضیاء الدین دیسائی ہوئے واصل بحق
کیا کہوں یہ سن کے کیسا میرے دل کو ہے قلق
غفر اللہ تعالیٰ کے سوا اب کیا کہیں
فرط غم سے صاحبان علم کا سینہ ہے شق
احمد آباد آج تیرے بام و در تاریک ہیں
اب ضیائے علم و دین سے ہے تہی تیرا افق
دود دل سے دن بھی تیرا شام کی مانند ہے
جوئے خون چشم سے گلزار ہے تیری شفق
اب کہاں سے لاؤں گا ایسا محب بے ریا
اب کہاں سے پاؤں گا ایسا عزیز مستحق
''آہ'' کھینچی ''ہائے'' نکلی تب ہوا رحلت کا سنہ
''جا بیابد فی الجوار رحمت رب الفلق''

سنہ ۱۴۴۵-۲۲=۱۴۲۳ھ

حواشی

ا۔ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار مرحوم کا تعلق لاہور و امرتسر کے ایک کشمیری خاندان سے تھا۔ ۴راگست ۱۹۰۴ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے۔ میٹرک اسلامیہ ہائی اسکول، امرتسر اور بی۔اے خالصہ کالج امرتسر سے کیا۔ ۱۹۲۷ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ایم۔اے (عربی) میں کامیابی حاصل کی۔ لاہور میں مولوی محمد شفیع اور پروفیسر حافظ محمود شیرانی سے خصوصی استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۱ء تک بطور میکلوڈ ریسرچ سکالر تحقیق میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۱ء میں بطور استاد ادبیات فارسی، گجرات کالج احمد آباد میں تقرر ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں اسماعیل یوسف کالج، بمبئی تبادلہ ہوگیا۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۸ء تک پھر احمد آباد رہے اور جون ۱۹۴۸ء مین بمبئی واپس آئے۔ ۱۷رمئی ۱۹۵۳ء کو بمبئی ہی میں وفات پائی اور باندرہ اسٹیشن کے گورستان میں مدفون ہوئے۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی عبدالغنی ڈار کا شمار اہم قوم پرست رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ وہ تقسیم ملک کے بعد مشرقی پنجاب اسمبلی کے رکن رہے۔ ابراہیم صاحب کے ایک بڑے بھائی محمد یامین ڈار کا انگریز حکومت کی نظر بندی کے دوران میں ۱۲راپریل ۱۹۴۵ء کو انتقال ہوا۔ ان کی صاحبزادی مس اقبال ڈار صاحبہ لاہور کالج برائے خواتین کی پرنسپل تھیں۔

ابراہیم ڈار صاحب اپنے استاد پروفیسر شیرانی کے شیدائی تھے اور فن تحقیق میں ان کے پیروکار بھی۔ پروفیسر ظہیرالدین مدنی کا کہنا ہے کہ: ''تحقیق وتنقید کے میدان میں ڈار صاحب نے اپنے استاد حافظ محمود شیرانی کے نقش قدم پر چلنے کی کامیاب کوشش کی ہے''۔ (''مرحوم ڈار صاحب'' مشمولہ مضامین ڈار) اور ڈاکٹر سید عبداللہ جو خود بھی شیرانی صاحب کے عزیز شاگرد تھے ''مضامین ڈار'' کے پیش لفظ میں اعتراف کرتے ہیں کہ ''ابراہیم تحقیق وتنقید میں شیرانی اسکول کے ممتاز ترین فرد تھے''۔ اس کا ثبوت ڈار صاحب کے مقالات سے بخوبی فراہم ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے دیسائی صاحب نے ان پر جو مضمون لکھا تھا اس کا عنوان ''دبستان شیرانی کا ایک محقق'' تجویز کیا تھا۔ یہ اردو مضمون رسالہ ''سابرنامہ'' بابت سال ۱۹۹۰ء میں چھپا تھا۔

۲۔ ''معارف'' کے شمارہ جون ۲۰۰۲ء میں پروفیسر سید عبدالرحیم کے مضمون سے یہ انکشاف ہوا کہ دیسائی صاحب نے حج بھی کیا ہوا تھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں: ''دیسائی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے

حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی تھی۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی بیٹھ کر اور اشاروں سے نماز ادا کرتے۔"

۳۔ ملاحظہ ہو" مکاتیب حافظ محمود شیرانی" صفحہ ۳۰۲۔۲۹۸، لاہور، ۱۹۸۱ء۔

۴۔ یہ مسجد بعہد سلطان ناصر الدین محمود (۶۶۴،۶۴۴ھ) خلف سلطان شمس الدین التمش سنہ ۶۵۵ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ ان دنوں ناگور کا علاقہ مستقبل کے سلطان غیاث الدین بلبن کی جاگیر تھا۔ شکستہ ہونے کے سبب اس عربی کتبے کے کچھ الفاظ ضائع ہو چکے تھے لیکن سنہ تعمیر صاف پڑھا جاتا ہے۔ مابقی الفاظ یہ ہیں:

"ھذا عمارۃ المسجد...... بن السلطان ناصر امیر المومنین خلد اللہ ملکہ ..... العبد الضعیف ابی بکر الشامی الغرۃ من ذی الحجہ سنہ خمس وخمسین وستمایہ"

۵۔ ڈھانی شیرانیاں حال شیرانی آباد۔

۶۔ حافظ محمد صدیق بڑی کھاٹو کے ایک دردمند اور درویش منش بزرگ تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے اپنے مضمون "کھٹو..... راجستھان کی ایک قدیم بستی" (سہ ماہی "اردو" بابت جنوری ۱۹۶۸ء) یں ان کا ذکر کیا ہے۔ میری ۱۹۶۴ء میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصے بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر دیسائی نے ان کے مقبوضہ جس کتبے کا ذکر کیا ہے وہ الگ تھا اور ایک مسجد کے محراب سے تعلق رکھتا تھا۔ جو سلطان علاء الدین خلجی کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔

۷۔ بالآخر یہ کتبہ مولانا ابوالکلام آزاد عربیک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان ٹونک کے مجموعہ نوادرات میں منتقل کر دیا گیا۔

۸۔ بہرحال اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ امانت دار شریف آدمی تھے۔ ایک بار اس خیال سے کہ کہیں زمین میں دفن ہونے کے باعث یہ بندوق خراب نہ ہو جائے انہوں نے کسی آثار عتیقہ کے تاجر سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اسے بتایا گیا کہ شہر میں نہیں ہے۔ فارم والے مکان میں دفن ہے۔ وہ شاطر آدمی تھا۔ اسے اتنا اشارہ کافی ہوا۔ وہ دیہی مکان اکثر مقفل رہتا تھا۔ اس شخص نے کوئی موقع تاڑ کر بندوق نکال لی۔ پھر خدا جانے اس کا کیا حشر ہوا۔

۹۔ بعد میں یہ تقریر عربیک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ جرنل (جلد ۴، بابت ۸۵۔۱۹۸۴ء) میں شائع ہوئی۔

۱۰ ''ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی'' از پروفیسر سید عبدالرحیم مطبوعہ ''معارف'' بابت جون ۲۰۰۲ء۔

۱۱ مولانا عمران خاں، مولانا قاضی عرفان خاں مرحوم (ناظم محکمہ شرع شریف، ٹونک) کے صاحبزادے اور قاضی شہر کے منصب پر فائز تھے۔ گریجویٹ تھے لیکن عربی، علوم اسلامیہ اور فارسی کا علم بڑا ٹھوس تھا۔ ادارہ تحقیقات میں تحقیق وتدوین کا کام کرتے تھے۔ ادارے کے مخطوطات کی فہرست سازی کا کام بھی انجام دیا۔ بڑے ہمدرد اور مخلص انسان تھے۔ شیرانی صاحب کے مزار کی تعمیر کا کام بھی انھی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ ۱۹۸۶ء میں اعزہ سے ملنے پاکستان آئے ہوئے تھے کہ ۱۳ فروری کو حیدرآباد (سندھ) میں دل کے دورے سے وفات پائی اور ٹنڈو یوسف کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

۱۲ سرکھیج غالباً، سرخیز'' کی مقامی صورت ہے۔ یہ قصبہ مغربیہ سلسلے کے معروف بزرگ حضرت شیخ احمد کھٹو کے مزار مبارک کی بنا پر مشہور خلائق ہے۔

۱۳ پورا نام عبدالعزیز عبداللہ میاں منشی۔ عبداللہ میاں ان کے والد کا نام تھا۔

۱۴ اس موضوع پر چغتائی صاحب کے کاموں میں:

۱۔ کھٹو..... راجستھان کی ایک قدیم بستی

۲۔ قدیم تاریخی بستی..... بیانیہ۔

۳۔ Nagaur..... A Forgotten Kingdom اور

۴۔ Some Inscriptions from Didwana, Jalor, Ladnun and Nagaur. قابل ذکر ہیں۔

۱۵ یہ کتاب "Published Muslim Inscription of Rajasthan" اس مکتوب سے پندرہ نہیں بلکہ انیس سال پہلے سنہ ۱۹۷۱ء میں جے پور سے شائع ہوئی تھی۔

۱۶ خواجہ صاحب نے ایک بار انھیں دو مخطوطوں، جن میں ایک حضرت شاہ عالم گجراتی کے حالات پر مبنی ضخیم تالیف ''روضات شاہی'' تھی (جس کا منحصر بفرد مخطوطہ ڈاکٹر معین الحق مرحوم کے پاس تھا) کے تقریباً آٹھ سو صفحات کے فوٹو اسٹیٹ بنوا کر ارسال کیے تھے۔

۱۷ اس خط پر کوئی تاریخ درج نہیں اور ڈاک خانے کی مہریں مبہم ہیں۔

۱۸ قاضی محمود دریائی بیرپوری کے دیوان کا واحد معلومہ نسخہ درگاہ پیر محمد شاہ لائبریری احمدآباد میں تھا۔

پروفیسر ابراہیم ڈار نے شیرانی صاحب کی فرمائش پر اس کی نقل تیار کروا کر روانہ کی تھی۔ بعد میں اصل مخطوطہ ضائع ہوگیا۔ اس لیے دیسائی صاحب کو لاہور والی نقل درکار تھی۔

۱۹۔ یہ امریکن دوست تھے پروفیسر ڈاکٹر بیگلے (W.E.Begley) جو ۱۹۸۰ء کے منتصف دوم میں امریکن انسٹی ٹیوٹ برائے پاکستانی مطالعات لاہور میں ریسرچ فیلو کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ بعد میں یہ امریکن انسٹی ٹیوٹ فار انڈین سٹڈیز (دہلی) سے وابستہ ہوگئے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر دیسائی کے اشتراک سے شاہ جہاں اور اس کے عہد سے متعلق خاصا کام کیا۔

۲۰۔ دیسائی صاحب واقعی فنا فی العلم تھے۔ ان کے نزدیک زندگی اور علمی مصروفیت مترادف حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے اس شغف کے بارے میں ان کے پڑوسی پروفیسر محبوب حسین عباسی کا بیان ہے "میں دیسائی صاحب سے آخری بار ۲۱ تاریخ کی صبح یعنی وفات سے صرف تین روز قبل) ملا تو آکسیجن لگا ہوا تھا۔ پھر بھی اچھی طرح بات چیت کی۔ کچھ وقت پہلے امریکہ کے پروفیسر ڈاکٹر جان سیلر (John Seyller) کے ایک مقالے پر نوٹس لکھے تھے۔ اس کی کاپی مجھے دی اور امریکہ روانہ کرنے کے لیے کہا۔ ان کا پتہ خود انھوں نے ڈائری سے تلاش کر کے مجھے لکھوایا... " ("ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی" از پروفیسر سید عبدالرحیم، مطبوعہ "معارف" جون ۲۰۰۲ء)

۲۱۔ آرٹ پیپر پر یہ دیدہ زیب کتاب شیخ راشد صاحب نے سنہ ۱۹۹۸ء مین ادارہ علم وفن، کراچی کے زیر اہتمام شائع کی۔ اس میں عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے دور جدید کے بیس بڑے خطاطوں کا تذکرہ اور ان کی خطاطی کے نمونے شامل ہیں۔

۲۲۔ ملاحظہ ہو "پاک وہند میں اسلامی خطاطی" لاہور، ۱۹۷۶ء۔

۲۳۔ دیکھیے "فہرست مخطوطات شیرانی" (جلد دوم) صفحہ ۳۳۴، لاہور، جون ۱۹۶۹ء۔

۲۴۔ چنانچہ "مکاتیب حافظ محمود شیرانی" (صفحہ ۲۹۸، لاہور، ۱۹۸۱ء) میں میں نے ضیاء الدین احمد ہی درج کیا تھا اور میں ہی کیا بیشتر لوگ یہی سمجھتے تھے۔ مولانا صباح الدین عبد الرحمٰن نے اپنی تالیف "پیر حسام الدین راشدی اور ان کے علمی کارنامے" (صفحہ ۳۵، کراچی، ۱۹۸۴ء) مین بھی ضیاء الدین احمد لکھا ہے۔

HAZRAT PIR MOHAMMED SHAH(R.A.)
LIBRARY AND RESEARCH CENTRE, AHMEDABAD

PRICE LIST OF PUBLICATIONS

	Book Name	Price Rs.
1.	TAZKIR-E-AQDAS	100/-
2.	ISHQULLAH (URDU)	30/-
3.	ISHQULLAH (GUJARATI)	30/-
4.	NOORUSH SHUYUKH	30/-
5.	MAZHAB-O-MUKHTAR	50/-
6.	SHAH BAHAUDDIN BAJAN	70/-
7.	DIWAN-E-JALALI	110/-
8.	TOHAFATUL QARI	125/-
9.	AHWAL-E-AQDAS - MAKASHIFA (GUJARATI)	10/-
10.	HAYAT-E-QUDSIYAH (GUJARATI)	10/-
11.	YAAD-E-AYYAM	30/-
12.	DIWAN-E-ASHRAF	100/-
13.	TOHAFATUL MAJALIS	100/-
14.	A book on voluminous work of Dr. Z.A. Desai (A QUEST FOR TRUTH)	400/-

CATALOGUES OF MANUSCRIPTS

15.	VOLUME - I	175/-
16.	VOLUME - II	200/-
17.	VOLUME - III	200/-
18.	VOLUME - IV	110/-
19.	VOLUME - V	150/-
20.	VOLUME - VI	200/-
21.	VOLUME - VII	200/-
22.	INDEX OF ABOVE ALL VOLUMES	200/-
23.	VOULUME - VIII (with index)	200/-

JOURNALS

23.	JOURNAL - I	(Tasawwuf and Indian Society)	150/-
24.	JOURNAL - II	(Cultural and Literary Activities in Gujarat)	150/-
25.	JOURNAL - III	(Activities of Learning and Literature in Gujarat)	150/-
26.	JOURNAL-IV	(Gujarat's Heritage in Learning, Literature and Culture)	200/-

1st typed draft, 2nd typed draft, 3rd typed draft, per final draft and so on, everything typed in the old Italian Olivetti Jumbo manual type-writer with special diacritical marks for Arabic, Persian and Urdu type-writer with special diacritical marks for Arabic, Persian and Urdu words.

He breathed his last on 24th March, 2002 after a few days of illness. I conclude and pay tribute to this great scholar of international reputation.

Dr. Pankaj T. Desai
Principal, M.D. Samajseva Mahavidyalaya,
Prof. and Head,
Dept. of History & Culture
Gujarat Vidyapith

ogy (now institute of Archaeology) on Indo-Muslim Architecture, Numismatics, Arabic & Persian Inscriptions, Calligraphy, etc. Dr. Desai's art of writing includes footnotes, the notes or references or comments are invariably given in the same page unlike giving separately as "Note", "References" at the end.

In the area of publications, he ensured the publication of the EPIGRAPHIA INDICA: ARABIC & PERSIAN SUPPLEMENT (EIAFIS), upto the issue of 1975. The major portion of articles contained in this journal, were contributed by him. This journal had fallen in arrears during his tenure itself, due to certain technical difficulties, mainly in finding out a suitable press for printing.

He gave much importance to the Archaeological Library and it was during his time that valuable and rare books in Arabic, Persian and Urdu languages were added to the Library at Nagpur. He was the Chairman of the Library Committee existed during those days. Archaeological Library has got rare collection of books on these subjects, most of them acquired during Dr. Desai's period. He was a regular visitor to the Central Archaeological Library New Delhi, which had huge collection of books on Epigraphy and allied subjects. Those days Mr. D. K. Kapoor used to be the Librarian attached to Central Archaeological Library. I think, no books on his favorite subject, is left untouched by Dr Desai in this library and Mr. Kapoor gave full co- operation to him in this respect.

Dr. Desai was a good administrator, would come and leave the office punctually in time and expected others to follow the suit. Work was worship for him, he would expect hard, intelligent work from his subordinates and extracted work from them with firmness and kindness. He used to watch that the staff members, technical and administrative, always engaged in their work. When the sound of type-writer was not heard, he would knew that the work allotted is completed and would give more work keeping everybody engaged throughout. Before a report/article was finalised, and many as 3 drafts were made out, they were kept separately in separate folders titled,

to head the Epigraphy (Arabic & Persian) Branch. Later on, he was elevated to the post of superintendent (now superintending Epigraphist) for Arabic & Persian Inscriptions in 1961. He became Director (Epigraphy) in 1977 to head the Nagpur and Mysore Epigraphy branches of the Archaeological Survey of India. He laid down office on the afternoon of 31st May 1983 on attaining the age of superannuatio7, at 58 years, and settled at Ahmedabad (Gujarat) to lead the retired life. After retirement, Dr. Desai worked for ICHR projects under Senior Fellowship programme. He was awarded this fellowship thrice by the ICHR between 1983-1992. The projects entitled "A Topoggraphical List of Arabic, Persian and Urdu Inscriptions of South India", "Arabic, Persian and Urdu Inscriptions of Western India - A Topographical List" and "English Translation of Dhakhiratul-khawanin of Shaikh Farid Bhakkari"

Though retired, he was still active in his field of research. He had a facile pen in English, Urdu, Arabic, Persian and Gujarati, too, and contributed articles in all the above languages. His knowledge on the subject is as deep as the ocean. He dedicated his life to the cause of Perso-Arabic Epigraphy and remained an academician throughout. He remained active despite his advancing age, and unfortunate accidents, he continued to keep himself engaged in academic activities with vigor of a person, totally dedicated to his profession till death His books and other publications are widely used by the students and scholars all over the world.

He participated in more than a dozen national and international seminars/conferences/symposia, etc. and even till his last days he was being invited to participate in national international seminars, conferences, etc. But, unfortunately, bad health prevented him from going out of his house. His vision was dimmed after an eye operation, his hearing was somewhat impaired, he was shrunk a little with age, but his mind was perfectly clear, his memory retained its vast strength, his handwriting was clear and unchanged.

He delivered lectures to the students of School of Archaeol-

Dr. Ziyaud-Din A. Desai
An Epigraphist & a Scholar

Dr. Pankaj T. Desai
(Gujarat Vidhyapith, Ahmedabad)

Some people are born great, but some achieve greatness by their exceptional work. One of such great personalities was Dr. Ziyaud-Din A. Desai,

Born in Dhanduka, District Ahmedabad (Gujarat), on 17th May, 1925, Dr. Ziyaud-Din, son of Abdul Hayy Desai, received his higher education from Bombay University. he was Government Merit Scholar and Government Special Scholar at the secondary and university levels. his academic career has been frequently punctuated with a number of scholarships, awards and prizes. He had a brilliant academic career by obtaining First Class First in B.A. (Hons.), Persian (Principal) and Urdu (Subordinate) from Bombay University, Bombay in 1946. He repeated his performance in the same University and obtained his Doctorate Degree in Persian with Credit (Tahsin) from the Faculty of Arts, Tehram University, Tehran (Iran) for his thesis entitled "life and Works of Faidi with special reference to Nal-Daman (Nala-Damanyanti)". Many distinctions and titles glared him, such as Chancellors Medal, Jaffer Cassum Moosa Gold Medal, Gujarat Urdu Academy Gaurav Puraskar Dr. L. P. Tessitori Gold Medal, Sanskar Award, etc. Honours came to Dr. Desai from many quarters. He was honored with Tamra Patra by the Epigraphical Society of India in 1982 and Fakhruddin Ali Ahmed Prize for Research and Critical Studies from Ghalib Institute, New Delhi, in 1999.

Dr. Desai started his service career as Lecturer in Persian, Government College, Ahmedabad, Bombay and Rajkot between 1947- 1953. He was selected by Government of India, Archaeological Survey of India, as Assistant Superintendent for Epigraphy in 1953

Dr. Desai was a man who lived a simple life. He had very few personal needs. This enabled him to think, read and write with a sense of responsibility. This, together with his humanistic and rational outloose on human problems are a great source of inspiration for us. They are worth emulating.

Z.A. Desai had helped me in many ways. He knew that I had written a book containing a chapter on Shantidas Zavery, a famous seventeenth century jeweller of Ahmedabad. At that time I did not know Professor Desai had procured a document on the Will of Shantidas Zaveri (1656) which was originally published by M. Abdulla Chagatai, a great Pakistani scholar. Desai asked me to visit his home. And he showed me the document. But due to my ignorance, I did not know the Persian language. So I said : 'Gurn! Enlighten me'. He smiled in his peculiar style and explained the contents of the document, and even translated some of the important portions. I had a delightful breakfast and a cup of tea during this 'GURU-SHISHYA' Sojoun. In fact, our meeting turned into a mini-seminar! Dr. Ziyaud-Din Desai was not only a great scholar but also a warn friend and a lively conversationalist.

We are familar with the works of Dr.Desai and the latest Pathik issue (vols. 10-12, July-Sept.2003) contains a very good article on his academic achievments. I have, therefore, to add that besides Persian and English, he also wrote in the Gujarati language. Volume 5 : Sultane Kal and Volume 6 : Mughal Kal, published by the B.J. Institute of Learning and Research as a part of the Gujaratno Rajkiya Sankritic Itihas contain brilliant articles on the Arabic and Persian sources on the Hisory of Gujarat.

Dr. Desai like Durvasa, the ancient Hindu rushi, would sometimes lose his temper. He was not afraid to call a spade a spade. That is the reason why some people misunderstood him. But those like me who knew him closely knew that inside his heart he was pure like a crystal. There are many people who think and say someting, but act differently. There is a proverb about such hypocritical people: "મુખમે રામ, પણ બગલમાં છૂરી; ભગત તો ભલો પણ દાનત બૂરી" On the lips, the name of Rama, but under the armpit, a dagger. Z.A. Desai possessed a diametrically oppsite trait. He was straigtforward and trustworthy. I really this kind of frankness, straightforwardness and nobility of heart. He had always inspired the young generation of students, historians and scholars.

31

My Friend
Late Dr. Ziyaud-Din A. Desai

Professor Makrand Mehta
(Ahmedabad)

Dr. Z.A. Desai was a scholor of international repute. He was an epigraphist, historian and a Linguist. His knowledge of Persian, Arabic, Gujarati and English languages had enabled him to use different sources in his writings. But this is not all. During my frequent discussions with him, what really appealed me was his profound humanism. India is a multi-ethnic, multi-lingual and multi-radial society and Dr. Desai had always strived to develop the forces of composite culture which India and Gujarat need today. His writings, including his D.Litt. thesis "Life and Works of Faidi with special Reference to Nal-Daman (Nala Damayanti)" shows that he was much above the caste and the communal spirit that is around us today like a poisonous cobra. As close friends we shared the secular and rational values.

I cite two examples. I published two articles. One article was on the biography of Nizamuddin Quraisi who had translated a novel on 'Krushna Katha' from Urdu into Gujarati, in 1918. The other was on the 'Growth of the Civil Society in Gujarat with special reference to the contributors of the Muslims'. It shows how the high-caste Hindus had helped their Muslim friends in establishing the Anjuman-i-Islam in Ahmedabad in 1884. The spirit of co operation between the Muslim and the Hindu leaders was based on the rational and secular ideas, Mutual respect and trust as well as the spirit of friendships and tolerance. When Dr. Desai read these two articles, he lost no time in Congratulating me on the telephone. It is these noble values which he had Cherished most as a man and as a scholar.

Special Section

Late Dr. Ziyaud-din A. Desai

15. Sharar, Abu-al-Halim: *Tarikh-i-Sindh, Vol.* 1, Lucknow, 1907.
16. Nadvi Sayyid Abu Zafar: *Tarikh-i-Sindh*, A'zamgarh, 1970.
17. Nadvi Sayyid Abu Zafar: *Tarikh-i-Gujarat* (Gujrati version), Ahmedabad, 1949.
18. Kanpuri Munshi Muhammad *Abd-al-Razzaq: Al-Baramikah.* (Date of publication not mentioned).
19. Fariq, Khurshid Ahmad: *'Arabi Literature men Qadim Hindustan, New* Delhi, 1973.
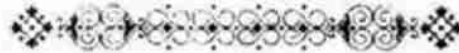
Muhammad Daudpota, Bombay, 1938, chapter 11, p. 60 and Nadvi, Abu Zafar; *Tarikh-i-Sindh, Vol-1,* A'zamgarh, 1970, pp. 282-83.

37. See Elliot, H.M. *History of India,* p. 497.
38. See *Encyclopedia of Islam, Vol.* IV, Leydon, 1934, p. 136. *39* *'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat,* p. 377.
40. It is really very difficult to trace the origin of these two tribes. The non availability of clear proofs and evidences in this behalf makes the matter still more difficult. Though nothing can be surely and finally suggested in this respect, the accounts of their customs and religious practices available so far nevertheless lead one to conclude that they were originally Hindus whether hailing from certain Rajput tribes or from local Sindhi families.
41. See footnote, p. 185.
42. See footnote, p. 113.

Bibliography

1. *Encyclopedia Britannica,* Vol. IV, 1970.
2. *Encyclopedia of Islam,* Vol. 1, Leyden, 1960.
3. Brown, E, G.; *A Literary History of Persia,* Cambridge University press, 1957.
4. Elliot, H. M.; *History of India, Vol.* 1, Allahabad.
5. Khuda Bakhsh, S.; *The Renaissance of Islam,* Delhi, 1979.
6. Jaffery, Arthur; *Foreign Vocabulary of the Qur'an,* Baroda, 1938.
7. Ahmad, Maqbul; *Indo-Arab Relations,* New Delhi, 1969.
8. Salahuddin, M.; *Indo-Arab Relatians. (*English Translation of *'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat),* Hayderabad, 1962.
9. *Al-Ma'sudi; Muruj-al-Dhahab, Vol.-1.*
10. *Al-Biruni; Kitab-al-Hind,* Heyderabad.
11. Mubarakpuri, *Qadi Abu-al-Ma'ali Athar; Al-Iqd-Al-Thamin,* Bombay, 1968.
12. Ma'sumi, Sayyid Muhammad; *Tarikh-i-Sindh,* Bombay, 1938.
13. *Farishta; Tarikh-i-Farishta,* Vol. 2, (Urdu Translation), Deoband, 1983.
14. Nadvi, Sayyid Sulayman; *'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat.,* Allahabad, 1930.

be known in India as "*Budhibala*" in which intellect and logical reasoning was more important than luck.

17. See "*Arabi Literature men Qadim Hindustan*", 1973, p. 324 and see ibid p. 321 for Vidyapati as well as ***Indo-Arab Relations**, p.* 18.
18. *Encyclopedia Britannica, Vol.* IV, 1970, p. 195.
19. Sayyid Sulayman Nadvi makes two contradictory statements in one page of his *'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat* as to the introduction of the chess into the Arab land. First, he writes that both the chess and chauser reached Arabia during the first century A.H. and then he writes that the Arabs got acquainted with the chess perhaps during the second century A.H. (the eight century A.D.). See, p. 184.
20. Also see Sharar; 'Abd-al-Halim; Tarikh-i-Sindh, Vol-1, Lucknow, 1907, pp.125, 163, 174, 178, 181, 182.
21. For details, see *Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, pp. 265-66-67
22. See *'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, p. 277.
23. The term "*Bayasirah*" with which the learned author expresses his unacquaintance is the plural form of Baysar, literally meaning "two heads" which was applied to those who were of mixed race. *Baysar* is a compound of the Gujarati word 'be' meaning two and the Persian term 'sar' (head).
24. See *'Arab-o-Hindi Ke Ta'allukat*, p. 302.
25. *Ibid*, p. 330.
26. *Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, p. 333.
27. *Muruj-al-Dhahab*, Vol-1, p. 379.
28. See'Arab-o-Hind Ke-Ta'alluqat pp.334-35-37.
29. See, Elliot, H. M.; *History of India as told by Its Own Historians*, Vol-1, Allahabad edition, pp. 442-43.
30. See foot-note, Fariq, K. A.; *'Arabi Literature men Qadim Hindustan*, 1973, p. 166.
31. *See, 'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, p. 335.
32. See, Elliot, H. M.; *History of India*, pp. 488-489.
33. *See, Encyclopedia of Islam*, Vol. IV, Leyden, 1934, p. 136.
34. See, *Indo-Arab Relations*, p. 26.
35. Quoted in *'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, p. 369.
36. Ibid, pp. 361-64-65-68. See Sayyid Muhammad Ma'sum: *Tarikh-i-Sind* popularly known as *Tarikh-i-Ma'sumi*, edited by Umar-b-

541). It was introduced into English by the crusaders through the Arabic language (Ibid. p. 541). Johnson (Todd) thinks it to be derived from old French. Barje or Barge, and low Latin Barga. (Quoted lit Elliot's *History of India. Vol.* 1, p. 539). Tooke opines that it is derived from the past participle of beorgan, to protect, to strengthen. (Ibid. pp. 539-540).

Richardson says that in is derived from the Gothic bairgan, 'to fortify', Webster, from Dutch Bargie. (Quoted in *History of India, Vol.* 1.0. 540)

8. Sayyid Sulaymin Nadvi considers the word 'Nao' as a Hindi word, but it is also Persian its root, being common in other Aryan languages like Greek and Latin. Adam Metz also believes it to be a Persian word, See Khuda Bakhsh, S : *The Renaissance of Islam*, Delhi, 1979, p. 512.
9. *'Arab-o-Hind Ke Ta'aliuqat. p.* 72. Also see Jaffery, Arthur: *The Foreign Vocabulary of the Qur'an*, Baroda, 1938, pp. 154, 246, 264.
10. See, 'Arab-o-HindKiTalalluqdt, p.92.Terming it and act of self annihilation, Maqbul Ahmad remarks : This naive act of chivalry ultimately resulted in the ousting of the Arab and Persian merchants from the caster waters. See *Indo-Arab Relations*, p. 87.
11. See Browne, E.G.; *4 Literary History of Persia*, Cambridge University Press, 1957, p. 257. Also see Kanpuri, Munshi Muhammad Abd-al-Razaaq; *al-Baramikah*, (Date of Publication not mentioned), p. 22.
12. See *Encyclopedia of Islam*, Vol-1, Leyden, 1960, p. 1033.
13. See *Arab-O-Hind Ke Ta'alluqat*, p. 120 and *Encyclopedia of Islam*, Vol. 1, 1960, p. 1033.
14. See footnote *'Arabi Literature men Qadim Hindustan*, New Delhi, 1973, p. 14.
15. *See, 'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, p. 184.
16. *Encyclopedia Britannica*, Vol. IV, 1970, p. 195. The term "*Chaturanga*" signifies the four wings of ancient Indian army (Elephant army, cavalry, chariotry and infantry). It was arabicised as "Shataranja". In ancient times it was a four-handed game played by four persons with the help of two dice. Later when the casting of dice was prohibited by the Dharmasastra, it became a double-handed game, being played only by two persons. Now it came to

Browne etc., though at some places he has given wrong titles. For example, he has written *British Encyclopedia* instead of *Encyclopedia Britannica.*[41] In another place, he has quoted a statement of Von Kremer without properly mentioning the title and date of publication of latter's work.[42] Some other sources have been quoted without page number and date of publication. If these deficiencies are removed, an index and a list of bibliography are added at the end of the book and new facts unearthed since its publication are included in footnotes, this classic work may be still more useful.

Quotes

1. *Indo-Arab Relations (*English Version), Hyderabad, 3962, Foreword.
2. For the later period, see Ahmad, Maqbul . *Indo-Arab Relations, New* Delhi, 1969, which brings the survey down to the end of the 19th Century.
3. According to the author the cause of the defeat of Dahir at the hands of the Muslims lay in Buddhists having joined hands with the Muslims against the Brahmins with whom they were engaged in a bitter struggle for supremacy.
4. Many historians such as Ibn-Jarir, Ibn Abi Hatim and Hakim believe that when Adam was expelled from heaven, he was put down in Ceylon where his supposed foot print is still visited on a bill.
5. See Nadvi, Sayyid Sulayman., *Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat*, Allahabad, 1930, p.73.
6. See Ahmad, Maqbul; *Indo-Arab Relations*, New Delhi, 1969, p.66.
7. Barija mean a boat but since the Indian sea robbers used boats to commit robbery on the high seas, Bawarij came to mean the Indian Pirates..... In Modern Arabic Berija means a fleet of ships. See, al-Biruni; *Kitab-al-Hind,* Hyderabad, p. 167 and Nadvi, Sayyid Sulayman; *Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat (*Allahabad), 1930, p. 63 and its English Version, Hyderabad 1962, p. 38.

   According to Elliot, the term 'Bawarij' is Arabic and its root must be sought in the Arabic 'Bawarij', which means a large vessel of war *(History of India, Vol.* 1, Allahabad Edition, pp. 539-

that the Sammas had probably settled down in Kutch and having come to Sind in 752 A.H. (1351 A.D.) they expelled the Sumras from Sind.[39] In support of his statement he quotes al-Baladhuri. The Sammas government came to an end with the dethronement of its last king, Jam Firoz-b-Jam Nanda by Beg Arghun of Qandhar in 927 A.H. (1521 A.D.)[40].

At last the author gives brief life sketches of Shaykh Baha-al-Uddin Zakaria and Jalal Uddin al-Bukhari. He also makes brief mention of some old cities of Sind where the Muslim Colonies were found. They were Daybul, Buqal, 'Asifan, Turan, Qannauj (other than that found in India), Nirun, Mushki, etc. This chapter ends with a very brief mention of Kashmir. At the end, the author adds an appendix in which he gives accounts of Suparah, an old city of Gujrat. Besides, he cites a Jat physician who treated 'A'ishah, God may be pleased with her.

To conclude, the book which was written with a view to removing the misunderstanding that the relations between the Arabs and the Indians date from the invasion of Mahmud al-Ghaznavi and proving that they go as back as 2000 B.C., wiping out the sense of hatred from the minds of the Hindus and Muslims against each other and 'trying to bring about mutual understanding and harmony between them, serves as a clear proof of the author's broad-mindedness. In the book there are also some frank admissions by the author of the antigonastic attitudes of some Muslim rulers towards their non Muslim subjects, which reveals the unbiased approach of the author. If this book can be of some help in restoring harmonious and amicable relations between the two communities, it would have amply served its purpose.

In his celebrated work the author has employed modern research methodology developed in Europe. Besides Persian and Arabic sources, he has also utilized English works such as *History of Antiquities* by Duncker, *Preachin cf Islamg by* Prof. Arnold (Urdu Translation), *Encyclopedia Britannica, Encyclopedia of Islam, History of India* by Eliiot. *A Literary History of Persia* by E.0

Mansura and its destruction at the hands of Mahmud al-Ghaznavi in 416 A.H. (1024/25 A.D.) and explains the reason of his attack on it. Besides, he explains how Sind first passed into the hands of Nasir Uddin Qubacha, a commander of the army of Shihab-Uddin Ghori, in 578 A.H. (1182/83) and Iltutmish and how it was conquered by Muhammad Shah Tughlaq in 752 A.H. (1350/51) and by Firoz Shah Tughlaq in 762 A.H. (1360/61 A.D.), who handed it over to the local rulers called Sumras as well as how it was finally annexed to the kingdom of Akbar in 1000 A.H. (1591/92 A.D.). He also discusses the origin of the Sumras and Sammas - rulers of Sind. Elliot[32] and other European scholars[33] opine that the Sumra's were newly converted Rajput. Maqbul Ahmad holds that they belonged to a local Sindhi Hindu tribe and were converted to Islam at the time of the first Arab conquest of Sind in 5th century A.D.[34] According to Abd-al-Halim Sharar who confused them with a tribe of jews called Samiri, they were converted jews.[35] Sayyid Sulayman Nadvi is of the view that the Sumras were the descendants of Sumar, an influential person, perhaps the chief of the Ismailites and contemporary of Mahmud al-Ghaznavi, whose forefathers had come to Sind with the expedition despatched by Hajjaj-b-Yusuf under the command of Muhammad-b-Qasim and it was in Sind that they not only mixed with the Hindus but even adopted some unIslamic practices. which leads one to the conclusion that they were Hindus. The author has based his argument on the statements of Ibn-Battuta, Muhammad Ma'sum and other historians.[36]

As far as the Sammas are concerned, their origin is also disputed. Farishtah and Abul Fadl trace their origin to the Persian king, Jamshed. Their views are based on the title-, Jam' borne by the Sammas. Elliot[37] and other European scholars[38] maintain that they wore converted Rajputs. This opinion is shared by some earliest historians of Sind. But later historians of Sind consider them Arabs. Sayyid Sulayman also holds the same opinion. He traces their origin to a freed slave of Kindah known as Abu-al-Sammah who came to Sind with Daud-b-Yazid, governor of Sind. He further holds that it appears

they, as he states, would go to offer the Friday prayer, riding elephants and wearing pajamah (trousers) and also speak Persian, Makrani and Sindhi.[21] To illustrate further, he quotes Ibn Hauqal who writes : "there is no difference between the dresses of the Muslims and Hindus. In Multan and on its suburbs Arabic and Sindhi are spoken while the people of Makran speak Persian and Makrani....[26]

Mansura was also one of the most important cities of Sind. Islam flourished there by leaps and bounds. Opinions are divided as to who was its real founder. According to al-Mas'udi, it was founded by the Ummayyad Governor, mansur-b-Jumhur, after whom it was named[27] Some opine that it was established during the time of the Abbasid Caliph, Abu Ja'far al-Mansur and hence it received its name after him. The learned to *him,* it was founded by 'Amr, son of Muhammad-b-Qasim, sometime between 110 A.H. and 120 A.H. In support of his contention, he quotes *Futuh-al-Buldan* of Baladhuri and *A'in-i-Akbari,* Vol-II of Abu-al-Fadl.[28] This opinion is also corroborated by Elliot[29] and Prof. K. the authority of *Futuh-al-Buldan* by al-Baladhuri and Tarikh-al-Ya'qubi writes: "........the foundation of Mansurah Qasim in the early second century A.H."[30]

With regard to its name, the learned author seems to maintain that the city "Mansurah" meaning "helped or supported" received its name in view of its strategic position in the same manner as did "Mahfuzah" (protected) which was founded by Yakam-b-Awanah al-Kalbi, the predecessor of "Amr.[31], The Arabic word 'mansur' whose feminine form is 'mansurah' means victorious, supported, protected or safe. The term 'mansurah' seems to be the abbreviated form of al-madinah al-mansurah (the protected or supported city) from which 'al-madinah' was dropped perhaps first in speaking and then in writing. It also appears that Amr called it as it was safe from the approach of enemy for its being surrounded by the rivers (the Sind and its tributary) on all sides. In other words it -may be said that it enjoyed the divine support of God.

After this the author briefly deals with the political history of

subjects loved the Muslims very much. His subjects believe that the main reason for their kings enjoying a long life lay in their treating the Muslims very kindly".[22] He further writers on the authority of al-Mas'udi that during Vallabh's reign, the Muslims were granted full freedom for religious practices. In Chimur there was appointed a special Judge called Hunarmand who would decide the cases of the Muslims according to Islamic canonical law. He goes on to say that the Muslim population of Chimur was approximately ten thousand at the time of al-Mas'udi's visit to it, and it was mostly inhabited by the Muslim called "Baya-sirah"[23] In addition to this, the author also discusses some other important places where the Muslims settled down. They are Cambay, Thana, Gandhar, Goga (near Bhavnagar), Chandapur (Goa) etc.

It is followed by a sub-chapter under the heading 'From Cambay to Coromandel during the 8th century A.H.' in which the author unnecessarily describes, among other things, Maldive, Ceylon, Coromandel and other places, which seems to be digression by him from the main topic.

The settlement of the Muslims in Sind dates, according to the author, from even before the attack of Muhammad-b-Qasim, when about five hundred Muslims, having fled from Makran under an Arab chief, took refuge in it. In collaboration of his statement he cites al-Baladburi.24 These Muslims, according to him, were followed by other Muslims who settled here after the conquest of Sind by Muhammad-b-Qasim. They also established their government in different parts of Sind and ruled upto the third century A.H. after which they lost their power, the root cause of which being the clash and tussle between the South and North Arabs. The two main cities over which the Arabs ruled upto the invasion of Mabmfid-al-Ghaznavi, were Multan and Mansura. The learned author first sheds light on the culture and civilization of Multan and tries to show that its culture was a blend of Islamic as well as Indian civilization and the Arab rulers of Multan, as appears from the accounts of Istakhri, felt impressed with the Indian culture so much that they even adopted it. For instance,

The last chapter covers the advent of the Muslims to India in general and South India in particular and the establishment of their colonies therein. In this context, the author explains how the Muslims came to India by sea and settled down its coastal areas even before the invasions of Mahmud of Ghazna (1064 Shihab Uddin Ghori (1178), Qutb Uddin Aibak (1196) and Ala Uddin Khalji 1297).

He also speaks of the six main centres of Arab settlements and colonies which include Ceylon, the Maldive Islands, Malabar, Coromondel, Gujarat and Sind.

As regards establishment of the Muslim colonies in Ceylon he writes on the authority of Buzurj-b-Shahryar and Farishta that it dates from the seventh century A.D.

So far as the Maldive Islands are concerned. the advent of Islam thereto may, he says, be traced back to the coming of Shaikh Abu-al-Barakat al-Barbari al Maghribi to them, whose specific date is not assigned by him.

Islam found grounds in Malabar through Arab and non-Arab saints. The setting up of Muslim colonies in Malabar may, as he writes relying upon *Tuhfah-al-Mujahidin* quoted by Farishtah, be pushed back to the early ninth century A. D. when the king, Zimur, embraced Islam.[21]

The author traces the settlement of the Arabs (Muslims) in Coromandel to the end of the sixth century A.D. In support of his statement he quotes, *Athar-al-Bilad* by Ibn S`ad-al-Maghribi.

The fifth great centre of trade and Commerce of the Arabs was Gujarat. Although the author does not give actual date as to when the Arabs came and settled down in this part of India, yet from historical evidences it is, as he himself mentions in the first chapter of the book under study, proved that the Arabs first came to it in 636 A.D. The author then talks of the sympathetic and amicable attitude of King Vallabh Rai towards the Muslims and his popularity among them. Quoting Sulayman, the merchant, he writes: "King Vallabh Raj and his

of all the rules of war and peace enacted by the Prophet while the latter-deprived of true Islamic spirit-were, to the great extent if not totally, ignorant of the Islamic rules and regulations of war, hence they can never be regarded as true representatives of Islam. The author also very frankly admits that in the Turkish army there were a considerable number of those who embraced Islam only to share in the rich spoils of war. That is why they levied some other taxes besides *Kharaj* (a tax on the produce of the land) and *Jizyah* (protection tax) on non-Muslims and besides *zakat* and Ushr (Tithes) on the Muslims unsanctioned by Islam. The best example of true Islamic rules of war can be sought in the invasion of India by Muhammad-b-Qasim, who, being an Arab Muslim and fully acquainted with Islamic code of conduct, extracted no tax except Kharaj and Jizyah (protection tax) from his non Muslim subjects and granted to them all facilities including freedom of religious practices and worship as well as ensurance of safety of life for their paying Kharaj and Jizyah (protection tax) to the Islamic state. Not only this but Muhammad-b-Qasim, when he conquered Daybul and Multan, did not destroy the idol of the Buddha.[20] This tolerant and benevolent treatment of Muhammad-b-Qasim, the author writes, resulted in the followers of Indian religions, particularly those of Buddhism, having felt deeply impressed with Islam, which can be noticed in Sind, Kashmir, Gujarat, Kutch, Malabar, South India and Ceylon where a foot print on a hill is held equally sacred by the Muslims, Buddhists and Hindus, which serves as a centre of attraction for Arab travelers and Muslim saints. The Muslims consider it to be the foot print of Adam, the Hindus, that of Shiva, and the Buddhists, that of Shakya Muni.

Besides, the author also describes the conversion of an Indian king to Islam, the justice done to the Muslims of Cambay by a king of Nahrwala near Ahmedabad, principles of Buddhism, religious discourses among the Muslims, Buddhists and Hindus, the translation of the Qur'an into Sindhi and the beginning of the conception of pantheism (Wahdah-al-Wujud, the Unity of Being-oneness of existence) among the Muslim Sufis.

piece *'Tahqiq ma li-al-Hind'*, popularly known as *'Kitab-al-Hind'* and the contribution made by him to Arabic through translation of Snaskrit works into Arabic on the one hand and to Sanskrit by rendering Arabic works into the former on the other.

The author closes this chapter with the mention of two games-chausar and chess. On the origin of chess, opinions are divided. The Iranians claim that chess is a Persian game but the author tends to prove that it is purely an Indian one. He says that two most important elements of chess i.e. elephant and rukh (originally *ratha*, chariot) provide testimony to its being a purely Indian game. He further writes, quoting Prof. Arnold, that the original form of *Shatranja* (chess) was *'chaturanga'* which means having four wings/organs'.[15] This view is attested by Sir William Jones who maintains that Hindustan (India) is the cradle for chess, the game having been known since ancient times by the name of *chaturanga,* that is, the four *(chatur) anga(s)* organs.[16] Prof. K. A. Fariq and Maqbul Ahmad also share this opinion. Both of them opine that this game was introduced into Persia during the reign of Nushirwan (A.D. 531-79) by his physician, Buzurjmihr, who was specially sent to India to procure a copy of *'Panchatantra'* by Bidpai (Vidydpati),[17] and from Persia it reached Arabia[18] during the time of early abbasid Caliphs in the second century A.H.[19] As for the Backgammon (chausar) it was also introduced through Iran into the Arab world even before the chess perhaps in the first century A.H. Its mention found in the traditions of the prophet testifies to this fact. The statement of Farishta that the Backgammon was invented by Buzurjmihr does not sound true. *(Tirikh-i- Farishta-Urdu* version. Vol-2, Deoband, 1983, p@ 195).

The fourth chapter is a study of the development of religious contacts between the two nations. In it the author first differentiates between the Arab Muslims and the newly converted Turkish, Afghan and Mughal conquerors of India. He writes that there was a great difference between the culture and customs of the Arab Muslims and those of the Turks, Afghans and Mughals. The former wore imbibed with true Islamic preachings and principles and were thus well aware

Kitab-al-Hind by al-Biruni, *Tabaqat-al- Umam* by Qadi Sa'id al-Andalusi, *'Uyunal-Anba' Fi Tabaqat-al-Atibba'* by Ibn Abi Usaybi'ah.

Before dealing with the cultural relations, the author discusses in detail the origin and religion of 'Baramikah' to whom goes all credit for them. There is divergence of opinion on the origin of 'Baramikah'. It is generally believed that they were magians of Persian origin. Browne seems to be in favour of this view.[11] The author refutes this view and tries to prove on the authority of al-Baladhuri, al-Mas'udi, Ibn Faqih, Yaqut, Qazvini etc. that they were of Indian origin and of Buddhist persuasion. In order to substantiate his statement he quotes Sachau and W. Barthold.[12] The author takes the word *'Barmak'* (singular form of *'Baramikah')* to be the arabicised form of the Sanskrit word, *'Pramukha'* meaning chief-honorary title of high priest of' the temple of Nawbahar, near Balkh.[13] Prof. K. A. Fariq of Delhi University also holds the same view.[14]

As regards the cultural relations, the author maintains that they actually date from 154 A.H. (771 A.D.) when the *Sidhanta* (Ar. sind-hind) was translated into Arabic from Sanskrit by an Indian scholar, well versed in mathematics and astronomy, with the help of an Arab mathematician named Ibrahim al-Fazari. The author then very briefly speaks of three great physicians of India, namely, Mankah, Salih-b-Bhela and Ibn Dahn. He, thereafter, explains the introduction of mathematics particularly the decimal numeration and the numbers from 1 to 9 in the Arab world from India, talks of Indian sciences and literature such as Astronomy, Medicine,. Music, Logic, Chemistry, Prosody, Fiction, Politics etc., and also gives the list of works on medicine translated into Arabic from Sanskrit, which includes, among others, *Susrud* (Susruta), *Chraaka, Sindhastaq or Sindhastan (Siddhayoga), Nidan (Nidana)* etc. He also briefly describes the lives and works of two Muslim scholars who came to India to acquire the first hand knowledge of Indian sciences and literature. They were Muhammad b-Isma'il al-Tanukhi (who flourished perhaps in the 9th century (A.D.) and al Biruni. He deals at considerable length with al-[illegible]

Arabic). Another word which he thinks to be borrowed from Hindi is *Dunij* with its Arabic plural *dawanij. Duinij*, according to him, is the arabicised form of *'Dongi'*, meaning a skiff. Still another word is *Nakhudhah*. According to the author, *Nakhudhah* is the abbreviated form of the Indian word *'Nao'* (boat) and the Persian word *'Khuda'* (owner).[8] He further points out that at least three Sanskrit words, on which lexicographers are unanimous have found their way even in the Holy *Quran*. They are *misk* (Sanskrit, musaka, musk), *Kafur*, (Sanskrit, *Karpura* Camphor) and *Zanjabil* (Sanskrit, *srugavera*, Ginger).[9]

In addition to this, the author also gives the details of the commodities merchandise) exported by India on the one hand and by the Arabs on the other. Among the commodities exported by India, he writes, were camphor, sword, candamom, coconut, cotton fabrics, ambergries, aloe, sandal, ivory, rhino- ceros horn, poison, clove, pearls, pepper, lemon, mango, bamboo, betel, cane net meg, musk and the commodities exported by the Arabs included dates, horses, Egyptian wine, silk fabrics, coral, ring made of emerald, marjan etc. He has missed here the mention of a most important commodity i.e. frankincense, which was imported by India from Yemen to be burnt in temples.

That apart, Sayyid Sulayman Nadvi asserts that the Arabs were aware of the sea route to India via South Africa even before vasco de Gama (1460-1524) whose boat was piloted by an Arab navigator, Ahmad-b-Masjid, known as Asad-al-Babr (the lion of the sea) to Calicut India, in 1498, a fact which is admitted even by the Portuguese.[10]

This chapter closes with the citation of an Arabic poem by an Indian poet of the Arab origin named Abu Dil'al-Sindi. The poem extols the products and excellences of India.

The third chapter is devoted to cultural relations between the Arabs and Indians. It also contains brief accounts of some particular classical sources employed by the author. They include *al-Bayan wa-al-Tabyin* by Jahiz, *Tarikh-al-Ya'qubi* by Ahmad-b-Ya'qub-b-Ja'far,

betic system of writing (the greatest invention of mankind) along with their influence on the Indian alphabet as well as the vital role the Jats, who originally belonged to Sind played in wars against the Romans and others.

While dealing with the early relations, the learned author briefly discusses the claim made by the Arabs that their relations with India dates from Adam's coming down to the earth[4] from heaven and quotes, to this effect some weak traditions of the Prophet which he himself does not take as trustworthy. It is really very difficult to fix the date of the relations between the Arabs and Indians. The evidences found in the Old Testament load us to put the date back to 2000 B.C. as the author himself admits s or as back as the third millennium B.C. as is held by Maqbul Ahmad.[6]

The author then makes a detailed survey of the invasion of India by the Muslims. It is commonly and mistakenly held that the Muslims came to India with or after the sway of Mahmud of Ghazna. But the competent author rejects this view on good proof and t races the advent of the Muslims to India to 636 A.D. when, during the caliphate of 'Umar, the first attack was made on Thana (Bombay) under the orders of the Governor of Bahrain, thereafter on Bharunch (Gujarat) and Daybul (near Karachi).

In the second chapter the celebrated author deals, at some length, with the two main trade routes followed by the Arabs, sea ports of 'Iraq and India such as Ubla, Siraf, Tez, Daybul, Thana, Cambay, Raj Kumari etc., the trade routs between Europe and India through Egypt and the Red Sea on the one hand and via Syria, Iraq and Iran on the other, as well as those between Russia and India through the Caspean Sea and Iraq and by way of France or Spain, Algeria, Tunisia, Egypt, Syria, Iraq, Iran, Balochistan and Sind.

Besides, the author critically discusses the etymology of some Arabic words of Indian origin. For example, he writes with reference to al-Biruni[7] that *Barijah (pl. Bawarij)* is the arabicised form of the Indian word, *'Beda or Bera'* - boat (H in Hindi is changed into J in

A CRITICAL STUDY OF 'ARAB-O-HIND KE, TAALLUQAT

Dr. MAQSOOD AHMAD
(M.S. University, Baroda)

'Arab-o-Hind Ke Ta'alluqat (Indo-Arab Relations),the first work of its kind in Urdu on the subject, is a collection of five lectures delivered by Sayyid Sulayman Nadvi (died 1953) on March 22 and 23, 1929, at Hindustan Academy, Allahabad, on the political, commercial and cultural relations between the Arabs and Indians (more precisely between the Muslims and Hindus). The idea underlying this serious piece of research was to raise before the minds of the Indians of the author's generation a picture of the happy relations which subsisted between the Hindus and Muslims of India in early medieval times.[1] The book was originally published in 1930 by the same academy. A thorough study of this pioneering and classic work shows the pains the learned author has taken in consulting the earliest original sources and collecting necessary and relevant material from them. In his celebrated work, the author has confined the survey to the early medieval period.[2] The scholarly work which contains, inter alia, the first map of Sind and Gujarat prepared by Ibn tlauqal al-Baghdadi in 943 A.D., is divided into five chapters. In the first chapter the learned author has taken account of the early relations between the Arabs and the Indians, the invasions by the Arabs of India after Islam and their causes. the main reason for the defeat of the king, Dahir[3] and has also discussed the lives and works of the Arab travelers and geographers like Ibn Khurradadhbih, Sulayman the merchant (the first Arab travelers who recorded accounts of his own travels in 857 A.D.), Abu Zaid, Hasan al-Sirafi, Abu Dulaf, Buzurj-P-Shahryar, al-Masudi, al-Istakhri, Ibn Hauqal, al-Biruni, Ibn Battutah etc., the trade routes of the Phoenicians who were the first to popularise an exclusively alpha-

derived and enunciated by eminent Sufis of Islam. It is this Sufism which has got the potentiality to save present manking from various crises and lead to allround peace, prosperity and happiness.

Prof. Jaferhusen I. Laliwala
M.A. (Econ) Ph.D. (Econ) M.Phil (Philosophy)
Ph.D. (Philosophy), LL.B

Thus God of Qur'an is transcendentally immanent and immanently transcendental. in short. His is Unique.

When we read Sufi literature. we find and it is attested by other Western Scholars also that in Islamic Sufism. the finite (the devotee i.e. Sufi) does not lose himself into the Infinite (i.e. Allah). but rather the Infinite (as Dr. Iqbal would like to put it) passes into eht loving embrace of the finite.

Islamic Sufism is unlike Indian monism. it is ontic monism. The entire Universe exists in God and the universe is the manifestation of God which is continuous and hence universe is constantly expanding. That is why. it is said in Qur'an that "God is ever in new glory". ( ) God expresses Himself through sub-egos and every sub-ego has got some limited freedom and there is gradation in egohood and hence also in the degree of freedom. Jus as. cells in human body have got limited freedom. but they all are the parts of human body. I-am-ness of Man does not lie in any part of his body. but in his centre of psychic self-consciousness. Thus the transcendentalism of God lies in His centre of self-consciousness and His His Immanence lies in His manifestation and expression in the form of created things and created beings. Man is the vicegerent (Khalifa) of God on this earth. as his Khudi or centre of psychic self-consciousness i.e. his personality is the stongest among God's all creatures.

Thus Man becomes the co-worker with God and acts as the Khalifa (Vicegerent) of God on the earth. Man with true Iman does not bow before anybody or anything except before God and thus by inculcating belief in one God. Qur'an imparts freedom to Man from the shackles of all false gods and teaches him to work for the freedom and prosperity of all other human beings for the sake of only seeking the pleasure of God. Thus Qur'an imparts meaning to human life and to the universe and guides Man to the Straight Path (Seratal Mustaqeem - the path of Tariqat through evolving Shariat) which leads to universal love and equality. prosperity and real happiness for all human beings. This is Islamic Sufism as embodied in Holy Qur'an and Hadith and

But Ibn-e-Arabi has shown in his famous book "Fusus-al- Hikam" that though the devotee of God becomes one with God in emotion and knowledge, but not in existence and so there is "fana fillah".. but after it, there is "Baqabillah", as Mujaddid Alfsani also has shown it and it has been quoted by Dr. Mohammad Iqbal also in his well-known book "Reconstruction of Religious Thought in Islam". Shah Valiullah also has shown in his writings that the difference between these two theories is only semantic i.e. in words only and not in reality. I humbly feel that Wahadat-ashshohud is a part or a stage of the theory of Wahadat-al-Wujud, and the theory of Wahdat-al-Wujud actually includes the theory of Wahdat-ashshohud and absorbs it.

In Qur'an, there are many verses which support the transcendental ness of God and also immanence of God. Qur'an has more than frequently emphasized that there is no divinity in any human being (including prophets) or any creature in the universe. Divinity vests only in the creator i.e. God and so no human being or creature resembles God in any respect and nobody or nothing is like God. God is unique and He is the definition of Himself and He transcends every being and thus He is transcendental. Surah Ikhlas of Qur'an specifies this in clear terms. Thus the transcendentalism of God makes human beings free from the wrong beliefs propagated by arrogant and powerful people (Mutakabberin as described in Qur'an) that they are Suryavanshi or Chandravanshi or they have got some special divine element which gives them the religious or divine sanction to rule over common people who are Mustadaefin (weak people) and exploit them. Thus it teaches equality of human beings. At the same time, there are many verses in Qur'an which indicate that God is Immanent-in every being and everything in the universe i.e. He is Immanent also. In Qur'an, it is said "He (God is Manifest and also Hidden"

"He is the First and He is the Last" "Wherever" you turn, you find the face of God there", "God is nearer to you (every human being) than your jugular vein". Thus Immanence of God in everything and every being teaches us to love every human being and to have karuna (sympathy) for every human being.

whose name was Abu Masud Ansari became angry with his slave and began to beat the slave with a stick, at that very time, Prophet Mohammed also was passing by that side and he told Abu Masud that "0 Abu Masud, beware that God has more power and control over you than what you have over your slave".

When Abu Masud heard this, immediately the stick fell down from his hand due to the fear of God and he at once declared that the slave was henceforth free.

Islam as enunciated in Qur'an and Hadith does not restrict itself to only Ebadat like prayers, fasting, pilgrimage and charity (though they are very important) or the, doctrines of Islam are not really fulfilled when some criminal and social laws or personal laws only are introduced and dramatically followed or by running some interest free banks (though they charge interest from the backdoor) to evince public attention and derive public support. But the principles of Islam are really followed when power is in the hands of the common people, there is prevalent equality of all human beings and the Govt. is also under Law and very sincere efforts are being made to abolish poverty and unemployment and all human beings are treated as brothers and sisters and respected as such. The believers in religion are expected to be the foremost among such people to establish such a society and to develop such persons. Every social movement requires devoted workers who are not the worshippers of money or power and then alone any social movement can succeed to transform the society on the right lines. To create such workers is the function of Religion according to Qur'an and Hadith. That is how Sufis understand Qur'an and Sunnah which is the hope for the modern despairing mankind.

Ibn Arabi - a Sufi philosopher of Spain who is considered to be the greatest sufi - known as Shaikh-e-Akbar, derived the theory of "Wahdat-al-Wujud" (Unity of Being) which considers God to be not only Transcendental, but also Immanent. Another great Sufi - Mujaddid Alfsani of India derived the theory of "Wahdatushshohud" (unity of creation) emphasizing ultimately the non-absorption of man into God.

they are committing shirk i.e. they are idol worshippers, their idols being religious scholars, or mystics or their own selfish selves who have been given the place of God by them. So Sufis follow the pure concept of one God and do not accept any agent between Man and God and they are bold in their beliefs, speech and actions. Mr. Ahmad Amin of Egypt in his book "D'awat-al-Taqrib" explains the meaning of the Kalemah "La Ilaha illallah" in the following words :

" The one God, who who wants to enslave us wants to be a god, but "There is no god but, (one) God", the one who wants to be a tyrant, wants to be a god, but 'There is no got but (one) God, the ruler who wants to humble us, wants to be a god, but there is no god, but one God.

We accept from any man or from any nation whatever, but only on conditions that they should be brothers. Democracy, socialism and social justice in their true meanings-will survive and advance, because they call f or human brotherhood and this is one of the consequences of "No god but one God', (La ilaha illallah).

Thus, according to Qur'an, Tawhid i.e. belief in one God in His entirety should directly lead to belief in one mankind i.e. human brotherhood and equality and freedom of Men and respect for all human individuals. So one of the important Sufi doctrines which they have derived from Qur'an and Hadith is Sulah-e-Kul i e. "Universal Love" for all human beings and all creatures of God. Sufis have shown in their theories and by their practice that all the teachings of Qur'an and Sunnah are based on universal peace, universal humanism and universal love. The aim of Prophet Mohammed's life was to teach these lofty moral values to all human beings. Prophet Mohammed (peace be on him) had said.. "I am sent to teach the perfection of good human virtues". He also pointed out that "That person's Iman (faith) is perfect who is the best in his virtues. He also said that "on the Day of Judgement (Qayamat) the best thing in Balance (of good and bad deeds) would be good human virtues (Akhlaq)".

Once a companion of Prophet Mohammed (peace be on him),

(3) Those who are nearer to God (Muqarrabun) i.e. those who are ahead of Ashab-al-Maimana in treading along the Right Path (Seratal-Mustaqeem) and their Iman (faith) is based on their understanding (emanating from their spiritual experience of God) of the correct relationship between "Khalq (creation) and "Haqq" (Truth i.e. God who is Khaliq i.e. creator).

Famous Sufi Saint Shahabuddin Suhrawardi in his well known book "Awarif-al Ma'arifl" explained that the word "Muqarrabun" used in Holy Qur'an conveys the same meaning as we mean by the word 'Sufi' ".

Imam Ghazali in his book "Al-Munqidh min-al-Dalal" describes the methods of the characteristics of Sufis in the following words. "When I turned my attention to the methods of the Sufis, I came to know that their method attains perfection by means of theory and practice. The gist of their knowledge is to mortify the self and acquire freedom from baser passions and evil tendencies so that the heart gets rid of the thought of anything but God and to embellish it with Divine (i.e. God's) remembrance".

Sufi's entire life is dedicated to God. Oneness of God in Qur'an, is meant to be oneness in the self of God, oneness in the Attributes of God and therefore Man is expected to worship one God only in his prayers and seek-ult'imate help from Him only and at the centre of all his actions he is seeking the pleasure of God. But as it is mentioned in Qur'an that God is self sufficient and hence praise of God by Man or criticism does not affect Him, it Affects Man himself. Of course God responds to Man's sincere prayers if he tries to be upright in his actions. In Qur'an, just as the meaning of Iman is very wide and deep, in the same way, the meaning of the term "Shirk" i.e. associating partnership of anybody or anything with God thus denying the oneness of God is also very wide. In Qur'an it is mentioned that one who is very selfish, he worships his baser self (Nafs) and persons who blindly follow the religious scholars or mystics on the basis of their authority without any sound reason or direct or indirect proof,

angels of God. it means that whatever good inclinations that the angels (who are the carriers of the laws of God) create in the hearts of men. he will imbibe them into his actions. Thus mere 'words uttered are not Iman. iman is spiritual experience of God and it is a dynamic phenomenon and efforts have to be made to increase it day by day. A famous existential psychoanalyst Mr. Erich Fromm has nicely explained the dangers of the use of formal words without their inner psychic basis (i.e. spiritual experience) in his. famous book "Psychoanalysis and Religion.' in the fol lowing scintillating words : "Words and thought systems are dangerous. because they easily turn into authorities whom we worship. Life itself must be grasped and experienced as it flows and in this lies virtue" (P.39, 40)

Sir Saiyed Ahmad Khan also pointed out that "Religion is found in changing social affairs and not in mere written words". Written books are very important. but their basic principles are to be understood in the social context and Ijtehad has to be applied when social circumstances change. Only those people can understand and accept this, who take into account the spirit of the words and who are not the worshippers of words. Sufis were such persons who understood the re al gist of the words and verses of Qur'an. as they delved deeper into understanding the spirit of the Qur'an and its rational basis and its universal humanitarian message. That is why I humbly submit that they were nearer to the true interpretation of Quran. as they have been Muqarrabun (nearer) to God spiritually.

In the Sura "Waqea", human beings are shown to be divided into three classes of people. as follows :

(1) The companions of the Left Hand (Ashab-al-Mash'ama) i.e. "who have discarded Iman (faith) and worship Gods other than one God and who have bartered guidance (Hedayat) f or error and have missed their true direction"

(2) The compani ons of - the Right Hand (Ashab-al-Maimana) i.e. "those who have faith in unseen (Ghaib) and are steadfast. in prayer and have faith in the Hereafter (Akherat)".

bringing about change in the minds of human beings thus inculcating, these humanitarian values in their very hearts and making them the part of their individualities. I personally believe that in bringing about this inner change, Sufism as given in Qur'an and Hadith can play a great role.

If we study Sufism and also the lives and deeds of eminent Sufis of India and of other countries, we find that :

(1) they laid great emphasis on inner moral change of man through having spiritual experience of God.

(2) believed that the way to reach God passes through the service of mankind and

(3) laid stress on the importance of knowledge (Ma'refat) as acquired through Reason which is the composite of Intellect and Spiritual Experience and

(4) they worked among common people for their upliftment.

For Sufis, Iman (faith) in God was not mere utterance of words, but real spiritual experience and a way of life. In Qur'an, the word "Iman" has been employed in the sense of the principle or basis of action which can impart peace to the entertainer of Iman and security to others from him and imparts strength to the holder of Iman to be honest and trustworthy. It is not mere uttering of words of the Kalemah and so iman can never be formal. Iman provides rootedness in the hearts of men to do good deeds, and avoid doing bad deeds and to do benevolence to other human beings. When a man believes in God, it means that he (or she) accepts the Attributes (Sefat) of God like his Providence, mercy, compassion as the purpose of his life to be followed in action. When he believes in prophets, it means that in the characters and lives of prophets, whatever the moral laws of God (which are the reflections of the Attributes of God) that are found to be working, he will follow them. When he believes in revealed Books, he will make the common principles of humanism (Ad-Din) enunciated in them, to [illegible] this life. When he says that he has Iman.-(faith) [illegible]

33

Sufism in Qur'an and Hadith and the Crises in the Modern World

- Prof. Jaferhusen I. Laliwala
(Ahmedabad)

The present day world is passing through many crises - economic, political, social and religious. In many parts of the world, there is breakdown of law and order and there are communal and racial riots, corruption is rampant all around and there is blind worship of money and power and crass materialism has taken hold of the hearts of men and women. So the modern mankind is on the brink of total disaster. Science and technology have so much developed and social sciences have elucidated such policies that if these policies 'are sincerely adopted and modern technology is harnessed in the service of mankind, poverty, unemployment, illiteracy, injustice and exploitation can be completely wiped out. But these good things at present remain on paper only and natural sciences and technology and economic, political and social policies are used to exploit common masses and keep them poor and unemployed and helpless and engage them in mutual and internecine conflicts and the benefits of modern technology and state-power are monopolistically cornered by the powerful upper crust of the society. Science, democracy, freedom, religion - all good things are utilized wrongly to undermine the fundamental rights of the common people who remain deprived in many fundamental ways.

Believers in Democracy and Liberal Economics and experts of constitutional Law like Dr. B.R. Ambedkar and other scholars believe that Law can control the actions of the people in the right direction only to the extent of 10 percent, while the 90 percent of the effectiveness of democracy, free market and the provision of the equal fundamental rights of all human beings can be materialized only by

Hazrat Rukn ud-Din faruqi Chishti, Sajjadanashin, *Khanqah-i Chishtiya*, Shahi Bagh, Ahmedabad , is inaccessible.

Shaikh Sikandar b. Muhammad 'urf Manjahu b. Akbar, *Mir'at-i sikandari*, Persian text, edited under the title, *The Mirat-isikandirri[sic]: A History of Gujarat from the Inception of the Dynasty of the Sultans of Gujarat to the Conquest of Gujarat by Akbar of Shaikh Sikandar ibn Muhammad urf Manjhu ibn Akbar, eds.* S.C. Misra and M.L. Rahman, Baroda: department of History, Faculty of Arts, The M.S. University of Baroda, 1961; see also Ziyauddin A. Desai, '*Mir'at-i- Sikandari* as a Source for the Study of Cultural and Social colnditions of Gujaratunder the Sultanate (1403-1572)', *Journal of the Oriental Insitute* (Baroda), M.S. University, vol. 10, 1961, pp. 235-78.

Muhammad Miyan Tiramizi, Sajjadanashin of Saiyid Mas'ud Tirmizi, Mangrol (dist.jumnagadh, Gujarat) and parts VI-VII, Maulana Azad Library,Aligarh Mulim University, Aligarh (photocopy in the Libraray, Dargah Hazrat Pir Muhammad Shah, Ahmedabad).

Shah 'Abdu'r Rahman Badh, *Manaqib-i Burhani,* account of hazrat burhan ud-Din Qutb 'Alam (d.1453), MS. in the Library, Dargah Hazrat Pir Muhammad Shah, Ahmedabad.

Shah Baha ud-Din Bajan Chisti, Khaza in-i Rahmat or correctly Khaza'in-i Rahmatu'llah, Ms., Anjuman-i Taraqqi-i Urdu, Karachi, Pakistan (photo-copy in the Library, dargah Hazrat Pir Muhammad Shah, Ahmedabad). See also Shaikh Farid, *Shah ud-Din bajan Chishti: Hayat aur Gujari kalam,* Ahmedabad: Hazarat Pir Muhammad shah dargah Sharif Trust, 1992.

Shah Mansur bin Chand Muhammad. *Tuhfatu'l Quri,* account of the life and supernatural powers of Qazi Mahmed Darya'i Birpuri, MS. in the Library, Dargah Hazrat Pir Muhammad Shah, Ahmedabad. See also *Tuhfatu'l Qari: Life and Gujati Poems of Hazrat Qazi Mahmud Dariya i Baipuri, d. 941 AH-1453 AD,* compiled by shaikh Chand bin Mansur, eduted and annotated by Mahmud Husain Shaikh and Mahmed Husain 'Abbasi, Ahmedabad: Hazrat Pir Muhammad Shah Dargah Sharif Trust, 199-7.

Shaikh Muhammad chishti, *Al-Majalisu'l Hasaniya, malfuz of* Shaikh Hasan Muhammad Cuishti of Ahmedabad (d. 1574), MS. in the Library, Dargah Hazart Pir Muhammad Shah, Ahmedabad and Asiatic Society of Bengal, Calutta, in the *Arbau Rasa'il* of the same author.

Shaikh Rashid ud-Din Lala Faruqi, *Mukhabiru'l Auliya, c.* early nineteenth century in complete and incorrect modern MS. in the Library of the Royal Asiatic Society, Bombay Branch, Bombay. A complete and very probably autograph copy with

of the well-known sixteenth-century Persian history of Gujarat, the *Mir'at-i Sikandari*, in 1961, in *The Journal of the Oriental Institute* (Baroda), under the title, '*Mir'at-i Sikandairi* as a Source for the Study of Cultural and Social Conditions of Gujarat under the Sultanate (1403- 1572)'.

REFERENCES

'Abdu'r Razzaq Ja'fari, *Miftahu'l Qulub wa Izalatu'l-Kurub*, contemporary account of Qazi Mahmud Darya'i Birpuri, MS. in the Library, Dargah Hazrat Pir Muhammad Shah, Ahmedabad.

Maulana Muhammad bin Qasim, Mirqatu'l Wusul ilallah-i we's-Rasul, malfuz of Shailkh Ahmad Khattu of Sarkhej (near Ahmedabad, Gujarat), d. 1445.M.S., Asitaic Society of Bengal, Calutta, Society's Collection, under the title *Malfuzat-i Shaikh Ahmad Maghribi.* Extensively covered in Ziyauddin A. Desai,*Malfuz Litreature As a Sourece of Political, Social & Cultural History of Gujarat & Rajasthan in 15 th Century*, Patna: Khuda Bakhsh Oriental Public Library, 1991.

Saiyid Muyhammad Ja'far Badr 'Alam, Sad Hikayat, MS. in the Library attached to the Dargah of Shaikh Ahmad Khattu, Sarkhej.

Saiyid Muhamad Maqbul 'Alam poetically named Jalali, *Chini Hikayat*, MS., Personal Collection, Patan (north Gujaray).

_____ Divan jalali,ed.Muhiuddin Bombaywala, under the general supervisionof Dr.Ziyaud-Din A. Desai, Ahmedabad: Hazrat Pir Muhammad Shah Dargah Sarif Trust, 1995.

_____ Juma'at-i Shahiya, account of Friday Assemblies, in seven parts, of the saint Saiyid Siraj ud-Din Muhammad Shah 'Alam (d. 1475), parts IV-V, MS. in teh private collection of saiyid

clean the courtyard of the saint's premises fell into a dirty pool. Loath to pick it up and spoil her hands, she left, leavina behind the otlierslipper too. The saint whochanced to see this, took itout andafterwashing it, placed italongwith the other slipper in a niche in the wall. For two or three days the woman did not see the saint who used to wish her every day and enquire about her family. She thought that he was annoyed and displeased with her on account of that incident. Apprehensive that she might be sacked for her negligence, she started crying. Others were trying to reassure her,when the saint came in. On being apprised of the situation, he told her, 'O dear sister! These people are telling you the truth.' When she was about to leave, the sainttook herslippers and stopped her saying,'Osister! Wait. Why areyou so distraught? Are you unhappy with us? Take these slippers. A mother only cleans and washes her infant child's loins in infancy and childhood, while you carry our refuse for the whole life. You who deserve our respect for that, why should you feel sorry for such a small lapse of yours?' When the saint's chief *Klialifa* Saiyid 'Usman Sham'-i Burhani shifted his residence from Ahmedabad to the other side of the river in a desolate place, the first person he persuaded to settle there with his family and kinsnien was a Brahman named Gadddhar.

Each of the works mentioned earlier furnishes in its own way new material for the social, cultural, literary and even political history of medieval Gujarat. Unfortunately, this genre of Persian literature has not received adequate scholarly attention. For a comprehensive history of medieval society, an indepth study of each such work should be made. I have already made an attempt in this re-ard and my detailed study of the fifteenth century *malfuz*, the *Mirqatu'l Wusul*, formed the topic of the Khuda Bakhsh Memorial Lectures, Patna, in 1985. Here *(Malfuz Literature As a Source of Political, Social & Cultural History of Gujarat & Rajasthan in 15th Century)*, I have given a detailed account of the varied information gleaned from that *malfuz*. Incidentally, some historical works also contain material of this kind. It may be recalled that I have made a similar indepth study

by Maulana Shaikh Abu'l Faraj Razi-ud-Din of Didwana (in Rajasthan), obviously with the saint in mind, that no holy person could hope to attain union with God by simnply performing ascetic exercises at home and without undertaking extensive tours. On being, told about the saint's reaction to his statement, the Maulana wrote a letter to the saint narrating therein the details of an incident as to how a newly i-naitied Hindu bride was endowed, by virtue of her righteous behaviour at her new home, with clairvoyance; he submit- ted to the saint that if even a Hindu lady with a single act of righteouness could attain such a position, how could he dare say that a true Unitarian Faithful Muslim like himself could not attain union with God? For he had given up worldly pleasures, had fulfilled religious obligations and undertook perpetual religious fasting.

When a Hindu farmer who tilled the land of Qutb-i '.Alam grew old, the saint's sons, grandsons and disciples used to pay him ducrespects and after the saint's death, would visit him at his house. One day a disciple asked the farmer about the deceased saint. He related that when as a young lad he was standing on the road by which the saint was coming in his cart, he asked his father who the man in the cart was and was told that he was a *maha- purukh* (a great man, a saint) whose *darshan* he should have.,

Love-for-all irrespective of Creed or Caste by Qutb-i calain and his Disciple Saiyid Usman

Qutb-i 'Alam was once riding on horseback from Baroda alongwith a few companions. A Hindu barber who was dead drunk came up before the party and saluted the saint. The latter dismounted and returned the salute and mounted his steed to proceed further. The barber again saluted the saint and again he dismounted to return the salute. This happened seven times. One of the companions, also a saintly person, told the saint that the man was drunk. The saint's typical answer was,'But we are not; we are in oursenses *(Asan hushyar ahen).'*

Once a slipper of the Hindu sweeper-woman who used to

had even found somejustification in the law books for being absolved of this obligatory religious duty by paying the animals' price in cash.

Shaikh Ahmad's wrestling bout with a Hindu cobbler's boy shows the absence of caste or creed prejudice on his part. He and his spiritual preceptor Babu Ishaq never differentiated between a Muslim and a non-Muslim in his time of need. A Hindu grocer of Khatu (in Rajasthan), Popa Baqqal, we are told, secured his release from the custody of a local official for the non-payment of state dues, through the good offices of Babu Ishaq. The grateful grocer tried to repay this favour by making some offerings which the BABS refused. After persistent entreaties, the saint was persuaded to accept a credit-purchase arrangement for the khanqdh's grocery needs from his shop. Once, in the grocer's absence, his minor son refused credit to the saint's man, the grocer coming to know of it on his return, ran down to the *khanqah* with profuse excuses and 2 *seers* of apricots and a lamp which the Shaikh declined to accept, ultimately condescending to continue the credit-purchase arrangement.

Non-Muslims also held Shaikh Ahmad in great esteem and respect. When he went from Khatu on Haj, all along the way, he lodged with non- Muslims in villages., once he was provided accommodation by an old Hindu lady and whose neighbours reproached her for keeping a Muslim in her house for which she might meet with reprisal from the village headman. The Hindu trading community had their day-to-day dealings with their Muslim fellow-townsmen including saintly personages. Once when a certain official informed Babu Ishaq that he had set apart a calf for him, the saint asked his Banya grocer to collect it from the official and keep it, obviously in lieu of payment for grocery dues. The Shaikh had a silver plate which he would pledge with a local Hindu trader to borrow cash or things from him and settle the account as and when he had money.

An interesting incident narrated by Shaikh Ahmad Khattu shows how non-Muslims received due recognition for their piety even from orthodox Muslim clergy. He was once told about a remark made

Ahmad Khattu was extremely kind and responsive to the need of the poor. The income of the saintly establishment comprising the revenue of a village endowed for it andconsiderableamount offutiih-money (unsolicitedvoluntarydonations), after meeting the expenses of the *khanqah*, its inmates and guests and visitors, was distributed among the poor and deserving in various ways. Regular allowances were given to widows and those women without a means of livelihood. Every month (or probably every alternate month) whatever surplus balance that had accumulated would be given away to the poor, the *sadat* (Saiyids), the jogis, wayfarers and Kol-is (backward non-Muslim community), in cash or in kind.

The Shaikh's compassion extended to birds and animals. Sparrows would come and perch on his knees, shoulders and head. The *khanqah* attendants were specially instructed to keep off the crows from attacking young sparrows; at times, he would himself keep a rod with him and drive the crows away. Once he saw a kite lying wounded; he brought it home, lot,ded it under a basket and had it fed daily with meat until its wound healed and it was strong enough to fly away. Once a man came to him with a pelican whose wings he had pulled out so that it could not fly away; the saint paid him for it and arranged with a local fisherman to feed it with its daily quota of fish until it recovered and then was to be released into the forest. As and when a huntsman caught some animal, the saint would pay him for it and release it. Once an admirer of the saint made him an offering of a fat cow in the month of Sacrifice, ostensibly for sacrificial purposes. The saint gave the cow away to one Shaikh Taj ud-Din for his milk, whey and butter requirements. The latter sold it to a butcher from whose custody the cow somehow broke loose and came bellowing to the *khanqah*. Even while the saint was inquirin., about the commotion, the butcher came running to catch hold of the cow. The saint paid him off and had the cow let loose in the cattle-herd. He would have grain put in the courtyard of the *Jama'at khana* for doves to eat. The saint was so tenderhearted that he would not slaughter the sacrificial animal with his own hand nor could he see it done in his presence; he

dismissal., how in small towns, there was forced labour; how bedsteads, etc., would be collected for visitinc. officials from the local populace., how the covetous Kotwal, Shiqdar and other officials would take resort to tyrannical ways and harass ryots and *a'imma* landholders, how cheats—ladies posing as Hajiyanis—would dupe women, including those of the saintly families, by selling to them spurious items like 'collyrium from Mecca'; and how men entrusted with cattle by the saints on the basis of a share in the milk would try to cheat. These sources also help identify monuments like tombs and forts, as well as gardens and other places. They contain references to wall-paintings in the houses. They also trace the history of a number of villages based evidently on bardic accounts dating back to the fifteenth century. These works also throw some li-ht on the prevalent educational system, the *maktabas and madrasas,* teachers, the books prescribed, etc.

In short, these works help conjure up a medieval rural world in all its fullness. Apart from the spiritual and religious personalities, and discussions on mystic and ethical topics, we come to know of social customs, religious ceremonies, manners, prejudices and predilections, modes of behaviour and addres&, food- and dress-habits, games and pastimes, prevalent among different sections of society. There are references to various types of illness and their treatment (prayers recited on water to be given to the sick person, or prescription of indigenous medicine). Then there are references to the prevalence of black ma-ic and its antidote by holy men which consisted of drawing a picture of the person on a wall and shooting it with an arrow. Such detail is not to be found in the historical works at our disposal.

Catholicity and Human Behaviour of Shaikh Ahmad Khattu

It is not possible to go into detail here about all such matters. I would only highlight the catholicity of approach, human behaviour and compassionate attitude of three fifteenth-century saints towards their fellow-compatriots, irrespective of caste, creed and vocation. Shaikh

fellow children throwing down or being thrown down on the ground and getting hurt; how a child from the saint's household would crawl in the courtyard, with its fresh flooring of cow-dung and clay and hay and how a lady of the house would try to frighten him with a rod in hand, saying it was filth and hence unclean; how a child asking something, from a step-mother in a saint's home would meet with refusal, etc.

We also come across a very interesting reference to the use of obscene songs at the marriage party of the son of Qazi Mahmud himself. The interesting part of the information is that when the groom's mother expressed before the saint her party's predicament at being at the receiving end, the saint extempore composed a song in the same strain to be given to professional singers to recite in reply. Significantly, the custom of singing obscene sonts at marriage parties is prevalent even today in rural north India, as well as, probably, in certain sections of urban society.

We also come across incidences of dissension in the saintly families or those of their near relatives, on account of unequal share of allowances, property, land, or a house, as in any other family. For example, one of the widows of an eminent saint complained that her daily allowance was less than that of others. In another incident, the two wives of the son of a saint did not get on. Similarly the married daughterof asaint was nothappy with her husband's family. In another instance, a saint, at the time of his death, made an agreement in writing,, fixing the share of his brothers and sons in the land and from thefutiih-inoney (offerings at the tomb), so as to avoid disputes in future.

These works constitute a useful source for political and administrative history as well, more particularly for the local history, which court- chroniclers ignore as a rule. We get names of a number of local officials, with theirdesignations and theirjob-profile. We are told how agovernment official *(waqi'a-navis)* reported a minor slip on the part of the reciter of the sermon at a Friday prayer, recommending his

Information on Social, Cultural and Administrative Aspects

As will be gathered from what has been said earlier, the primary intention of these works, written or compiled by the saints' own kinsmen, disciples or admirers, was to extol and glorify the saints. They describe supernatural powers through unbelievable incidents presented as authentic. However, these very incidents, woven as they are around day-to-day occurrences in the lives of these holy personages, contain rare valuable matedal about the life of people right from royalty, nobility and saintly establishments down to traders, artisans, peasants, soldiers and the lower strata of society. Some of these works like the earlier mentioned *Mirqatu'l Wusal, Jumej7t- i Shihiya and Mandqib-i Burhan-i,* for example, furnish a vivid picture of contemporary society in general and provide a glimpse into the life of the common people with all theirjoys and sorrows, comforts and discomforts, as also the human qualities of the saints themselves.

Saintly persons come alive through the pages. Though being the cream of the society and highly venerated, they come across as extremely humane and simple personages in their everyday life and in their dealings with fellow-beings. The picture that emerges from the perusal of these works is that, apart from theirsuperiority in spiritual knowledge and experience and higher religious status, their life was not very different from that of other people. They lived like others, visiting their land and fields which they held in subsistence grants, taking good care of their cattle, participating in social functions of various sorts, communicating or corresponding with people, going for a stroll in the garden or to the village pond to have a look at the newly blossomed *nilofar* flowers or to see a river in spate. They would take part in frolic and innocent pleasure water-play with a fellow bather in a local pond, throwing water against and pursuing each other. We are told how a saint would, like any other person, fondle an infant or a friend, holding him with hands under the child's armpits and flinging him high in the air and then catching him; or how their children, the would-be heads of *khanqahs,* indulged in pigeon-play or kite-flying (early fifteenth century reference) in the saintly abode, grapple with

The *Miftahu'l Qulub* and the *Tuhfatu'l Qari,* contain a large number of *Jakari* songs of Qazi Mahmud in Gujari which are of a high poetic quality, combining simplicity of language with depth of feeling. They tell us for the first time—a fact not taken note of hitherto—that the saint's sons, brothers, grandsons and other men also composed Gujari verses. An outstanding feature of these poems is that they were composed on or for some occasion or the other, and furnish specimens of highly inspiring devotional poetry remarkable for sweetness and lucidity of diction on the one hand and great emotional strain on the other. Aaain, these works provide probably the earliest reference to the moustache which gave the sobriquet BegoS to the most powerful Sultan of Gujarat Mahmud Shah (1458-151 1), and about the exact connotation of which scholars differ. According to some, he was so called because he had conquered two impregnable forts of Gujarat- *Be-gadh* (two forts). Others contend that Begada is the arabicized form of the local word *vegada* which means a bull with upturned horns, and he was so named as his moustachios were like that. The works mentioned earlier call him Sultan Mahmud-i *Muchhala* or Sultan Mahmud-i Baruti, or Sultan Mahmud the moustachioed one, setting at rest once and for all the controversy about the exact meaning of the term.

AL-MAJALISU'L HASANIYA

A *malfuz* of Shaikh Hasan Mahmud Chishti (d.1574), entitled *Al-Majalisu'l Hasaniya,* was compiled in the second half of the sixteenth century by his son Shaikh Muhammad Chishti, author of a large number of Persion works on mysticism and Sufi knowledge. Shaikh Hasan Mahmud Chishti himself was an erudite scholar who authored a number of works, including a Persial commentary on the Qur'an. His *malfuz* contains interesting information about the saint and his kinsmen and contemporaries. It was, incidentally, on the basis of a reference in this work that the exact identity of Sidi Bashir—after whom the world-famous mosque with shaking minarets in Ahmedabad is known, and whose identity was a matter of conjecture among historians—could be finally established.

'Abdu'r Rahman Badh compiled, in the middle of the seventeenth century or a little later, the *Manaqib-i* Burhani extolling the virtues and spiritual powers of his ancestor. This work also records incidents and anecdotes related by disciples and adn-iirers. It is a mine of information on the life of the people, including the saintly family and their kinsmen.

BAHRU'IL HAQA'IQ

The sixteenth century hagiological literature also includes at least two *malfuz* or sayings of the celebrated saint, savant, teacher and author Shah Wajih ud-Din 'Alvi Gujarati (d. 1589). One of these is the *Bahru'l Haqa'iq,* noticed more than once, incorporating among other things a numberof the Shah's utterances, and other matters useful forreconstructing certain aspects of the society of the time.

MIFTAHU'L QULOB AND TUHFAT'UL QARI

Of the two other senior contemporaries of ShAh Wajih'ud-Din, one Shah Baha'ud-Din Bajan has already been mentioned. The other was Qazi Mahmud Darya'i Birpuri (d. 1534), a saint-poet whose *Jakar'i-* (more correctly perhaps *Chakari)* poems in Gujari were popular even in north India in the sixteenth-seventeenth centuries, according to Shaikh 'Abdu'l-Haq Muhaddis Dehlawi. Only two of at least four works glorifying him and his great super natural powers, have come down to us. One of these, *Miftahu'l Qulub wa Izalatu'l Kurub,* was compiled by the saint's *khalifa* and son-in-law, 'Abdu'r Razzaq Ja'fari, a man of erudition and a teacher by profession. He is also stated to have compiled the saint's *malfuz* under the title *Fawa'id-i Mahmudi,* about which no information is available. The third work is *Kanzu'l Karamat* compiled by another *khali-fa* of the saint, Qazi-'Umar Ladan or Laddan, which also is not available. The fourth is a later work entitled *Tuhfatu'l Qari* compiled in 1707 (about one and three quarters of a century after the death of the saint) by a descendant of his brother. The author of this work had before him, apart from the earlier mentioned three works, a fourth called *Mahmud Khani, a malfuz* of the saint's grandfather Shaikh Qutb Mahmud.

first quarter of the seventeenth century, a spiritual successor of the last-mentioned saint. Saiyid Muhammad Maqbul 'Alam (d. 1635), also an author and poet with the pen-name Jalali, extensively used the *Kunuz-i Muhammadi* in his *Jum'at-i Shahiya.* The latter was a compilation of the account of the Friday audiences of the saint, open to the public and attended by a large numberof his disciples, and also princes and noblemen, Muslim and non-Muslim. In these assemblies, thesainteenversed with them on varied reli-ious, sufistic and day-to-day topics.

Saiyid Muhammad Maqbu l Alam, whom the Mughal emperors Jahang-ir and Shah Jahan had met on a number of occasions and respected for his learning and sanctity, could complete only six part of the proposed work, each dealing with one year. The seventh part was completed by his arandson and successor, Saiyid Ja'far Badr 'Alam, an erudite scholar, traditionist, bibliophile and Persian poet. The work was most probably intended to becomplied in many parts; in anycase, only fourof these seven parts are accessible. The *Jum'ut-i Shahiya* also furnishes information on various subjects like the contribution of Gujarat to Arabic, Persian and Gujari literature and the life and condition of the people. It also throws light on not much known facets of the saint's personal life, his family and his teachings. To give only one example, it is related that the saint used to occasionally visit the site of the construction of the Mustafasar tank being carried out under his orders and would always instruct the man-in-charge of the work to be considerate to the labourers, pay their proper dues and keep them happy, and, thus *'imarat-i dil ra muqaddam darad bar'imarat-i gil, balke in-ra wasila-i an sazad* ('He should give preference to the building up of the heart over earthen construction, or rather should make the latter a means of the former').

Saiyid Muhammad Maqul 'Alam also compiled the *Chihl Hikayat, a* collection of forty anecdotes about the spiritual powers and other qualities of Shah 'Alam related by his disciples and admirers, which included highly placed noblemen and officials. A third such work is the *Sad Hikayat.* Another descendant of Qutb-i 'Alam, Shah

Amir. A detailed study of this *malfuz* was published, as will be mentioned later.

KHAZA'IN-I RAHMATU'LLAH

Another important work is the *Khaza'in-i Rahmatu'llah* written by the celebrated saint and Gujari poet ShAh Baha ud-Din Bajan Chishti (d. 1506). Often erroneously described as a *malfuz* of Shaikh Rahmatu'llah (d. 1463) his mentor, it deals with the latter's life and teachings. The importance of this work has not been realized until recently, though it was cited by one or the other scholar more than half a century ago in connection with the origin and history of Gujari language and literature. The work was intended to serve as a manual for the followers of the Chishti and other Sufi orders and contains, among other things, details on fundamentals of Sufism, explained through profusely quoted Persian and Gujari verses of the author and others. It also has useful material on religious practices, prayers, recitations, chants, formulae of amulets and charms for various purposes, as well as death anniversaries of prophets, saints and eminent persons. Further it furnishes much information for the material benefit of Sufis: prescriptions for different ailments and diseases, physical or mental, formulae and methods of preparation of drugs and medicines, and recipes for making soaps, ink, and other miscellaneous things useful in daily life. In this section of the work, the names of materials and ingredients are given in the local language. In the last section, Shah Bajan provides a collection of all his Gujari verses.

MALFUZ-I QUTBIYA, JUM'AT-I SHAHIYA CHIHL HIKAYAT

One may also mention accounts of the famous fifteenth-century Suhrawardi saints, Saiyid Burhan ud-Din 'Abdu'llah Qutbi-i 'Alam (d.1453) and his son Saiyid Siraj ud-Din Muhammad Shah 'Alam (d.1475). Of these, no contemporary work, *malfuz* or otherwise, compiled during their time, is available except perhaps the *Malfuz-i-Qutbiya*. Even their names have not survived (with the exception of *Kunuz-i-Muhammadi, a malfuz,* of Shah 'Alam, compiled by one of his disciples, Shaikh Farid bin Malik Daulatshah). Some time in the

Unfortunately, not all such matfuz-that is to say, faithful recording by a disciple, of his master's talk or conversation in his private or public audiences attended by men of all walks of life including princes and noblemen—or works dealing with the life and spiritual prowess of a Sufi saint, seem to have come to light. Some may be lost; the exact number in the possession of the present heads of the khanqahs is not known either. We know that a very important voluminous biographical dictionary of saints, including those of Ahmedabad, named *Mukhbiru'l Auliya'*, was compiled in the first quarter of the last century by Shaikh Rashid ud-Din Lala of the Chishti family of Ahmedabad. Apart from a lot of new material for the history of Persian and Gujari literature of Gujarat, it contains some important particulars about some of the saints. For example the extremely interesting meeting between the famous Shattari saint Shaikh Muhammad Ghaus Gwaliori and the celebrated Rif-a'i saint and Gujan poet ShRh cAI1jl'd CAmdhant- is not reported in any other available source. A perusal of the incomplete copy shows that members of only one farrffiy had compiled quite a few such works, the exact number and names of which can be known only through the perusal of an extant copy (not yet accessible), in the Khdnq@h-i Chishtiya in Ahmedabad.

TUHFATU'L MAJALIS AND MIRQATU'L WUSULL ILALLAH-I WAR-RASOL

The earliest known works of this nature from Gujarat are two *malfuz of* the famous saint of the Maghribi order Shaikh Ahmad Khattu (d.1445and buried at Sarkhej, near Ahmedabad) an erudite scholar who also occasionally composed Persian and Gujari verses. These are *Tuhfatu'l Majalis* by Shaikh Muhammad bin Sa'id Iraji and *Mirqatu'l Wasul ilallah-i wa'r-Rasul* by Maulana Muhammad bin Qasim. The latter is more detailed and contains a lot of information on the political, social and cultural history of Rajasthan and Gujarat. The saint was brought up in Rajasthan and had his early education under the paternal care of Baba Ishaq Maghribi. He later settled in Gujarat after his return from Samarqand where he had gone with Amir Timur to intercede on behalf of the Delhi prisoners taken captive by the

which are, as we all know, a chronicle of political events of a king or a dynasty. Even these, by and large, overlook the history of the outlying areas, leave alone towns and villages, which formed part of their vast kinadom.

Persian Hagiological Work of Gujarat as a Source for Various Aspects of its History

There is a category of literature that is in a way more important than chronicles. This is hagiological literature including *malfuz* works which can be rightly considered indispensable primary sources for medieval history. Yet it has remained rather unexplored and unutilized, except to a very limited extent by the late Professor Saiyid Hasan Askari of Patna and Professor Khaliq Ahmad Nizami of Aligarh, who have touched on a few well-known works dealing with the history of north India including Bihar. However, looking at the vast material available, their pioneering work cannot be said to have done full justice to this material. The need remains not only for utilizing all such known and available works, but also for unearthing new materials lying in private collections in homes and *khanqahs*.

While north India in general and Bihar in particular, thanks to the indefatigable efforts of Professor Askari, have received attention, no note has been taken, by any historian orscholarof Persian, of the hagiographical literatureof regions like Gujarat, except for three works, cursorily consulted for the limited purpose of tracing the origin and history of Urdu language and literature. It is not widely known that Chishti, Suhrawardi, Maghribi, Qadri and Shattari orders flourished side by side in Gujarat and played a great role in shaping its political, cultural, social and literary history. As a matter of fact, the Suhrawardi- and the Chishti families of Ahmedabad enjoy the unique distinction of having produced without break five six generations of savants, scholars and authors: exponents of the Qur'an, writers of works on Sufism, jurisprudence and biographies, authors of *D-iwans* of Persian poems, etc. These people also made a substantial contribution to Arabic, Persian and even to Gujari literature.

34

Persian Sources of the Social and Cultural History of Medieval Gujarat

ZIYAUDDIN A. DESAI

It is absolutely necessary that when, with changing concepts of history in the modem period, a reassessment and evaluation of the work of the past historians is being done, all efforts should be made to unearth and make an indepth study of available data that may present the country's past in its true perspective and furnish a comprehensive account of all aspects of society. Such sources as are necessary for understanding the social and cultural milieu of the age should be identified and brought to light. When material in different lancyuaoes and branches of literature that has the slightest bearing on any aspect of history in any period is available, we can have a comprehensive picture of a particular age, in perspective.

Persian which has the distinction of being, for about three quarters of a millennium, the official language of most parts of our vast subcontinent, played an importantrole in shapinc, educational and cultural life. Naturally, therefore, there should and does exist ample source-material in this language for reconstructing all aspects of the past: histories, travelogues, diaries, biographical works of saints, poets and eminent men, poetical works, epigraphs, official documents, coins, leoends and the like. Each of these constitutes a primary source, albeit in varying degree, for history. Unfibriunately, all this source-material, contemporary orotherwise, dealing with the central and provincial dynasties in the medieval period, has not been fully utilized. Even in the case of written sources, modern history- writing in the past century orso initially confined itself to the use of Persian historical works

I wish to assert that the Islamic Culture and Relations Organizations in Iran, and the Culture House of the Islamic Republic of Iran in Mumbai, are ready to offer every help and assestance, to the best of their ability, to your matchless Library.

On this occassion, I consider it my duty to pay homage to the memory of the eminent late professor, scholar, educationist, and historian Dr. Ziyauddin Desai, who was a winner of many prizes and awards, and whose services to Persian language and literature, as well as to Islamic Culture and Civilization, can never be forgotten by his students, colleagues and admirers.

I hope and pray that your Seminar will be highly successful.

Thank you

Dr. Ali Yousufi

25-1-2004

In the name of God, the Creator of life

Dr. Aqa-e-Ali Yousufi

(extract from his lecture)

Your Excellency, Mr. Jalal Tamle, Cultural counceller of Embassy of Islamic Republic of Iran in India,

Your Honour, Professor Bombaywalla, Director of Hazrat Pir Mohammad Shah Library and Research Centre,

Eminent dignitaries onthe dais,

Respected professors, ladies and gentlemen.

I am thankful to you for your kind invitation. I am greatly honoured to be here in this reputed Library, among so many eminent prefessors, scholars and personalities.

Permit me to say that it is a man's duty to have good and useful books. A library is not a luxury, but one of the necessities of life. Good and useful books are the legacies and gifts that wise and learned men leave to manking, to be handed down from generation to generation, as presents to those who are not yet born.

Your reputed Library is one of such institutions, and this is a matter of great pleasure and satisfaction to all of us.

No two civilizations have influenced each other as much as the Indian and Iranian civilizations. So rich and strong are these two ancient civilizations, that by the grace of God, they can never perish.

The great service that your reputed Library is rendering to students, scholars, professors, teachers and admirers of Persian language, literature and culture is well known in India and throughout the world in general, and Iran in particular.

Index

It boosted our morale since the general misconception is that Gujarat is bereft of such academic activities. "So the activities of the Dargah Sharif Trust in this respect are considered to be a ray of hope and enlightenment", those scholars had added.

When they summed up our tireless but noble activities as "an oasis in the desert of Gujarat", we indeed felt gratified and fulfilled.

Praise be to Him.

Dr. Mohammed Habib M. Kakiwala
M.S. (Surgeon)
President, Hazrat Pirmohammed Shah
Dargah Sharif Trust, Ahmedabad - 1.

Introduction

It is a matter of great pleasure and privilege for me to present this Journal-IV which contains the research papers, read and discussed, in the 4th National Seminar, held under the joint auspices of Hazrat Pir Mohammed Shah Dargah Sharif Trust, Ahmedabad and Iran Culture House, Islamic Republic of Iran (IRI), Delhi (25th to 27th Jan-2004).

I appreciate with all sincerity the immense cooperation and I express my gratitude for the sincere efforts and generosity to reconcile to encourage and strengthen the cultural and literary traditions of both the nations.

We enjoyed thoroughly hosting this seminar and providing hospitality to eminent scholars of Gujarat and India under the auspices of the Trust, other academic and literary talks by the respective scholars of the subjects were also arranged.

At this junction, I would like to especially mention the name of the great scholar of international repute -late Prof. Dr. Ziauddin A. Desai about whose life and works, there are six papers in this Journal.

I hope that the Journal-IV will be widely appreciated by the academic community which would sustain us in our efforts to continue to pursue this noble activity.

I indeed it gladdened our hearts to hear from some of the eminent scholars as participants, expressing their great satisfaction and pleasant surprize that the Dargah Sharif Trust held frequently national seminars on subjects about the life and works of the Sufis and Saints and religious Philosophers of Gujarat and India.

Dedicated to

The Eminent Scholar

of

Learning and Literature

(Late) **Dr. AHMEDHUSAIN N. QURESHI**

Hazrat PirMohammed Shah Library and Research Centre,

Ahmedabad

Hazrat PirMohammed Shah Library and Research Centre,
Ahmedabad

JOURNAL - IV

Book Name	:	**Gujarat's Heritage in Learning, Literature and Culture**
Editor	:	Prof. Mohiyuddin Bombaywala
No. of Pub.	:	34
Year of Pub.	:	2007
Quantity	:	500
Price	:	Rs. 200

Published by : **Secretary,** Hazrat Pirmohammed Shah Library & Research Centre, Ahmedabad - 1.
Phone 91-079-25351772

The book can be had from :

- Educational Publishing House, Lalkuan, Delhi - 110006.
- Modern Publishing House, 9, Gola Market, New Delhi-110002.
- Aamrin Book Agency, Jamalpur, Ahmedabad - 380001.
- Kalim Book Depot, Khaas bazar, Ahmedabad - 380001.

Printed by :

ISB Digital
2828, Beldarwad, Shahpur, Ahmedabad - 1

The **JOUNAL-IV** is edited, printed and published with the partial financial assistance of **Gujarat Sahitya Academy,** Gandhinagar.

Hazrat Pir Mohammed Shah Library and Research Centre
Hazrat Pir Mohammed Shah Road, Pankornaka, Ahmedabad-1
Gujarat - India. Ph.: 079-25351772, 25352838

Hazrat Pir Mohammed Shah Dargah Sharif Trust, Ahmedabad

and

Iran Culture House, Islamic Republic of Iran, Dehli

Three Days Seminar

(25 to 27 January, 2004)

Gujarat's Heritage in Learning Literature and Culture

(Articles)

Edited by : Prof. Mohiyuddin Bombaywala

Hazrat Pir Mohammed Shah Library and Research Centre

Hazrat Pir Mohammed Shah Road, Pankornaka, Ahmedabad-1

Gujarat - India. Ph : 079-25351772, 25352838

OJARAT'S HERITAGE IN LEARNING LITERATURE AND CULTURE

Journal-IV
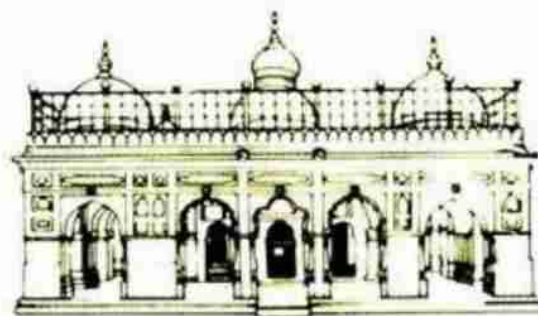
Hazrat Pir Mohammad Shah Library and Research Centre,
Pankornaka, Ahmedabad-1.